پیغمبرِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم

اور اُن کی تعلیمات



مؤلف

عطائے مفتیٔ اعظم ہند **مولانا محمد شاکر نوری** امیرِ سنی دعوتِ اسلامی

پیش کش

ادارہ معارفِ اسلامی ممبئی

ناشر

مکتبہ طیبہ ممبئی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؁

وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ○

(سورۂ انبیا، آیت: ۱۰۷)

پیغمبر رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اور ان کی تعلیمات

مصنف:

عطائے مفتی اعظمِ ہند حضرت حافظ وقاری

مولانا محمد شاکر نوری

(امیر سنّی دعوتِ اسلامی)

پیش کش:

ادارۂ معارف اسلامی

۱۳۲ / کامبیکر اسٹریٹ، ممبئی ۔ ۳

ناشر:

مکتبۂ طیبہ

۱۲۶ / کامبیکر اسٹریٹ، ممبئی ۔ ۳

نام کتاب : پیغمبرِ رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی تعلیمات

مصنف : حضرت حافظ وقاری مولانا محمد شاکر نوری (امیرِ سنّی دعوتِ اسلامی)

صفحات : ۵۲۰

نظر ثانی : مولانا مظہر حسین علیمی ،مولانا عبداللہ اعظمی نجمی،
مولانا جاوید رضا نجمی ،مولانا عبدالکریم رضوی نجمی

کمپوزنگ : مولانا سید سفیان نجمی ،مولانا سید حامد نجمی ،مولانا عبدالجواد نجمی

اشاعت اول : بموقع عالمی سالانہ سنّی اجتماع ۲۰۱۶ء

تعداد : گیارہ سو

ناشر : مکتبۂ طیبہ، ۱۲۶/ کامبیکر اسٹریٹ، ممبئی۔ (فون:23451292)

قیمت :

ملنے کے پتے:

مکتبۂ طیبہ: دارالعلوم برکاتِ خواجہ، آمود، ضلع بھروچ، گجرات۔ فون: 9427464411

مکتبۂ طیبہ: ہاشمی مسجد، نزد کولپیٹھ، ہبلی، ضلع دھارواڑ، کرناٹک۔ فون:8904008082

مکتبۂ طیبہ: مسجد یارسول اللہ، ایم ایس نوری چوک، مالیگاؤں۔فون:9145545480

مکتبۂ طیبہ: شاخ سنّی دعوتِ اسلامی، مڈگاوں، گوا۔ فون:9422446746

نیو سلور بُک ایجنسی: فینسی محل، محمد علی روڈ، ممبئی۔ ۳۔ فون:9323406784

ناز بُک ڈپو: فینسی محل، محمد علی روڈ، ممبئی۔ ۳۔ فون:9322255763

اقرا بُک ڈپو: ۳۰/ بی، نور منزل، محمد علی روڈ، ممبئی۔فون:8080270400/23410140

فہرست مضامین

تیسرا باب

چوتھا باب

پانچواں باب

چھٹا باب

ساتواں باب

آٹھواں باب

نواں باب

دسواں باب

گیارھواں باب

تیرھواں باب

شرفِ انتساب

اہلِ سنت و جماعت کے تمام

سیرت نگاروں کے نام

؎ گر قبول افتد زہے عز و شرف

تقریظ جلیل

از: مفکر اسلام حضرت علامہ قمر الزماں خاں اعظمی
(سکریٹری جنرل ورلڈ اسلامک مشن، لندن)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اِس وقت میرے زیر مطالعہ کتاب **''پیغمبر رحمت اور ان کی تعلیمات''** کا مسودہ ہے۔ یہ کتاب امیر سنی دعوتِ اسلامی حضرت مولانا شاکر نوری کی تازہ ترین تالیف ہے۔ اس کتاب میں موصوف نے پیغمبر امن سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کو عہد حاضر کے تناظر میں انتہائی خوب صورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مغربی دنیا خاص طور پر مستشرقینِ یورپ تو صدیوں سے اسلام اور پیغمبر اسلام پر تشدد، دہشت گردی اور جدال وقتال کے بے جا الزامات عائد کرتے رہے ہیں مگر اب پوری دنیا ان کے بے بنیاد الزامات کو میڈیا کے ذریعے پھیلانے کی کوشش کر رہی ہے۔ ہمارا ملک ہندوستان جہاں مسلم اور غیر مسلم صدیوں سے امن وشانتی کے ماحول میں زندگی گزار رہے تھے، میڈیا کی اسلام دشمنی کی بنا پر فاصلے بڑھ رہے ہیں اور نفرتوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ خدشہ ہے کہ دونوں قوموں کے درمیان بڑھتے ہوئے فاصلے کسی بڑے المیے کو نہ جنم دیں، اس لیے عہد حاضر کی یہ اہم ضرورت ہے کہ دنیا کے سامنے اسلام اور پیغمبر اسلام علیہ السلام کی پاکیزہ تعلیمات اور ان کے نظام امن کو عام کیا جائے اور مختلف زبانوں میں ان کی سیرت طیبہ پر کتابیں تحریر کی جائیں۔ علامہ شاکر نوری کی یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔

اسلاموفوبیا کی جو لہر یورپ سے اٹھی ہے وہ اب ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے چکی ہے۔ افسوس ہے کہ پیغمبر امن علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیمات سے ناواقفیت کی بنا پر اعدائے اسلام کے غلط پروپیگنڈوں سے وہ سادہ ذہن لوگ بھی متاثر ہو رہے ہیں جو حقیقتاً متعصب نہیں تھے۔ نفرتوں کی بنا پر پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم میں کئی کروڑ انسانوں کی جانوں کا ضیاع ایک تاریخی حقیقت ہے اور اب پوری دنیا اس طرح کے کسی المیے کی متحمل نہیں ہو سکتی، اس لیے ضرورت ہے کہ دنیا کے تمام امن پسند لوگ اسلام اور پیغمبر اسلام کی حقیقی تعلیمات سے آشنا ہو کر نفرتوں کی خلیج کو پاٹ دیں۔

اسلام امن و سلامتی کا مذہب ہے، پیغمبر اسلام علیہ السلام ایک ایسے دور میں جلوہ گر ہوئے جب پوری دنیا بدامنی کا شکار تھی۔ تاریخ کے اوراق میں جن ملکوں اور قوموں کا ذکر ملتا ہے اُن میں ایک قوم یا ملک بھی ایسا نہیں تھا جہاں پر امن معاشرہ قائم ہو اور انسانی اقدار کا احترام کیا جاتا ہو۔ اُس دور کی دو عظیم طاقتیں جنھیں آپ سپر پاور کا نام دے سکتے ہیں وہ صدیوں سے حالتِ جنگ میں تھیں اور لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار چکی تھیں۔ سرزمین عرب ان کے طالع آزمائیوں کا مرکز تھی۔ آقائے دو جہاں علیہ السلام نے نہ صرف یہ کہ اس سرزمین پر امن قائم فرمایا بلکہ ایک ایسا نظام امن عطا فرمایا جس کے نتیجے میں خلیفۂ ثانی سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پچیس لاکھ مربع میل کے علاقے پر عدل وانصاف اور امن سے بھرپور ایک معاشرہ قائم فرمایا جس کی مثال اقوام عالم کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ اسلام کے نظام امن کی برکتوں سے اُس دور کے تین براعظم ایشیا، یورپ اور افریقہ صدیوں تک فیضیاب ہوتے رہے۔ مولانا شاکر نوری نے پیغمبر رحمت سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے ان تمام گوشوں پر روشنی ڈالی ہے جس کا تعلق معاشرتی انصاف سے ہے۔

اگر کسی قوم پر جنگ مسلط کردی جائے تو ایسی قوم اپنے دفاع کے لیے وہ تمام حربے استعمال کرتی ہے جن کا تعلق غیر انسانی طریقۂ جنگ سے ہوتا ہے اور غالب آنے کے بعد مفتوح قوم کو فنا کر دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتی۔ پیغمبر اسلام علیہ السلام کی حیات طیبہ میں کم وبیش ۳۰ جنگیں مسلط کی گئیں جن میں حملہ آور قوتیں عرب کے قبائل اور یہود کے علاوہ روم کی بادشاہتیں بھی تھیں مگر پیغمبر اسلام علیہ السلام نے کامیاب ہونے کے بعد ان سے انتقام لینے کے بجائے انھیں معاشرتی انصاف اور امن سے نوازا اور اس روایت کو خلفاے راشدین اور ان کے بعد کے حکمرانوں نے بھی باقی رکھا۔ روم وایران پر حکمراں ہونے کے بعد ان متحارب قوتوں کو اسلامی اخلاق کی برکتوں سے نوازا اور ان کے درمیان صدیوں جاری جنگ کو امن میں تبدیل فرمادیا۔

حقیقت یہ ہے کہ آج بھی اگر دنیا میں امن قائم ہوسکتا ہے تو پیغمبر رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعلیمات ہی کے ذریعے۔

جنھیں حقیر سمجھ کر بجھا دیا تم نے
وہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہوگی

مجھے یقین ہے کہ امیر سنی دعوتِ اسلامی کی یہ کتاب اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے نظام امن وسلامتی کو سمجھنے میں بہت مدد ومعاون ثابت ہوگی اور یقیناً یہ کتاب سیرت پاک کی لائبریریوں میں ایک خوبصورت اور واقعی اضافہ ہوگی۔

محمد قمر الزماں اعظمی
سکریٹری جنرل ورلڈ اسلامک مشن
۷/نومبر ۲۰۱۶ء

تقریظ جلیل

از: محقق مسائل جدیدہ حضرت علامہ مفتی محمد نظام الدین رضوی

(صدر مفتی جامعہ اشرفیہ، مبارک پور، یوپی)

اسلام دینِ رحمت ہے اور ہادیِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پیغمبرِ رحمت اور آپ کی تعلیمات امن عالم کا سرچشمہ۔ دین، جان، مال اور عقل ونسب کا تحفظ آپ کی ہی تعلیمات کا اہم حصہ ہے جو قانون امن ورحمت کی ایک دفعہ ہے۔

اس موضوع پر پہلے بھی کام ہوا ہے اور آج بھی جدید اسلوب میں ''پیغمبر رحمت اور آپ کی تعلیمات'' کو ہر معاشرے اور ہر کیمپ میں پہنچانے کی ضرورت ہے تاکہ کائنات انسانی حضور سید المرسلین رحمۃٌ للعالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اخلاق وتعلیمات حسنہ سے آگاہ ہوکر اسلام کا صحیح عرفان حاصل کر سکے اور اس سے قریب ہو، یا اللہ توفیق دے تو اس کے دامنِ رحمت میں آجائے۔

یہ کام بہتر طور پر کوئی داعیِ کبیر ہی کر سکتا ہے۔ اس حیثیت سے اس کام کی ذمے داری بجا طور پر حضرت مولانا الحاج شاکر نوری دام ظلہ کی بھی ہوتی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ انھوں نے اپنی یہ ذمے داری محسوس کی اور یہ کام پوری عرق ریزی اور اخلاص قلب کے ساتھ انجام دیا۔ تادم تحریر اس کتاب کی زیارت نہ کر سکے مگر اس کے کچھ مشمولات کا علم ہوا جس سے اندازہ ہے کہ کتاب اپنے موضوع پر ایک شاندار اور وقیع کتاب ہے۔ خدائے پاک مولانا موصوف کی یہ کاوش قبول فرمائے اور انھیں مزید اس سلسلے کے دوسرے موضوعات پر کام کرنے کی توفیق خیر دے اور دارین میں بہتر جزا سے نوازے۔ آمین بجاہ حبیبہٖ سید المرسلین علیہ وعلیٰ آلہ وازواجہ الصلوٰۃ والتسلیم۔

محمد نظام الدین الرضوی

۸ر صفر المظفر ۱۴۳۸ھ/ ۹ر نومبر ۲۰۱۶ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ وَ کَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عَبۡدِہِ الَّذِی اصۡطَفٰی
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ اَھۡلِ التُّقٰی وَالنُّقٰی۔

عرضِ مصنف

آج دنیا بھر میں اسلام اور رحمتِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مخالفت میں جو کچھ ماحول تیار کیا جا رہا ہے، اس کا سبب جہاں اسلام دشمنی ہے وہیں پیغمبرِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذات اور آپ کے نظامِ رحمت سے عدمِ واقفیت بھی ایک اہم سبب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضور رحمتِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ذاتی عداوت رکھنے والوں اور آپ کے نظامِ رحمت کے خلاف پروپیگنڈا کرنے والوں میں سے بہت سے لوگ آپ کی پر امن زندگی اور رحمت نشاں ارشادات واقوال سے ناواقف ہوتے ہیں۔ اس ناواقفیت کو دور کرنے کے لیے علماے اسلام خصوصاً علماے اہلِ سنت نے ہر دور میں حتی المقدور کاوشیں کی ہیں اور اپنی زبان وقلم سے اس جہالت کے خاتمے کے طریقوں پر عمل درآمد فرمایا ہے۔ علماے اہلِ سنت کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے انھی کی سرپرستی میں تحریکِ سنی دعوتِ اسلامی اپنے آغاز سے اپنی بساط بھر اقدامات اس سلسلے میں بھی کر رہی ہے۔

حالاتِ حاضرہ میں خصوصاً ''امن وسلامتی'' کی ضرورت کا احساس پوری دنیا کو ہے اور یہ احساس روز بروز بڑھتا جا رہا ہے لیکن افسوس اس بات پر ہے کہ اس عنوان پر پورے عالم میں جس قدر زیادہ سے زیادہ گفتگو ہو رہی ہے، اسی قدر ''بدامنی اور بے سکونی'' کا اضافہ بھی ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ امن کو یقینی بنانے کے لیے جن خطوط کے تعین کی ضرورت تھی، نہ دنیا ان کا تعین کر پا رہی ہے اور نہ ہی اس سے تعین ہو پائے گا، کیوں کہ

پوری دنیا کے انسانوں کے امن وسکون کو یقینی بنانے کے لیے اولاً سارے انسانوں کی ضرورتوں اور دینی ودنیوی، فطری وغیر فطری تقاضوں کو سمجھنا ہوگا جو کہ دنیا والوں کے بس سے باہر ہے۔اہلِ دنیا کی اسی عاجزی کے سبب اللہ تعالیٰ دنیا میں انبیا ورسل کو مبعوث فرماتا رہا۔

خالقِ فطرت اللہ عزوجل کے محبوب حضور رحمتِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنے رب عزوجل کے فضل وکرم سے سارے انسانوں کی تمام فطری وغیر فطری ضرورتوں سے واقف بھی ہیں اور آپ نے سارے انسانوں بلکہ دیگر مخلوقات کے لیے بھی حقوق متعین فرما کر ہر ایک کے امن وسکون کے یقینی بنانے کے لیے ایسے خطوط کا تعین فرما دیا ہے کہ آج بھی دنیا ان خطوط پر عمل پیرا ہو جائے تو پوری دنیا میں امن وامان قائم ہو سکتا ہے۔

حضور رحمتِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اسی نظامِ رحمت سے اغیار کو واقف کرانے اور اپنوں کو اس کی طرف متوجہ کرنے کی غرض سے دل میں یہ خیال آیا کہ اس حوالے سے کوئی قلمی کاوش آسان پیرائے میں منظر عام پر آ جائے اور مختلف زبانوں میں اس کی اشاعت بھی ہو۔مصروفیات کی کثرت اور کاموں کی بہتات پر نظر کرتا تو یہ کام ممکن نظر نہ آتا تھا لیکن عزم وہمت کا دامن نہ چھوٹا، فقیر نے اللہ عزوجل کی ذات پر بھروسہ کرتے ہوئے، حضور رحمتِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ سے کرم کی اُمید لیے ہوئے ادارۂ معارفِ اسلامی کے بعض اہم اراکین کے ساتھ مشورت کی اور کام کا جائزہ لیا اور توفیقِ الٰہی نے امداد فرمائی اور آج کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اللہ عزوجل کی توفیق اور آقاے دو جہاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی کرم فرمائی نیز ادارۂ معارفِ اسلامی کے بعض اہم ارکان کی بھرپور امداد وتعاون ہی سے یہ کام اپنی تکمیل کو پہنچا۔ **مَنْ لَّمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَمْ یَشْکُرِ اللّٰہَ** کے تحت یہ مناسب اور ضروری ہوگا کہ میں ادارۂ معارفِ اسلامی کے ارکان مولانا مظہر حسین علیمی، مولانا سید عمران نجمی، مولانا عبداللہ اعظمی

نجمی، مولانا جاوید رضا نجمی اور مولانا عبد الکریم نجمی صاحبان کا شکریہ ادا کروں، ان حضرات نے خاکے کے مطابق مواد کی تلاش و جستجو میں بھرپور تعاون فرمایا، پروف ریڈنگ کا کام بھی انھی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ ساتھ ہی ساتھ مولانا سید سفیان نجمی، مولانا سید حامد نجمی، مولانا عبد الجواد نجمی نے کمپوزنگ کے بوجھ کو ہلکا کیا اور بھرپور چستی کا مظاہرہ کیا۔ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صدقے فقیر کی اس کاوش کو قبول فرمائے اور اس کتاب کی ترتیب میں مدد کرنے والے مذکورہ سارے حضرات کو بہترین جزا عطا فرمائے۔

ہم نے اپنے طور پر کتاب کو غلطیوں اور خامیوں سے محفوظ رکھنے کی مقدور بھر کوشش کی ہے، پھر بھی اگر کہیں کسی صاحب علم کو کوئی خامی نظر آجائے تو "اَلْمُؤْمِنُ مِرْاٰۃُ الْمُؤْمِنِ" کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمیں مطلع فرمادیں، ان شاء اللہ اگلی اشاعت میں ضروری اصلاحات کرلی جائیں گی۔

کچھ کتاب کے بارے میں

☆ کتاب میں خصوصًا سیرتِ رسولِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ان پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے جن میں امن وسکون سے متعلق ہدایات، ارشادات اور پیغامات ہیں۔

☆ ساری باتیں مستند کتابوں سے لی گئی ہیں اور ان کے حوالے بھی درج کیے گئے ہیں۔

☆ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سیرت سے متعلق عام معلومات سیرت مصطفیٰ جانِ رحمت (افادات اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ)، سیرت ضیاء النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (علامہ پیر کرم شاہ ازہری) اور سیرۃ المصطفیٰ (علامہ عبد المصطفیٰ اعظمی) سے اخذ کی گئی ہیں۔

☆ حتی الامکان معلومات کو آیاتِ قرآنیہ اور احادیث نبویہ سے آراستہ کیا گیا ہے۔

☆ حسبِ ضرورت عربی عبارتیں بھی پیش کی گئی ہیں۔

☆ عربی عبارتوں کو اعراب سے مزین کیا گیا ہے۔
☆ عربی اقتباسات کے بامحاورہ تراجم درج کیے گئے ہیں۔
☆ قرآنی آیات صحیح رسم الخط اور رموزِ اوقاف کے ساتھ ہوں، اس کا خیال کیا گیا ہے۔
☆ ساری آیتوں کے تراجم کنزالایمان سے اخذ کیے گئے ہیں۔
☆ اختصار اور جامعیت کا خیال رکھا گیا ہے۔
☆ ابواب کی مناسبت، جامعیت کے تقاضوں اور کثرت افادہ کی خاطر بعض معلومات مکرر ہوئی ہیں۔

ہم نے اپنے طور پر کتاب کو غلطیوں اور خامیوں سے پاک صاف رکھنے کی مقدور بھر کوشش کی ہے، پھر بھی اگر کہیں کسی صاحب کو کوئی خامی نظر آجائے تو "اَلْمُؤْمِنُ مِرْاٰةُ الْمُؤْمِنِ" کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمیں مطلع فرمادیں، ان شاء اللہ اگلی اشاعت میں ضروری اصلاحات کرلی جائیں گی۔

اخیر میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعاگو ہوں کہ اس کتاب کو مختلف زبانوں میں پوری دنیا میں نشر کرنے اور ساری دنیا کو پیغمبرِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی پرامن ذات اور امن دہندہ نظام و تعلیمات سے واقف کرانے کی جو غرض فقیر کے پیشِ نظر ہے، اسے اپنے کرم سے پوری فرمائے۔ اٰمین بجاہ النبی الکریم علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ
اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیۡكَ یَارَسُوۡلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیۡكَ وَسَلَّمَ

مقدمہ

حالاتِ حاضرہ کے تناظر میں اگر یہ کہا جائے کہ دورِ حاضر کی سب سے بڑی ضرورت امن وامان کی بحالی ہے اور سب سے بڑا مسئلہ دہشت اور خوف ہے تو بلاشبہہ یہ ملکی اور بین الاقوامی حالات کی صحیح ترجمانی ہوگی اور ایسی حقیقت بیانی ہوگی جس کے انکار کی مجال کم از کم حالاتِ زمانہ سے تھوڑی سی بھی واقفیت رکھنے والے انسان کو ہرگز نہیں ہوگی۔

جب یہ طے ہے کہ پوری دنیا کے لیے سب سے بڑا مسئلہ خوف ودہشت ہے اور سب سے بڑی ضرورت امن وامان کی بحالی ہے، تو جس کسی شخصیت میں اس بین الاقوامی مسئلۂ خوف و دہشت کے حل کی صلاحیت ہوگی اور عالمی ضرورتِ امن وامان کو یقینی بنانے کی استعداد ہوگی وہ شخصیت پوری دنیا کے لیے بلاشبہہ سب سے بڑی امن دہندہ شخصیت اور اس کی ہدایات سب سے زیادہ قابلِ قدر اور اس کے ارشادات سب سے زیادہ واجب العمل ہوں گے۔

تعصب کی عینک اتار کر اگر پوری دیانت داری کے ساتھ پورے عالم میں ایسی شخصیت کو تلاش کیا جائے تو ہر متلاشی کی نگاہ جس پر مرکوز ہوگی، وہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذات ہوگی۔ خوف اور دہشت کو دور کرنے اور امن وامان کو پورے عالم میں قائم کرنے کی صلاحیت رکھنے والے ارشادات واقوال جس ذات کے ہو سکتے ہیں وہ صرف اور صرف سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں۔

جو لوگ تاریخ عالم خصوصاً تاریخِ اسلام سے ناواقف ہوں یا اسلام کی تاریخ اور رحمتِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سیرت کو تعصُّب کا چشمہ پہن کر ہی پڑھے ہوں تو ہوسکتا ہے کہ انھیں

یہ حقیقت قبول نہ ہو لیکن جو عادلانہ مزاج رکھتے ہیں اور منصفانہ سوچ کے حامل ہیں، خصوصاً اسلام کی تاریخ اور رحمتِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سیرتِ پاک کا صحیح سے مطالعہ کیے ہوں گے وہ ضرور یہ اعتراف کریں گے کہ رحمتِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نہ صرف امن وامان کی راہیں ہموار فرمائی ہیں اور دہشت وخوف کے خاتمے کے لیے خطوط متعین فرمائے ہیں بلکہ آپ نے عملاً اس کا ثبوت بھی پیش فرمایا ہے۔

آپ کے بعد آپ کے تربیت یافتہ خلفا نے امن وامان کو یقینی بنا کر اور خوف ودہشت کو عملاً دور فرما کر یہ ثابت کر دیا کہ اگر امن کو یقینی بنانا ہے اور دہشت کا خاتمہ کرنا ہے تو لازمی طور پر سیدِ عالم سیدنا محمد صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عطا فرمودہ اصول وقوانین کو اپنانا ہوگا، نظامِ مصطفیٰ صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کو گلے سے لگانا ہوگا اور پیغمبرِ رحمت صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے اپنے آفاقی ارشادات میں خالقِ عالم کی ساری مخلوقات کے لیے جو حقوق متعین فرمائے ہیں ان کی ادائیگی کو یقینی بنانا ہوگا، تبھی عالمی سطح پر امن وامان یقینی بن سکے گا اور عالمی دہشت کا خاتمہ ہو پائے گا۔

کتاب کے مختلف ابواب میں پیغمبرِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی پر امن زندگی کو آپ کی حیات کے مختلف گوشوں کی روشنی میں پیش کیا جائے گا نیز ان شاء اللہ ان اصول وقوانین اور حقوق کا باقاعدہ تذکرہ ہوگا جنھیں دنیا آج بھی اپنا کر اپنی سب سے بڑی اور اہم ترین عالمی ضرورت کے حصول اور اپنے سب سے خطرناک عالمی مسئلے کے خاتمے کو یقینی بنا سکتی ہے۔

سرِ دست امن کی تعریف، اقسام اور قرآن وسنت میں امن کے تذکروں پر روشنی ڈالی جا رہی ہے تا کہ امن کی صحیح تصویر سامنے آجائے اور یہ سمجھنے میں آسانی ہو کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہی وہ واحد شخصیت ہیں جنھیں امن دہندہ اور مطلق سفیرِ امن کہا اور مانا جا سکتا ہے، تنہا آپ ہی کے ارشادات واقوال میں وہ قوت ہے جو پوری دنیا کے لیے امن وسکون کے وہ وسیع

وعریض خطوط کھینچ سکتے ہیں جن پر چل کر اہلِ دنیا امن کو یقینی بنا سکتے ہیں اور تنہا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہی کی وہ ذات ہے کہ جن کے دامنِ رحمت کو تھام کر پوری دنیا سے خوف و دہشت کا ماحول دور کیا جا سکتا ہے۔

امن کی تعریف

امن کی تعریف ائمۂ لغت نے ان الفاظ میں کی ہے:

اَلْاَمْنُ: عَدَمُ تَوَقُّعِ مَکْرُوْہٍ فِی الزَّمَنِ الْاٰتِیْ، وَاَصْلُہٗ طُمَأْنِیْنَۃُ النَّفْسِ وَزَوَالُ الْخَوْفِ۔ (التوقیف علیٰ مہمات التعاریف للمناوی، ص: ۶۳)

ترجمہ: زمانۂ آئندہ کسی ناپسندیدہ واقعے کا اندیشہ نہ ہونا امن کہلاتا ہے۔

اس کی اصل یہ ہے کہ دل و جان مطمئن ہو جائے اور خوف و اندیشے چھٹ جائیں۔ اگر ملکی امن کی بات کی جائے تو پورے ملک کے حالات عدل و انصاف پر اس طرح مبنی ہوں کہ کسی ناخوش گوار حادثے کا اندیشہ نہ ہو، سارے لوگ اطمینان بخش زندگی گزاریں اور کسی بھی انسان کو اپنی جان یا مال کا کوئی خوف نہ ہو۔ اگر عالمی امن کی بات کی جائے تو پوری دنیا کے حالات ایسے عادلانہ اور منصفانہ ہونے چاہئیں کہ دنیا کا ہر انسان مطمئن اور بے خوف رہ کر زندگی بسر کرے۔

قرآنِ مقدس میں بھی اسی معنی میں امن کے تذکرے ملتے ہیں:

(۱) وَمَنْ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا۔ (سورۂ آل عمران، آیت: ۹۷)

ترجمہ: اور جو اس میں آئے امان میں ہو۔

(۲) وَاِذْ قَالَ اِبْرٰھِیْمُ رَبِّ اجْعَلْ ھٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا۔ (سورۂ ابراہیم، آیت: ۳۵)

ترجمہ: اور یاد کرو جب ابراہیم (علیہ السلام) نے عرض کی: اے میرے رب! اِس شہر کو امان والا کر دے۔

(۳) وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا ۔ (سورۂ بقرہ، آیت:۱۲۵)

ترجمہ: اور یاد کرو جب ہم نے اس گھر کو لوگوں کے لیے مرجع اور امان بنایا۔

امن کی قسمیں

جن حالات واوقات میں کسی کو امن کی ضرورت ہوتی ہے ان پر غور کریں تو ہمیں پتہ چلے گا کہ امن کی تین قسمیں ہیں۔ (۱) امنِ کامل، جس کا تعلق آخرت سے ہے۔ (۲) امنِ انفرادی، جس کا تعلق کسی ذات یا شخص سے ہے۔ (۳) امنِ اجتماعی، جس کا تعلق کسی معاشرے سے ہوتا ہے۔ تینوں طرح کے امن کے تعلق سے قرآن مقدس میں آیات موجود ہیں۔

(۱) امنِ کامل:

پورے طور پر امن وامان حاصل ہو کہ کسی قسم کا کوئی خوف نہ ہو اور یہ یقین ہو کہ خواہش کے خلاف کچھ نہ ہوگا۔ یہ امن آخرت کے ساتھ خاص ہے اور جنت ہی میں نصیب ہوسکتا ہے۔ قرآنِ مقدس میں فرمایا گیا:

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنّٰتٍ وَّعُيُونٍ ○ (سورۂ حجر، آیت:۴۵)

ترجمہ: بے شک ڈر والے باغوں اور چشموں میں ہیں۔

ایک مقام پر ارشاد ہوا:

اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ ○ (سورۂ حجر، آیت:۴۶)

ترجمہ: ان میں داخل ہو سلامتی کے ساتھ امان میں۔

ایک جگہ ارشاد ہوا:

لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ ○ (سورۂ حجر، آیت:۴۸)

ترجمہ: نہ انھیں اس میں کچھ تکلیف پہنچے، نہ وہ اس میں سے نکالے جائیں۔

دنیا میں ایسا امن ہرگز میسر نہیں آ سکتا کیوں کہ دنیا میں امن کا متأثر ہونا، زندگی کا ختم ہونا، بیماریوں کا آنا لگا ہوتا ہے۔ خاص کر اللہ تعالیٰ کے خوف سے بے نیازی کسی کو نہیں۔

چنانچہ فرمایا جاتا ہے:

اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ ۚ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝

(سورۂ اعراف، آیت:۹۹)

ترجمہ: کیا اللہ کی خُفی تدبیر سے بے خبر ہیں، تو اللہ کی خُفی تدبیر سے نڈر نہیں ہوتے مگر تباہی والے۔

ان ساری آیات میں امنِ کامل کا ذکر ہے جو قیامت کے دن ہر مومن کو حاصل ہوگا کہ اسے اللہ کے فضل اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شفاعت سے قیامت کے دن جہنم میں جانے اور عذاب میں مبتلا ہونے سے امن وامان حاصل ہوگا۔ اگر گنہگار بھی ہے تو خلود فی النار سے امن وامان کا یقین ہوگا۔

(۲) امنِ انفرادی:

اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک فرد اس سکون کے ساتھ ہو کہ اس کی جان، مال اور آبرو محفوظ ہو، اس کو حفاظتِ مال وجان کے حوالے سے کوئی خوف اور اندیشہ نہ ہو۔

قرآنِ مقدس میں امنِ انفرادی کی دعوت یوں دی گئی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ۭ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ۝

(سورۂ حجرات، آیت:۱۲)

ترجمہ: اے ایمان والو! بہت گمانوں سے بچو، بے شک کوئی گمان گناہ ہو جاتا ہے اور

عیب نہ ڈھونڈ و اور ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو، کیا تم میں کوئی پسند رکھے گا کہ اپنے مرے بھائی کا گوشت کھائے؟ تو یہ تمھیں گوارا نہ ہوگا اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

پیغمبرِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مندرجہ ذیل ارشادات میں اسی امنِ انفرادی کے تذکرے یوں فرمائے گئے ہیں:

مَنْ اَصْبَحَ مِنْكُمْ اٰمِنًا فِي سِرْبِهٖ مُعَافًى فِي جَسَدِهٖ عِنْدَهٗ قُوْتُ يَوْمِهٖ فَكَاَنَّمَا حِيْزَتْ لَهُ الدُّنْيَا بِحَذَافِيْرِهَا۔ (سنن الترمذی، حصہ چہارم، ص: ۵۷۴)

ترجمہ: تم میں سے جو کوئی اپنے گھر میں امن وسکون سے ہو، اس کا جسم صحیح اور سالم ہو، اس کے پاس ایک دن کی قدرِ کفایت روزی ہو تو بلاشبہہ وہ یہ سمجھے کہ اس کے لیے پوری دنیا جمع کردی گئی ہے۔

ایک روایت میں اس طرح ہے:

لَا يُشِيْرُ اَحَدُكُمْ اِلٰى اَخِيْهِ بِالسِّلَاحِ، فَاِنَّهٗ لَا يَدْرِيْ اَحَدُكُمْ لَعَلَّ الشَّيْطَانَ يَنْزِعُ فِيْ يَدِهٖ فَيَقَعُ فِيْ حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ۔ (صحیح مسلم، حصہ چہارم، ص: ۲۰۲۰)

ترجمہ: تم میں سے کوئی اپنے بھائی کی طرف ہتھیار سے اشارہ نہ کرے کیوں کہ ممکن ہے کہ شیطان اس کے ہاتھ سے ہتھیار چلا دے اور وہ جہنم کے گڑھے میں جا گرے۔

ایک روایت میں یہ الفاظ مروی ہیں:

لَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ اَنْ يُّرَوِّعَ مُسْلِمًا۔ (سنن ابی داؤد، حصہ چہارم، ص: ۳۰۱)

ترجمہ: کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ دوسرے مسلمان کو ڈرائے۔

ایک روایت میں اس طرح حکم فرمایا گیا:

لَا يَأْخُذَنَّ اَحَدُكُمْ مَتَاعَ اَخِيْهِ لَاعِبًا وَلَا جَادًّا ۔ (ایضًا)

ترجمہ: کوئی بھی انسان اپنے بھائی کا مال ومتاع نہ ہنسی کے طور پر لے اور نہ (بلا اذن) جان بوجھ کر۔

ان احادیث مبارکہ میں جان، مال، روزی وغیرہ سے متعلق امن وامان کا ذکر ہے جو انفرادی امن پر دلالت کر رہا ہے۔ کسی بھی انسان کو معاشرتی زندگی پُرامن گزارنے کے لیے اس معاشرے میں اس کی جان، مال، عزت وآبرو، معاش وغیرہ کا مامون ہونا ضروری ہے ورنہ اس کے لیے مشکلات درپیش ہوجاتی ہیں۔

(۳) امنِ اجتماعی:

اس کا مطلب یہ ہے کہ پورا معاشرہ اور سارے لوگ امن وسکون کے ساتھ ہوں، ہر ایک کی جان، مال اور آبرو محفوظ ہو اور سارے لوگ جانی، مالی خطرات اور اندیشوں سے مطمئن ہوں۔ امنِ اجتماعی کی دعوتیں بھی قرآنِ مقدس میں جگہ جگہ دی گئی ہیں۔ فرمان ہے:

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۟ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ○

(سورۂ بقرہ، آیت: ۸۳)

ترجمہ: اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ اللہ کے سوا کسی کو نہ پوجو اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو اور رشتے داروں اور یتیموں اور مسکینوں سے اور لوگوں سے اچھی بات کہو اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دو۔ پھر تم پھر گئے مگر تم میں کے تھوڑے اور تم روگرداں ہو۔

ایک مقام پر فرمایا:

كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي

الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِى الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ○ (سورۂ مائدہ، آیت: ۳۲)

ترجمہ: اس سبب سے ہم نے بنی اسرائیل پر لکھ دیا کہ جس نے کوئی جان قتل کی بغیر جان کے بدلے یا زمین میں فساد کیے تو گویا اس نے سب لوگوں کو قتل کیا اور جس نے ایک جان کو جلا لیا اس نے گویا سب لوگوں کو جلا لیا اور بے شک ان کے پاس ہمارے رسول روشن دلیلوں کے ساتھ آئے۔ پھر بے شک اُن میں بہت اس کے بعد زمین میں زیادتی کرنے والے ہیں۔

اسی طرح پیغمبرِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بے شمار ارشادات میں اسی امنِ اجتماعی کے مفاہیم بھی تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ چند ارشادات ملاحظہ ہوں:

☆ اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ۔ (صحیح البخاری، ص:۱۱)

ترجمہ: مسلمان وہ ہوتا ہے جس کی زبان اور ہاتھ کے شر سے دوسرے مسلمان محفوظ و مامون ہوں۔

☆ اَلْمُؤْمِنُ مَنْ اَمِنَهُ النَّاسُ عَلٰى اَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ۔

(سنن بن ماجہ، حصہ دوم، ص:۱۲۹۸)

ترجمہ: مومن وہ ہے جس سے لوگ اپنے اموال اور اپنی جانوں کو محفوظ جانیں۔

☆ اَلرَّاحِمُوْنَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ، اِرْحَمُوْا مَنْ فِى الْاَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَّنْ فِى السَّمَاءِ۔ (سنن الترمذی، حصہ چہارم، ص:۳۲۳)

ترجمہ: رحم کرنے والوں ہی پر رحمٰن کی رحمت ہوتی ہے۔ زمین والوں پر رحم کرو، آسمانوں کا بادشاہ تم پر رحم فرمائے گا۔

کثیر ارشادات ہیں جن سے امنِ انفرادی اور امنِ اجتماعی کے تقاضوں کو بھر پور سمجھا جا سکتا ہے۔ ہم نے ابتدائی چند ابواب میں اولاً پیغمبرِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی پر امن ذاتی زندگی کی کچھ جھلکیاں پیش کی ہیں اور پھر امنِ انفرادی کی جو راہیں آپ نے واضح فرمائی ہیں اور امنِ اجتماعی کے جو خطوط آپ نے متعین فرمائے ہیں، انھیں باضابطہ طور پر بیان کرنے کی بھر پور کوشش کی ہے۔

اگلے صفحات کا مطالعہ ان شاء اللہ ثابت کرے گا کہ پوری دنیا میں امن و امان قائم کرنے کی صلاحیت اگر کسی نظام میں ہے تو وہ صرف اور صرف پیغمبرِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا نظام ہے۔ آپ کے لائے ہوئے نظام نے ہر ایک کے لیے امن و امان کی راہیں ہموار فرمائی ہیں۔ آپ کا نظامِ امن ایسا جامع نظام ہے کہ دنیا کی ہر قوم، ہر فردِ بشر اور ہر مخلوق کو چین اور سکون عطا کر سکتا ہے۔ یہ کوئی زبانی جمع خرچ نہیں ہے بلکہ کتاب کے اگلے حصے کا مطالعہ آپ کو اس حقیقت کے قبول کرنے پر ان شاء اللہ مجبور کرے گا۔

اللہ عزوجل کی بارگاہ میں دعا ہے کہ ہمارے ان الفاظ کو حقیقت کا جامہ پہنائے اور ہر ایک کو حق کہنے، سننے، سمجھنے اور بولنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین بجاہ النبی الکریم علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم

عبدہ المذنب
محمد شاکر نوری عفی عنہ
۱؍صفر المظفر ۱۴۳۸ھ/ ۲؍نومبر ۲۰۱۶ء

پہلا باب

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○
نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ وَنُسَلِّمُ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ ○

سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیغمبرِ امن ہیں

اللہ تبارک وتعالیٰ نے آقاے کونین سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو جو شریعت عطا فرما کر دنیا میں مبعوث فرمایا، اس کا نام ''اسلام'' اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کا نام ''ایمان'' اور ان دونوں کے تقاضوں کو پورا کرنے والوں کا نام ''مسلمان'' اور ''مومن'' رکھا۔ اسلام اور ایمان کے الفاظ ہی سے سلامتی اور امن وامان کا تصور ملتا ہے اور لفظِ مومن اور مسلم ہی سے امن وسلامتی کا پتہ چلتا ہے۔ بلاشبہہ اسلام کی ہر تعلیم امن وسلامتی کی ضامن اور ہر مسلمان امن وسکون قائم رکھنے کا ذمے دار ہے۔

جس طرح دینِ اسلام دینِ امن وامان ہے بالکل اسی طرح پیغمبرِ اسلام سیدنا محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم پیغمبرِ امن وامان ہیں۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات وارشادات، معمولات ومعاملات، نظریات وترجیحات اور اختیارات کا جو کوئی صاحبِ خرد تاریخ داں انصاف کی عینک لگا کر مطالعہ کرے گا، اس کی عقل اور جذبۂ حق بیانی اسے یہ کہنے پر مجبور کرے گی کہ روے زمین پر کوئی شخصیت سب سے بڑے سفیرِ امن، داعیِ امن کا ٹائٹل (Title) پاسکتی ہے تو پیغمبرِ امن سیدنا محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کی عظیم ذات ہے۔

اسی حقیقت کو دنیا کی سب سے سچی کتاب قرآنِ مقدس نے یوں بیان فرمایا:

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ○ (سورۂ انبیا، آیت: ۱۰۷)

ترجمہ: اور ہم نے تمھیں نہ بھیجا مگر رحمت سارے جہان کے لیے۔ (کنزالایمان)

خلاقِ کائنات نے حضور صلّی اللہ علیہ وسلم کو پوری کائنات کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ حضور نبی کریم رؤف ورحیم صلّی اللہ علیہ وسلم کی اسی عمومی رحمت کا نتیجہ تھا کہ ۲۳ سالہ قلیل مدت میں اس شمعِ رسالت کے اردگرد بے شمار پروانوں کا ہجوم لگ گیا اور مختلف رنگ ونسل کے لاکھوں انسان رنگ ونسل کی بدامن زنجیروں کوتوڑ کران کے دامنِ امن ورحمت سے وابستہ ہوگئے۔ قرآنِ مقدس نے اس کو یوں بیان فرمایا:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ۔ (سورۂ آل عمران، آیت:۱۵۹)

ترجمہ: توکیسی کچھ اللہ کی مہربانی ہے کہ اے محبوب تم ان کے لیے نرم دل ہوئے اور اگر تندمزاج سخت دل ہوتے تو وہ ضرور تمھاری گِرد سے پریشان ہوجاتے۔ (کنزالایمان)

دنیا بھر کی سچی تاریخ بتانے والی واحد کتاب کا بیان ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پوری دنیا کے لیے سراپا رحمت اور پرامن پیغمبر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ سے بڑھ کر امن پسند اور رحمت والا انسان نہ آج تک پیدا ہوا اور نہ کبھی آئندہ پیدا ہوگا۔

جسے مسلسل اکیس سالوں تک اذیتیں پہنچائی گئی ہوں، جس کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے ہوں، جس کے سر پر اونٹ کی اوجھڑیاں ڈالی گئی ہوں، جسے پاگل، مجنون اور دیوانہ کہہ کر مطعون کیا گیا ہو، جس کا سوشل بائیکاٹ کیا گیا ہو، جس پر پتھروں کی بارش برسائی گئی ہو، جس کے ماننے والوں کو روح فرسا تکلیفیں دی گئی ہوں، جس کے قتل کی سازشیں کی گئی ہوں، جسے گھر سے بے گھر کیا گیا ہو، جسے وطن عزیز کو خیرباد کہنے کے باوجود بھی چین وسکون سے رہنے نہ دیا گیا ہو اور عرصۂ دراز تک مشقِ ستم بنایا گیا ہو، پھر وہی انسان تقریباً اکیس

سالوں کے بعد جب اپنے دشمنوں پر غلبہ پانے کے بعد سب کو معاف کر دے تو اس سے بڑھ کر امن پسند کون ہوسکتا ہے؟ کیا تاریخِ عالم ایسی مثال پیش کرسکتی ہے کہ جس نے گالیاں سن کر دعائیں دی ہوں، جس نے پتھر کھا کر اور جسم کو زخموں سے چھلنی کرا کر، ظلم ڈھانے والوں کی خیر خواہی کی ہو اور خون کے پیاسوں کو جامِ حیات پلایا ہو؟

اگر عدل وانصاف کے ساتھ تاریخ دان تاریخ بیانی کریں گے تو بہ یک زبان یہی کہیں گے کہ ایسی ذات صرف اور صرف پیغمبرِ امن سیدنا محمد صلّی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔

آپ کی سیرتِ پاک کا جو کوئی مطالعہ کرتا ہے وہ یہی اعتراف کرتا ہے کہ۔۔۔۔

☆ پیغمبرِ امن صلّی اللہ علیہ وسلّم نے کفار مکہ کے ہاتھوں ہزار ہا تکلیفیں اور اذیتیں برداشت کیں لیکن کبھی نہ کسی کے لیے بددعا فرمائی اور نہ کسی پر نزولِ عذاب کی تمنا کی بلکہ اگر آپ کو عذاب کی دعا فرمانے کا اختیار بھی دیا گیا تب بھی از راہِ رحمت وشفقت آپ نے ہر تکلیف نظر انداز کی اور ظالموں سے درگزر کیا، حالاں کہ اُن کا جرم کچھ کم نہیں تھا کیوں کہ وہ اللہ کے پیارے رسول کو ایذا دینے کے گناہ میں مبتلا ہوئے تھے، اُن پر اللہ تعالیٰ کا عذاب قہر بن کر نازل ہونا چاہیے تھا لیکن آپ نے ہمیشہ عفو وکرم سے کام لیا اور محض آپ کی صفتِ رحمت کے باعث وہ قہرِ خداوندی سے محفوظ رہے۔

☆ حضور رحمت عالم صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنی گھریلو زندگی میں، گھر سے باہر کے معاملات میں، اپنوں اور غیروں کے ساتھ، بڑوں اور بچوں کے ساتھ ہمیشہ ایک ناصح ومشفق اور ہمدرد وغم گسار کی حیثیت سے نمایاں نظر آئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو رحمت سے معمور دل عطا فرمایا تھا جو کمزوروں کے لیے تڑپ اٹھتا تھا، مسکینوں اور یتیموں کی حالتِ زار پر غم سے بھر جاتا تھا۔ آپ کو پوری دنیا کی فکر رہا کرتی تھی۔ چھوٹے،

بڑے، اپنے، پرائے، مسلمان، کافر، انسان اور جانور سب آپ کے رحم و کرم سے بہرہ ور رہا کرتے تھے۔

☆ آپ کی بچوں پر شفقت ہمیشہ رہا کرتی تھی، مدینۂ منورہ کی گلیوں میں کوئی بچہ آپ کو کھیلتا کودتا نظر آتا تو آپ خوشی میں اس کو لپٹا لیا کرتے تھے، اس کو بوسے دیتے، اس کے ساتھ مزاح فرماتے۔ آپ نے ایسے وقت میں بچیوں کو اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ذریعہ قرار دیا جب ناک اونچی کرنے کے لیے بچیوں کو زندہ دفن کر دینے کا رواج تھا۔ آپ نے اُس وقت اُن پر تحفظ و سلامتی اور شفقت و محبت کی وسیع و عریض چادر تان دی تھی جب دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی بچیوں کے تحفظ و سلامتی کے لیے کوئی قانون نہ تھا۔ حضور رحمۃٌ للعالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بچوں اور بچیوں کو نہ صرف دائمی تحفظ بخشا بلکہ انھیں گود میں لے کر، کندھوں پر بٹھا کر، اپنے سینۂ مبارک سے لگا کر معاشرے میں ایسا بلند مقام دیا جس کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔

☆ اللہ کے رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم نے عورتوں کو مقامِ عزت و تحفظ عطا فرمایا۔ عورتوں کی فطری کمزوری کو مدِ نظر رکھتے ہوئے آپ نے بار بار صحابۂ کرام کو تلقین فرمائی کہ وہ عورتوں کے ساتھ نرمی کا معاملہ کریں، اُن کی دل جوئی کریں اور اُن کی طرف سے پیش آنے والی ناگوار باتوں پر صبر و تحمل کا مظاہرہ کریں۔ آپ نے خود اپنے طرزِ عمل سے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے سامنے خواتین کے ساتھ حسنِ سلوک کی اعلیٰ مثالیں قائم کیں۔ ایک مرتبہ اُم المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا اونٹنی پر سوار ہونے لگیں تو آپ سواری کے پاس بیٹھ گئے اور حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا آپ کے گھٹنوں کے اوپر پاؤں رکھ کر اونٹنی پر سوار ہوئیں۔ آپ نے بیواؤں سے نکاح کر کے دنیا کو یہ

پیغام دیا کہ بیواؤں کو تنہا نہ چھوڑو بلکہ اُنھیں بھی اپنے معاشرے میں عزت بخشو۔

☆ نبی امن ورحمت صلّی اللہ علیہ وسلّم کو خادموں اور نوکروں کا بھی بڑا خیال تھا۔آپ نے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ یہ خادم تمھارے بھائی ہیں، انھیں اللہ تعالیٰ نے تمھارا ماتحت بنا دیا ہے۔ اُنھیں اپنے کھانے میں سے کھلاؤ، ایسا لباس پہناؤ جیسا خود پہنتے ہو، ان کی طاقت وہمت سے زیادہ کام نہ لو، اگر کبھی کوئی سخت کام لو تو اُن کی مدد بھی کرو۔

☆ آپ کے دل میں یتیموں کے لیے بھی بڑی ہمدردی تھی، اس لیے آپ صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو یتیموں کی کفالت کرنے پر آمادہ کیا کرتے تھے۔ایک موقع پر آپ نے ارشاد فرمایا: میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں بالکل قریب ہوں گے۔

☆ سراپا رحمت، شفیعِ اُمت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی رحمت سے بے زبان جانور بھی مستفید ہوتے تھے۔ احادیث میں اس کی کثیر مثالیں موجود ہیں۔ایک مرتبہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کسی انصاری صحابی کے باغ میں تشریف لے گئے، وہاں ایک اونٹ موجود تھا، آپ کو دیکھ کر اونٹ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔آپ یہ منظر دیکھ کر اُس اونٹ کے پاس تشریف لے گئے اور اُس کے بدن پر ہاتھ پھیرا تو وہ پرسکون ہو گیا۔اُس کے بعد آپ نے دریافت کیا کہ اونٹ کس کا ہے؟ ایک انصاری نوجوان نے عرض کی: یارسول اللہ! میرا ہے۔آپ نے اُن سے فرمایا کہ کیا تم اللہ سے نہیں ڈرتے جس نے تمھیں اِس جانور کا مالک بنایا ہے؟ اِس نے مجھ سے تمھاری شکایت کی ہے کہ تم اِسے بھوکا رکھتے ہو اور اِس سے زیادہ کام لیتے ہو۔

☆ تاج دار مدینہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اندر تحمل بھی انتہائی اعلیٰ درجے کا موجود تھا، مکی دور

میں قریش مکہ نے آپ کو بے انتہا ستایا، آپ پر اور آپ کے صحابہ پر بے شمار مظالم ڈھائے گئے یہاں تک کہ آپ کو اپنا وطن عزیز بھی چھوڑنا پڑا۔ اِس سے بڑھ کر تکلیف دہ واقعہ انسان کے لیے کیا ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے ہم وطنوں کے ظلم وستم سے عاجز آ کر اپنا گھر بار سب کچھ چھوڑ کر دیارِ غیر میں جا کر مقیم ہوجائے۔ اِس کے باوجود جب چند سال بعد آپ فاتحانہ شان کے ساتھ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو عجز وانکساری سے آپ کی گردنِ مبارک جھکی ہوئی تھی اور آپ کی زبانِ مبارک پر یہ الفاظ تھے: لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ اَنْتُمُ الطُّلَقَآءُ، تم پر آج کوئی ملامت نہیں ہے، تم سب کے سب آزاد ہو۔ آپ اُس دن چاہتے تو اپنے تمام دشمنوں سے گن گن کر بدلہ لے سکتے تھے، مگر آپ نے انتقام پر عفو وکرم کو ترجیح دی۔ کسی نے کہہ دیا: اَلْيَوْمَ يَوْمَ الْمَلْحَمَةِ (آج تو بدلہ لینے کا دن ہے۔) تو آپ نے فرمایا: اَلْيَوْمَ يَوْمُ الْمَرْحَمَةِ (آج تو رحم وکرم کا دن ہے۔)

پیغمبرِ امن صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سیرتِ طیبہ کے یہ چند گوشے تھے جو ہر سیرت خواں کے ذہن ودل میں ہوتے ہیں۔ سیرتِ نبویہ سے واقف ہر انسان اس حقیقت کا معترف ہوتا ہے کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی پوری حیاتِ پاک امن پسندی اور رحمت وتحمل سے عبارت ہے۔ آغاز میں چند جھلکیاں مناسب معلوم ہوئیں تو پیش کردی گئیں، اگلے ابواب میں باقاعدہ تفصیل وتحقیق کے ساتھ پیغمبرِ امن صلّی اللہ علیہ وسلّم کی حیاتِ مقدسہ کے وہ گوشے ان شاء اللہ ملاحظہ کریں گے جن کا مطالعہ کرنے کے بعد ہر صاحبِ خرد یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوگا کہ شہنشاہِ کونین حضور رحمتِ عالم صلّی اللہ علیہ وسلم نہ صرف بذاتِ خود پرامن ہیں بلکہ آپ بلاشبہہ امن دہندہ بھی ہیں۔

دوسرا باب

اعلانِ نبوت سے قبل بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیکرِ امن تھے

ویسے تو سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ولادت سے اعلانِ نبوت تک کی زندگی میں بھی کثیر واقعات ایسے ملتے ہیں جن سے آپ کی امن پسندی اور عدل وانصاف کی عادت کا بھرپور علم حاصل ہوتا ہے اور یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جس طرح آپ بعدِ اعلانِ نبوت عدل وانصاف کے داعی رہے ہیں ویسے ہی اعلانِ نبوت سے پیشتر بھی عدل وانصاف اور امن وامان کے پیکر رہے ہیں۔ یہاں فقط چند اہم واقعات نقل کیے جا رہے ہیں جن سے اس حقیقت کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔

ایامِ رضاعت میں عدل وانصاف

کسی بھی انسان کی جوانی اور بڑھاپے میں عدل وانصاف کرنے کے واقعے ملتے ہیں لیکن رضاعت کے ایام میں عدل وانصاف کرنا پیغمبرِ امن صلّی اللہ علیہ وسلّم کا خاصہ ہے۔

حضرتِ حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا دودھ پلانے کا واقعہ بیان فرماتی ہیں:

دَنَوْتُ مِنْهُ رُوَيْدًا فَوَضَعْتُ يَدِيْ عَلٰى صَدْرِهٖ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا، وَفَتَحَ عَيْنَيْهِ لِيَنْظُرَ اِلَيَّ، فَخَرَجَ مِنْ عَيْنَيْهِ نُوْرٌ حَتّٰى دَخَلَ خِلَالَ السَّمَاءِ وَاَنَا اَنْظُرُ، فَقَبَّلْتُهٗ بَيْنَ عَيْنَيْهِ، وَاَعْطَيْتُهٗ ثَدْيِي الْاَيْمَنَ، فَاَقْبَلَ عَلَيْهِ بِمَا شَاءَ مِنْ لَبَنٍ، فَحَوَّلْتُهٗ اِلَى الْاَيْسَرِ فَاَبٰى، وَكَانَتْ تِلْكَ حَالُهٗ بَعْدُ۔ قَالَ اَهْلُ الْعِلْمِ: اَعْلَمَهُ اللهُ تَعَالٰى اَنَّ لَهٗ شَرِيْكًا فَاَلْهَمَهُ الْعَدْلَ۔

(المواہب اللدنیۃ، جلد:۱، ص:۹۱ ذکر رضاعہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

ترجمہ: میں حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے قریب ہوئی اور اپنا ہاتھ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے سینۂ مبارکہ پر رکھا تو آپ نے تبسم فرماتے ہوئے آنکھ کھولی، آپ کی آنکھوں سے ایسا نور ظاہر ہوا کہ آسمان تک اس کا اثر دکھائی دیا، پھر میں نے اپنا داہنا پستان پیش کیا تو آپ نے جس قدر چاہا نوش فرمایا، پھر میں نے بائیں پستان کی طرف آپ کو پھیر دیا تو آپ نے اپنا منہ ہٹالیا اور یہی حال آپ کا ہمیشہ رہا، یعنی بائیں پستان کو ہمیشہ چھوڑ دیتے تھے۔

مصنف فرماتے ہیں: یہاں علما یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضور صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کو اپنے شریکِ دودھ کا علم دے دیا تھا اور انھیں عدل وانصاف کا الہام فرمایا تھا۔ (اسی لیے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم اپنے شریک کے ساتھ انصاف فرماتے ہوئے دوسری چھاتی کا دودھ کبھی نوش نہ فرماتے۔)

حربِ فجار میں حملے سے احتراز

اسلام سے پہلے عربوں میں لڑائیوں کا ایک طویل سلسلہ جاری تھا۔ انھی لڑائیوں میں سے ایک مشہور لڑائی ''جنگ فجار'' کے نام سے مشہور ہے۔ عرب کے لوگ ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور رجب کے مہینوں کا بے حد احترام کرتے تھے اور ان مہینوں میں لڑائی کرنے کو گناہ جانتے تھے، یہاں تک کہ عام طور پر ان مہینوں میں لوگ تلواروں کو نیام میں رکھ دیتے اور نیزوں کی انیاں اتار لیتے تھے۔ مگر اس کے باوجود کبھی کبھی ان کے اعتبار سے کچھ ایسے ہنگامی حالات پیدا ہوئے کہ مجبوراً ان مہینوں میں بھی انھیں لڑائیاں کرنی پڑیں۔ انھی لڑائیوں کو اہل عرب ''حروب فجار'' (گناہ کی لڑائیاں) کہتے تھے۔ سب سے آخری جنگِ فجار جو قریش اور قیس کے قبیلوں کے درمیان ہوئی اس وقت حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عمر شریف بیس برس کی تھی۔ چوں کہ قریش اس جنگ میں حق پر تھے، اس لیے ابو طالب وغیرہ اپنے

چچاؤں کے ساتھ آپ نے بھی اس جنگ میں شرکت فرمائی، مگر کسی پر ہتھیار نہیں اٹھایا، صرف اتنا ہی کیا کہ اپنے چچاؤں کو تیر اٹھا اٹھا کر دیتے رہے۔ اس لڑائی میں پہلے قیس پھر قریش غالب آئے اور آخر کار صلح پر اس لڑائی کا خاتمہ ہو گیا۔

(سیرتِ مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بحوالہ سیرت ابن ہشام، جلد دوم، ص:۱۸۶)

یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ بیس سالہ نوجوان کا جنگ میں جذباتی کردار کیا ہو سکتا ہے، قبیلۂ قریش کے حق پر ہونے کے باوجود آقاے کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس جنگ میں کسی پر تلوار نہیں اٹھائی۔ یہ آپ کی امن پسندی ہی تھی کہ آپ نے جنگ میں باقاعدہ حملے سے احتراز فرمایا۔

حلفُ الفُضول میں شرکت اور بعدِ اعلانِ نبوت اس کی مدح سرائی

روز روز کی لڑائیوں سے عرب کے سیکڑوں گھرانے برباد ہو گئے تھے، ہر طرف بدامنی اور آئے دن کی لوٹ مار سے ملک کا امن وامان غارت ہو چکا تھا، کوئی شخص اپنی جان و مال کو محفوظ نہیں سمجھتا تھا۔ نہ دن کو چین تھا، نہ رات کو آرام تھا۔ اس وحشت ناک صورتِ حال سے تنگ آ کر کچھ صلح پسند لوگوں نے جنگ فجار کے خاتمے کے بعد ایک اصلاحی تحریک چلائی۔ بنو ہاشم، بنو زہرہ، بنو اسد وغیرہ قبائل قریش کے بڑے بڑے سرداران عبد اللہ بن جُدعان کے مکان پر جمع ہوئے اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے چچا زبیر بن عبد المطلب نے یہ تجویز پیش کی کہ موجودہ حالات کو سدھارنے کے لیے کوئی معاہدہ کرنا چاہیے۔ خاندان قریش کے سرداروں نے بقاے باہم کے اصول پر جیو اور جینے دو کے قسم کا ایک معاہدہ کیا اور حلف اٹھا کر عہد کیا کہ ہم لوگ:

(۱) مسافروں کی حفاظت کریں گے۔

(۲) ملک سے بے امنی دور کریں گے۔

(۳) مظلوم کی حمایت کریں گے۔

(۴) غریبوں کی امداد کرتے رہیں گے۔

(۵) کسی ظالم یا غاصب کو مکہ میں نہیں رہنے دیں گے۔

اس معاہدے میں حضورِ اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی شریک ہوئے۔آپ کو یہ معاہدہ اس قدر عزیز تھا کہ اعلانِ نبوت کے بعد آپ فرمایا کرتے تھے:

شَهِدْتُّ مَعَ عُمُوْمَتِيْ حَلْفَ الْمُطَيِّبِيْنَ، فَمَا اُحِبُّ اَنْ اَنْكُثَهٗ وَاَنَّ لِيْ حُمُرَ النَّعَمِ۔

ترجمہ: میں اپنے چچاؤں کے ساتھ حلف الفضول میں حاضر تھا، اس کی حاضری مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ میرے لیے سرخ اونٹ ہوں۔

ایک مقام پر آپ نے فرمایا:

لَقَدْ شَهِدْتُّ فِيْ دَارِ عَبْدِ اللهِ بْنِ جُدْعَانَ حَلْفًا، لَوْ دُعِيْتُ بِهٖ فِي الْاِسْلَامِ لَاَجَبْتُ۔

ترجمہ: میں عبداللہ بن جُدعان کے گھر میں ایک ایسے حلف میں حاضر ہوا تھا کہ اگر اس کا واسطہ دے کر مجھے اسلام میں پکارا جائے تو میں ضرور مدد کے لیے آؤں گا۔

اس تاریخی معاہدے کو حلفُ الفضول اس لیے کہتے ہیں کہ قریش کے اس معاہدے سے بہت پہلے مکہ میں قبیلۂ جُرہم کے سرداروں کے درمیان بھی بالکل ایسا ہی ایک معاہدہ ہوا تھا۔قبیلۂ جُرہم کے جو لوگ اس معاہدے کے محرک تھے ان سب لوگوں کا نام فضل تھا، یعنی فضل بن حارث، فضل بن وداعہ، فضل بن فضالہ، اس لیے اس معاہدے کا نام

حلف الفضول رکھ دیا گیا۔ (ملخصًا از سیرتِ مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بحوالۂ سیرت ابن ہشام، جلد اول، ص: ۱۳۴)

مذکورہ واقعہ پر بعدِ اعلانِ نبوت آپ کا اظہارِ فخر فرمانا، اس بات کی واضح دلیل ہے کہ امن وسلامتی کی محبت آپ کے اندر فطری وطبعی طور پر ودیعت کردی گئی تھی۔ جب کہ یہ واقعہ بعدِ بعثت پیش آنے والے امن وسلامتی کے واقعات کے سامنے عشر عشیر کی بھی حیثیت نہیں رکھتا، اس کے باوجود حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کی مدح وتعریف فرمائی۔

کعبے کی تعمیر اور حجر اسود کی تنصیب کے اختلاف کا خاتمہ

حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو خداوند عالم عزوجل نے راست بازی اور امانت ودیانت کی بدولت اس قدر مقبولِ خلائق بنادیا اور عقلِ سلیم اور بے مثال دانائی کا ایسا عظیم جوہر عطا فرمادیا کہ کم عمری میں آپ نے عرب کے بڑے بڑے سرداروں کے جھگڑوں کا ایسا لاجواب فیصلہ فرمادیا کہ بڑے بڑے دانشوروں اور سرداروں نے اس فیصلے کی عظمت کے آگے سر جھکادیا اور سب نے بالاتفاق آپ کو اپنا حَکَم اور سردارِ اعظم تسلیم کرلیا۔

جب آپ کی عمر پینتیس (۳۵) برس کی ہوئی تو زوردار بارش سے حرم کعبہ میں ایسا عظیم سیلاب آگیا کہ کعبے کی عمارت بالکل ہی منہدم ہوگئی۔ حضرت ابراہیم وحضرت اسماعیل علیہما السلام کا بنایا ہوا کعبہ بہت پرانا ہو چکا تھا۔ عمالقہ، قبیلۂ جُرہم اور قُصی وغیرہ اپنے اپنے وقتوں میں اس کعبے کی تعمیر اور مرمت کرتے رہتے تھے مگر چونکہ عمارت نشیب میں تھی اس لیے پہاڑوں سے برساتی پانی کے بہاو کا زوردار دھارا وادیِ مکہ میں ہوکر گزرتا تھا اور اکثر حرم کعبہ میں سیلاب آجاتا تھا۔ کعبے کی حفاظت کے لیے بالائی حصے میں قریش نے کئی بند بھی بنائے تھے مگر وہ بند بار بار ٹوٹ جاتے تھے۔ اس لیے قریش نے یہ طے کیا کہ عمارت کو شہید کرکے پھر سے کعبے کی ایک مضبوط عمارت بنائی جائے جس کا دروازہ بلند ہو اور چھت بھی ہو۔

قریش نے مل جل کر تعمیر کا کام شروع کر دیا، اس تعمیر میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی شریک ہوئے اور سردارانِ قریش کے دوش بدوش پتھر اٹھا اٹھا کر لاتے رہے۔ مختلف قبیلوں نے تعمیر کے لیے مختلف حصے آپس میں تقسیم کر لیے۔ جب عمارت ''حجرِ اسود'' تک پہنچ گئی تو قبائل میں سخت جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ ہر قبیلہ یہی چاہتا تھا کہ ہم ہی حجرِ اسود کو اٹھا کر دیوار میں نصب کریں تاکہ ہمارے قبیلے کے لیے یہ فخر و اعزاز کا باعث بن جائے۔ اس کشمکش میں چار دن گزر گئے اور یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ تلواریں نکل آئیں۔ بنوعبدالدار اور بنوعدی کے قبیلوں نے تو اس پر جان کی بازی لگا دی اور زمانۂ جاہلیت کے دستور کے مطابق اپنی قسموں کو مضبوط کرنے کے لیے ایک پیالے میں خون بھر کر اپنی انگلیاں اس میں ڈبو کر چاٹ لیں۔ پانچویں دن حرمِ کعبہ میں تمام قبائلِ عرب جمع ہوئے اور اس جھگڑے کو طے کرنے کے لیے ایک بڑے بوڑھے شخص نے یہ تجویز پیش کی کہ کل جو شخص صبح سویرے سب سے پہلے حرمِ کعبہ میں داخل ہو اس کو پنچ (فیصل) مان لیا جائے، وہ جو فیصلہ کر دے سب اس کو تسلیم کر لیں۔ اس بات کو ہر کسی نے تسلیم کر لیا اور صبح کا انتظار کرنے لگے۔

خدائے عزوجل کی شان کہ صبح کو جو شخص حرمِ کعبہ میں داخل ہوا وہ حضور رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہی تھے۔ آپ کو دیکھتے ہی سب پکار اٹھے کہ واللہ یہ ''امین'' ہیں، لہٰذا ہم سب ان کے فیصلے پر راضی ہیں۔ حضور رحمتِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس جھگڑے کا بڑی آسانی کے ساتھ تصفیہ فرمایا۔ پہلے آپ نے یہ حکم دیا کہ جس جس قبیلے کے لوگ حجر اسود کو اس کے مقام پر رکھنے کے مدعی ہیں ان کا ایک ایک سردار چن لیا جائے۔ ہر قبیلے والوں نے اپنا اپنا سردار چن لیا۔ پھر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنی چادرِ مبارک کو بچھا کر حجر اسود کو اس پر رکھا اور سرداروں کو حکم دیا کہ سب لوگ اس چادر کو تھام کر مقدس پتھر کو اٹھائیں۔

سب سرداروں نے چادر کو اٹھایا اور جب حجر اسود اپنے مقام تک پہنچ گیا تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے متبرک ہاتھوں سے اس مقدس پتھر کو اٹھا کر اس کی جگہ پر رکھ دیا۔ اس طرح ایک ایسی خوں ریز لڑائی ٹل گئی جس کے نتیجے میں نہ معلوم کتنا خون خرابہ ہو جاتا۔

(سیرتِ مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بحوالہ سیرتِ ابن ہشام، جلد اول، ص:۱۹۶، ۱۹۷)

اس واقعے سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم اعلانِ نبوت سے پیشتر بھی امن پسند تھے اور دوسروں کے لیے امن کی راہیں ہموار فرماتے تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امانت داری اور حضرت خدیجہ کا پیغام نکاح بھیجنا

دنیا میں بدامنی کا بہت بڑا سبب امانت داری کا فقدان بھی ہوتا ہے۔ کسی شخص نے کسی کے ساتھ خیانت کی تو نوبت جھگڑے لڑائی تک پہنچتی ہے پھر امن وسکون کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ آقائے کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قبلِ اعلانِ نبوت تاجرانہ زندگی میں بھی جس طرح دیگر محاسنِ اخلاق کے پیکر تھے اسی طرح آپ نے امانت داری کا بھی عظیم ثبوت پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو لوگوں نے صادق وامین کے لقب سے یاد کرنا شروع کر دیا تھا۔

جب حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے مالِ تجارت کو لے کر آپ ان کے غلام مَیسَرَہ کے ساتھ نکلے اور واپسی میں ڈھیروں نفع لے کر لوٹے، جسے آپ نے پوری امانت داری کے ساتھ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سپرد کر دیا تو وہ آپ سے بہت متأثر ہوئیں۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا مال ودولت کے ساتھ انتہائی شریف اور عفت مآب خاتون تھیں۔ اہل مکہ ان کی پاک دامنی اور پارسائی کی وجہ سے ان کو طاہرہ (پاکباز) کہا کرتے تھے۔ ان کی عمر چالیس سال کی ہو چکی تھی، پہلے ان کا نکاح ابو ہالہ بن زرارہ تمیمی سے ہوا تھا اور ان سے دو لڑکے ''ہند بن ابو ہالہ'' اور ''ہالہ بن ابو ہالہ'' پیدا ہو چکے تھے۔ پھر ابو ہالہ

کے انتقال کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے دوسرا نکاح ''عتیق بن عابد مخزومی'' سے کیا۔ ان سے بھی دو اولاد ہوئی، ایک لڑکا ''عبداللہ بن عتیق'' اور ایک لڑکی ''ہند بنت عتیق''۔حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے دوسرے شوہر عتیق کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔

بڑے بڑے سردارانِ قریش ان کے ساتھ نکاح کے خواہش مند تھے لیکن انھوں نے سب کے پیغاموں کو ٹھکرا دیا تھا۔ مگر حضورِ اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیغمبرانہ اخلاق وعادات کو دیکھ کر اور آپ کے حیرت انگیز حالات کو سن کر یہاں تک ان کا دل آپ کی طرف مائل ہو گیا کہ خود بخود ان کے قلب میں آپ سے نکاح کی رغبت پیدا ہو گئی۔

کہاں تو بڑے بڑے مالداروں اور شہر مکہ کے سرداروں کے پیغاموں کو رد کر چکی تھیں اور یہ طے کر چکی تھیں کہ اب چالیس برس کی عمر میں تیسرا نکاح نہیں کروں گی اور کہاں خود ہی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی پھوپھی حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو بلایا جو ان کے بھائی عوام بن خویلد کی بیوی تھیں۔ ان سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے کچھ ذاتی حالات کے بارے میں مزید معلومات حاصل کیں پھر نفیسہ بنت اُمیّہ کے ذریعہ خود ہی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس نکاح کا پیغام بھیجا۔

مشہور امام سیرت محمد بن اسحٰق نے لکھا ہے کہ اس رشتے کو پسند کرنے کی جو وجہ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بیان کی ہے وہ خود ان کے الفاظ میں یہ ہے: اِنِّیْ قَدْ رَغِبْتُ فِیْكَ لِحُسْنِ خُلُقِكَ وَ صِدْقِ حَدِیْثِكَ۔

یعنی میں نے آپ کے اچھے اخلاق اور سچائی کی وجہ سے آپ کو پسند کیا۔

(سیرتِ مصطفی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم بحوالہ زرقانی علی المواہب، ج:۱،ص:۲۰۰)

حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا سردارانِ قریش کے رشتوں کو ٹھکرا کر حضور سید

عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے رشتۂ زوجیت قائم کرنے کے لیے تیار ہونا اور اس کی آپ نے جو وجہ بیان فرمائی وہ یقیناً اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ آقاے کون ومکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اعلانِ نبوت سے قبل بھی ایک امن پسند انسان اور مکارمِ اخلاق، صدقِ مقال اور حسنِ معاملت کے پیکر تھے۔

امانت سے بھرپور تجارت

عموماً تجارت کے معاملات میں انسان چوک جاتا ہے اور بارہا نفس کے اکسانے کی وجہ سے اپنے نفع کے لیے دوسروں کا نقصان کرا دینے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ پھر لین دین کے معاملات میں بھی بارہا ایسے مواقع آتے ہیں کہ جن کے ساتھ مُعامَلَتْ یعنی لین دین ہوتی ہے وہ بدگمان اور متنفر ہو جاتا ہے۔ آقاے کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے تجارتی معاملات ان ساری خرابیوں سے پاک اور صاف تھے۔ اس کی شہادت خود آپ کے تاجر ساتھیوں اور جن کے ساتھ آپ کے معاملات تھے ان حضرات نے دی ہے۔

حضرت قیس بن سائب مخزومی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تجارت میں آپ کے شریکِ کار رہا کرتے تھے اور آپ کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا معاملہ اپنے تجارتی شریکوں کے ساتھ ہمیشہ نہایت ہی صاف ستھرا رہتا تھا اور کبھی کوئی جھگڑا پیش نہیں آتا تھا۔ (استیعاب، ج:۲،ص:۷۵۳)

حضرت عبداللہ بن ابی الحمساء بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبیِ کریم رؤف ورحیم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کے اعلانِ نبوت سے قبل بیع وشرا کا ایک معاملہ کیا، مجھ پر کچھ قیمت باقی رہ گئی تھی، میں نے کہا کہ آپ رکیے میں ابھی لے کر آتا ہوں، میں گھر آ کر بھول گیا اور مجھے تین دنوں کے بعد یاد آیا۔ جب میں واپس آیا تو دیکھا کہ آپ وہیں موجود ہیں۔ آپ

نے مجھ سے کہا: يَا فَتًى لَقَدْ شَقَقْتَ عَلَيَّ اَنَا هَاهُنَا مُنْذُ ثَلَاثٍ اَنْتَظِرُكَ۔

ترجمہ: اے نوجوان! تم نے مجھے دشواری میں ڈال دیا، میں یہیں پر تین دنوں سے تمھارا انتظار کررہا ہوں۔ (سنن ابی داؤد، جلد دوم، ص: ۳۳۴)

کاروباری معاملت میں اس کردار کی مثال کہیں نہیں مل سکتی ہے کہ وعدہ کیا تھا کہ یہیں رکیں گے تو تین دنوں تک انتظار کرتے رہ گئے۔ پھر تین دنوں کے بعد بھی جب صاحبِ معاملہ آئے تو صرف ایک نرم جملے پر اکتفا فرمایا۔

آپ کا وصفِ امانت اور لقبِ امین

پیغمبرِ امن حضرت محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم اپنے وصفِ امانت میں بھی بے مثال ہیں۔ کیوں کہ امانت کی مختلف قسموں میں سے سب سے بڑی قسم وحیِ الٰہی کے آپ امین ہیں۔ اللہ عزوجل نے رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اپنی وحی کا امین بنا کر اس دنیا میں مبعوث کیا۔ ایک امین کے لیے ضروری ہے کہ وہ امانت میں کسی طرح کا تصرف نہ کرے اور وہ جس طرح سے ہے اسی صورت میں اسے پہنچا دے۔ آقائے کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے وحیِ الٰہی کے امین ہونے کی ذمے داری سنبھالی تو اس کو پوری طرح سے بغیر کسی کمی وزیادتی کے احسن طریق پر نبھایا اور آپ کی اسی امانت داری کو خالقِ کائنات یوں بیان فرماتا ہے:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ○ (سورۂ نجم، آیت: ۴)

ترجمہ: اور وہ کوئی بات اپنی خواہش سے نہیں کرتے، وہ تو نہیں مگر وحی جو انھیں کی جاتی ہے۔ (کنزالایمان)

امانت کی دوسری قسم لوگوں کے اموال اور رازوں کی حفاظت کرنا ہے، اس میں بھی آقائے کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بے مثل و بے مثال نظر آتے ہیں۔ آپ کی امانت کا یہ

عالم تھا کہ اعلانِ نبوت سے پہلے ہی اہلِ عرب آپ کو امین کہنے لگے تھے۔

آپ کی امانت اس قدر مشہور و یقینی تھی کہ آپ کے شدید دشمن اور کفار بھی اپنی امانتیں آپ کے پاس رکھوا کر مطمئن ہو جایا کرتے تھے۔ آپ نے کبھی بھی کسی کی امانت میں ذرہ برابر بھی خیانت نہ کی، یہاں تک کہ جب مکے سے ہجرت کر کے مدینے جانے لگے تب بھی تمام امانتیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سپرد فرمایا اور کہا کہ ان کو ان کے مالکوں تک پہنچا دینا۔

ہجرت کی رات میں کفار نے خانۂ اقدس کا محاصرہ کیا تھا اور وہ لوگ آپ کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کا پورا عزم کر کے آئے تھے، ایسے میں کس قدر شدید خوف و ہراس ہو سکتا ہے؟ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ اس کے باوجود ایسے ماحول میں بھی امانتیں لوٹانے کی فکر کرنا اور انھیں لوٹانے کے لیے اپنے کسی خاص کو اپنا نائب بنا کر نکلنا اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ آپ کو امانتوں کی بے انتہا فکر ہوا کرتی تھی اور آپ اعلیٰ درجے کے بے مثل امین تھے۔

والدین سے زیادہ پُرامن بارگاہِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ یمن کے ایک قبیلے کے سردار حارثہ بن شُرحبیل کے صاحبزادے تھے، انھیں ڈاکوؤں نے آٹھ سال کی عمر میں اِغوا کر کے بیچ دیا تھا، حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے انھیں خریدا تھا، وہ آپ کے خادم تھے، پھر جب حضرت خدیجہ سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نکاح فرمایا تو آپ نے حضرت زید بن حارثہ کو بطور تحفہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش فرمایا۔ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت کرتے رہے یہاں تک کہ ان کے والد اور چچا ان کی تلاش کرتے کرتے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس پہنچے تو آپ نے امن کی بحالی کے لیے جو ترکیب اختیار کی وہ واقعی قابلِ تقلید ہے۔ آپ نے خود زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

کو اختیار دے دیا کہ جس کو چاہیں اختیار کریں، یعنی چاہیں تو اپنے باپ کے ساتھ چلے جائیں اور چاہیں تو میرے پاس رہیں۔ انھوں نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحبت کو ترجیح دی۔

حالاں کہ حضرتِ زید بن حارثہ پر پورا حق پیغمبرِ امن صلّی اللہ علیہ وسلّم کا تھا کیوں کہ وہ آپ کے غلام تھے، اس کے باوجود آپ نے ایک بیٹے کو اپنے والد سے جدا کرنا مناسب نہ سمجھا، اس لیے آپ نے انھیں اختیار دیا لیکن انھوں نے اختیار کا استعمال نہ کر کے یہ درس دیا کہ جو امن وسکون پیغمبرِ امن صلّی اللہ علیہ وسلّم کے دامن سے وابستہ رہنے میں میسر ہے وہ والدین کی صحبت میں بھی میسر نہیں آ سکتا۔

عام لوگوں سے ممتاز پرامن زندگی

حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زندگی ابتدا سے انتہا تک عام لوگوں سے نرالی تھی۔ آپ کا شباب حیا سے بھرپور تھا اور چال چلن سنجیدگی اور وقار کا کامل نمونہ تھا۔ اعلانِ نبوت سے قبل حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تمام زندگی بہترین اخلاق وعادات کا خزانہ تھی۔ ہر وہ کام جو امن وسکون قائم کرنے میں مؤثر ہوتا ہے اس کے آپ پابند تھے اور امن وسکون غارت کرنے والے ہر کام سے گریز کرنے والے تھے۔ سچائی، دیانت داری، وفاداری، عہد کی پابندی، بزرگوں کی عظمت، چھوٹوں پر شفقت، رشتے داروں سے محبت، رحم وسخاوت، قوم کی خدمت، دوستوں سے ہمدردی، عزیزوں کی غم خواری، غریبوں اور مفلسوں کی خبر گیری، دشمنوں کے ساتھ نیک برتاؤ، مخلوق خدا کی خیر خواہی، غرض تمام نیک خصلتوں اور اچھی عادتوں میں آپ اتنے بلند مقام پر پہنچے ہوئے تھے کہ دنیا کے بڑے سے بڑے انسانوں کے لیے وہاں تک رسائی تو کیا اس کا تصور بھی ممکن نہیں ہے۔

کم بولنا، فضول باتوں سے نفرت کرنا، خندہ پیشانی اور خوش روئی کے ساتھ دوستوں

اور دشمنوں سے ملنا، ہر معاملے میں سادگی اور صفائی کے ساتھ بات کرنا حضور جان رحمت ورأفت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا خاص شیوہ تھا۔

حرص، طمع، دغا، فریب، جھوٹ، شراب نوشی، بدکاری، ناچ، گانا، لوٹ مار، چوری، فحش گوئی، عشق بازی، یہ تمام بری عادتیں اور مذموم خصلتیں جو زمانۂ جاہلیت میں عموماً ہر فرد کے خمیر میں ہوتی تھیں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ان تمام سے پاک وصاف رہی۔ آپ کی راست بازی اور امانت ودیانت کا پورے عرب میں شہرہ تھا اور مکے کے ہر چھوٹے بڑے کے دل میں آپ کے عمدہ اخلاق کا اعتبار اور سب کی نظر میں آپ کا ایک خاص وقار تھا۔

اُم المؤمنین سیدتنا خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا اِن الفاظ میں مذکورہ حقائق کا اعتراف کرتی ہیں:

فَوَاللهِ، لَا يُخْزِيْكَ اللهُ أَبَدًا، وَاللهِ، إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ، وَتَصْدُقُ الْحَدِيثَ، وَتَحْمِلُ الْكَلَّ، وَتُكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ، وَتَقْرِی الضَّيْفَ، وَتُعِيْنُ عَلٰى نَوَائِبِ الْحَقِّ۔ (صحیح مسلم: ۲۵۲، باب بدء الوحی)

ترجمہ: قسم بخدا! اللہ تعالیٰ کبھی آپ کو رسوا نہیں فرمائے گا کیوں کہ آپ تو صلہ رحمی فرماتے ہیں، ہمیشہ صدق بیانی سے کام لیتے ہیں، دوسروں کا بوجھ خود برداشت فرماتے ہیں، لوگوں کو غیر حاصل فوائد دلاتے ہیں، مہمانوں کی ضیافت فرماتے ہیں اور حق کے کاموں میں ہر ایک کی امداد فرماتے ہیں۔

تیسرا باب

اعلانِ نبوت کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پُرامن مکی زندگی

پیغمبرِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سیرت کا مطالعہ کرنے والا ہر شخص اچھی طرح جانتا ہے کہ اعلانِ نبوت سے قبل آپ کے بلند اخلاق اور عمدہ کردار کا پورا عرب ہی نہیں بلکہ تجارتی اَسفار کے لیے آپ جہاں جہاں تشریف لے گئے وہاں کے لوگ بھی قائل تھے۔ ہر جگہ آپ کے صدق وامانت اور آپ کی اخلاقی عمدگی کا ڈنکا بجتا تھا۔

اعلانِ نبوت کے بعد آپ حکمِ الٰہی کے مطابق ایک عرصے تک خفیہ تبلیغ فرماتے رہے اور اس کے نتیجے میں متعدد افراد حلقۂ اسلام میں داخل بھی ہو گئے۔ پھر جب آیۂ مقدسہ "وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ" نازل ہوئی تو آپ نے کوہِ صفا کی چوٹی سے صدائے اسلام بلند کی اور لوگوں کو خدائے وحدہٗ لاشریک کی عبادت اور شرک سے اجتناب کی طرف مدعو کیا۔ آپ نے "یامعشرَ القریش" کہہ کر قبیلۂ قریش کو پکارا۔

جب سب جمع ہو گئے تو آپ نے فرمایا: اے میری قوم! اگر میں تم لوگوں سے یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے ایک لشکر چھپا ہوا ہے جو تم پر حملہ کرنے والا ہے تو کیا تم لوگ میری بات کا یقین کر لو گے؟ سب نے یک زباں کہا کہ ہاں! ہم ضرور آپ کی بات کا یقین کر لیں گے کیوں کہ ہم نے آپ کو ہمیشہ سچا اور امین ہی پایا ہے۔ آپ نے فرمایا: اچھا تو پھر میں یہ کہتا ہوں کہ میں تم لوگوں کو عذابِ الٰہی سے ڈرا رہا ہوں اور اگر تم لوگ ایمان نہ لاؤ گے تو تم پر عذابِ الٰہی اتر پڑے گا۔ یہ سن کر تمام قریش سخت ناراض ہو کر چلے گئے اور آپ کی شان میں اول فول بکنے لگے۔ (صحیح البخاری، حصہ ششم، ص:۱۷۹)

پھر جب آیۂ مقدسہ ”فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ“(تو اعلانیہ کہہ دو جس بات کا تمھیں حکم ہے) نازل ہوئی تو آپ نے علانیہ تبلیغِ اسلام شروع فرمائی اور شرک اور بت پرستی کی کھلم کھلا مذمت فرمانے لگے۔ اس بنیاد پر تمام اہلِ قریش بلکہ پورا عرب آپ کا مخالف ہو گیا۔ اِدھر آپ نے تبلیغِ اسلام کا سلسلہ جاری رکھا اور اُدھر آپ پر ایذا رسانی اور تکالیف کا نہ تھمنے والا سلسلہ چل پڑا۔

بے انتہا اذیتیں اور صبرِ جمیل

حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب پر آپ کے اعلانِ نبوت اور تبلیغ اسلام کی ابتدا کے بعد ظلم وتشدد کے پہاڑ توڑے گئے، اس کے باوجود آپ نے بقاے امن کی جو کوشش کی ہے وہ عدیم المثال ہے۔ اس کا سبب یہ نہیں کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کچھ نہ کر سکتے تھے اس لیے صبر کرتے جاتے، بلکہ اگر دیکھا جائے تو آپ آسانی کے ساتھ مخالفین کے خلاف کارروائی کر سکتے تھے۔

دنیوی اعتبار سے اعلانِ نبوت کے بعد اگرچہ اکثر لوگوں نے حمایت چھوڑ دی تھی لیکن پھر بھی آپ کا قبیلہ آپ کے ساتھ تھا، آپ چاہتے تو مدد کے لیے ان کو آواز دیتے، پھر جنگ چھڑ جاتی۔

اُخروی اعتبار سے آپ کا تعلق تو آسمانی دنیا سے اور اِس کائنات کے خالق سے ہے، اگر آپ چاہتے تو ایک مرتبہ دعاے ہلاکت فرماتے اور پوری قوم ہلاک ہو جاتی، جیسا کہ بعض انبیاے سابقین کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے۔

آپ کی امن پسند طبیعت نے ان دونوں باتوں کو گوارا نہیں کیا، بلکہ جب بھی آپ پر ظلم وتشدد کی انتہا کی گئی، آپ نے یہی فرمایا: اَللّٰھُمَّ اِھْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَا

يَعْلَمُوْنَ○ یعنی اے اللہ! میری قوم کو ہدایت دے اس لیے کہ وہ (مجھے) جانتے نہیں ہیں۔

ویسے تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر کیے جانے والے مظالم کی داستان بہت طویل ہے لیکن اختصار کے پیشِ نظر یہاں چند واقعات ذکر کیے جا رہے ہیں، جنھیں پڑھ کر بہ آسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضور صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے اپنے دورِ مظلومی اور مغلوبی میں صبر وتحمل کے عدیم المثال نمونے پیش فرما کر امن کی بقا کو یقینی بنایا ہے۔ آپ نے اگر اپنے چند فرماں برداروں اور خاندان والوں کے ساتھ مل کر جوابی کاروائیاں کی ہوتیں تو لڑائیوں کا طویل سلسلہ شروع ہو جاتا اور امنِ عام بے انتہا متأثر ہو جاتا۔ اس لیے آپ نے کسی جوابی کاروائی کا خاص کر مکۂ مکرمہ میں اہتمام نہ فرمایا اور نہ اپنے ماننے والوں کو اس کی اجازت مرحمت فرمائی بلکہ ہمیشہ دامنِ صبر خود بھی تھامے رہے اور اپنے ماننے والوں کو بھی اسی کی تلقین فرمائی۔ آپ پر کیے گئے مظالم کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:

گلے میں پھندا ڈال کر کھینچا گیا

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حرمِ کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک سنگ دل کافر عقبہ بن ابی معیط نے آپ کے گلے میں چادر کا پھندہ ڈال کر اس زور سے کھینچا کہ آپ کا دَم گھٹنے لگا۔ یہ منظر دیکھ کر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ دوڑ پڑے، آپ نے عقبہ بن ابی معیط کو دھکا دے کر دفع کیا اور یہ کہا: اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَ قَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ۔ ترجمہ: کیا ایک انسان کو اس وجہ سے مار ڈالتے ہو کہ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے اور بے شک وہ روشن نشانیاں تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے لائے ہیں۔ (صحیح البخاری، جلد اول، ص: ٥٤٤)

قتل کی سازش رچی گئی

سورۂ تبت یدا میں ابولہب اور اس کی بیوی کی مذمت کی گئی ہے۔ یہ دونوں میاں بیوی حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سخت دشمنی اور نفرت کرتے تھے۔ اس سورہ میں ابولہب کی بیوی اُم جمیل اروٰی بنتِ حرب کو "حَمَّالَةَ الْحَطَبِ" کہا گیا ہے، جس کا ترجمہ اکثر مفسرین نے ''ایندھن اٹھانے والی'' کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ دن بھر جنگل میں کانٹے اور خاردار ٹہنیاں چنتی رہتی تھی اور رات کو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے راستے میں پھینک دیتی تھی۔

جب سورۂ تبت یدا نازل ہوئی تو وہ غصے سے بے قابو ہوگئی، اپنے بھائی ابوسفیان کے گھر گئی اور جا کر کہا: اے میرے بہادر بھائی! کیا تمھیں اس بات کا علم نہیں ہوا کہ محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) نے میری ہجو کی ہے۔ وہ کہنے لگے: میں ابھی اس کا بدلہ لے کر آتا ہوں۔ انھوں نے تلوار لی اور تیزی سے گھر سے نکلے لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد تیزی سے بھاگتے ہوئے لوٹ آئے۔ اُم جمیل نے پوچھا: کیا تم اسے قتل کر آئے ہو؟ ابوسفیان نے کہا: اے میری بہن! کیا تم یہ پسند کرتی ہو کہ تمھارے بھائی کا سر کسی اژدہے کے منہ میں ہو۔ اس نے کہا: ہرگز نہیں۔ انھوں نے کہا: جب میں تلوار لے کر ان کے قریب پہنچا تو میں نے دیکھا کہ ایک اژدہا منہ کھولے میری طرف بڑھ رہا ہے اور مجھے نگلنا چاہتا ہے۔ اس کے خوف سے میں پیچھے بھاگ آیا۔ (سیرت ضیاء النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جلد دوم، ص: ۳۰۶)

آپ کی صاحبزادیوں کو طلاق دے دی گئی

کفارِ مکہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔

ابتدائے اسلام میں مومنہ عورتوں کا نکاح مشرکین سے ہونے کی ممانعت نہیں نازل ہوئی تھی، یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی دو صاحبزادیاں حضرت رُقیہ اور اُم کلثوم رضی اللہ تعالیٰ عنہما ابولہب کے دونوں بیٹوں عتبہ اور عُتَیبہ کے عقد میں تھیں لیکن ابھی ان کی رخصتی نہیں ہوئی تھی۔ جب سورۂ لہب نازل ہوئی تو ابولہب نے اپنے دونوں بیٹوں کو بلا کر حکم دیا کہ تم فوراً ان کی لڑکیوں کو طلاق دے دو اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو میرا تمھارا کوئی تعلق باقی نہیں رہے گا۔ اس ظالم کے دونوں بے رحم بیٹوں نے حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قلبِ اقدس کو دکھ اور رنج پہنچانے کے لیے انھیں طلاق دے دی۔

(سیرت ضیاء النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جلد دوم، ص:٣٠٦)

گھر اور دروازے پر نجس چیزیں ڈالی جاتیں

سرورِ کائنات ارواحُنا فداہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ہر طرح سے تکلیف پہنچا کر اظہارِ عداوت کرنا کفار ومشرکین نے اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تھا۔ اس عداوت میں وہ انتہائی گھٹیا قسم کے اِقدامات بھی کر بیٹھتے تھے۔

حضرت ابن اسحاق فرماتے ہیں: جو لوگ نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو گھر پر تکلیف پہنچاتے تھے، وہ یہ ہیں:

(١) ابولہب (٢) حکم بن عاص بن امیہ (٣) عقبہ بن ابی معیط (٤) عدی بن حمرا ثقفی اور (٥) ابن الاصداء ہذلی۔ یہ سب نبیِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پڑوسی تھے، ان میں سے حکم بن عاص کے علاوہ کسی کو ایمان کی دولت نہیں ملی۔

جب نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نماز پڑھتے تو ان میں سے کوئی اونٹنی کی اوجھڑی ان کے اوپر ڈال دیتا۔ جب آپ کے گھر میں کھانا پکتا تو ان میں سے کوئی شخص اوجھڑی لے

کر آپ کے گھر کی ہانڈی میں ڈال دیتا۔ ان کی تکلیف سے بچنے کے لیے سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نماز کے لیے ایک الگ حجرہ بنالیا تھا۔

جب وہ لوگ نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اس انداز سے ایذا پہنچاتے تھے تو آپ باہر نکل کر صرف اتنا فرماتے تھے:

يَا بَنِي عَبْدِ مَنَافٍ، اَيُّ جِوَارٍ هٰذَا؟

ترجمہ: اے بنی عبد مناف! کیا پڑوس کا یہی حق ہے؟

(سیرت ابن ہشام، جلد اول، ص: ۴١٦)

اللہ اکبر! اگر نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لیے دعاے ہلاکت فرما دیتے تو آن کی آن میں سب تباہ ہو جاتے لیکن یہ آپ کی امن پسندی اور رحمت کا تقاضہ تھا کہ آپ نے ان کے مظالم برداشت کیے۔ نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ان کی ایذا رسانیوں کو جب یاد فرماتے تھے تو یہ فرمایا کرتے تھے:

كُنْتُ بَيْنَ شَرِّ جَارَيْنِ اَبِيْ لَهَبٍ وَّعُقْبَةَ بْنِ اَبِيْ مُعَيْطٍ، اِنْ كَانَا لَيَأْتِيَانِ بِالْفُرُوْثِ فَيَطْرَحَانِهَا عَلٰى بَابِيْ۔ (السیرۃ الحلبیۃ، حصہ اول، ص: ۴۴٧)

ترجمہ: میں دو سب سے برے پڑوسیوں کے درمیان تھا، یعنی ابولہب اور عقبہ بن ابی معیط کے درمیان۔ وہ دونوں لید اور گوبرا اکٹھا کر کے لے آتے اور میرے دروازے پر پھینک دیا کرتے۔

چہرۂ اقدس پر تھوکنے کی کوشش کی گئی

نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا عقبہ بن ابی مُعَیط کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا۔ ایک مرتبہ عقبہ ایک سفر سے واپس آیا، تو اس نے قریش کے اَشراف اور معززین کی دعوت کی۔ اسی

موقع پر اس نے نبیِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بھی دعوت کی۔ جب کھانے کا وقت ہوا تو سرکارِ ابد قرار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کھانے سے انکار فرما دیا اور فرمایا کہ جب تک تو کلمۂ شہادت پڑھ کر اسلام میں داخل نہیں ہو جاتا تب تک میں تیرا کھانا نہیں کھاؤں گا۔

اہلِ عرب کے لیے بڑی ناگوار بات تھی کہ ان کے دسترخوان سے کوئی کھانا کھائے بغیر اٹھ کر چلا جائے اور اس کے لیے وہ ہر شرط ماننے کے لیے تیار ہو جایا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے عقبہ نے کلمۂ شہادت پڑھ لیا، تو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانا تناول فرما لیا۔

عقبہ، اُبی بن خلف کا دوست تھا۔ لوگوں نے عقبہ کا یہ واقعہ اُبی بن خلف کو بتایا، اُبی یہ سن کر چراغ پا ہو گیا، وہ عقبہ کے پاس آیا اور کہنے لگا: کیا تو پاگل ہو گیا ہے؟ اس نے کہا: میں پاگل نہیں ہوا ہوں بلکہ معاملہ دراصل یہ ہے کہ انھوں نے یہ شرط لگا دی تھی کہ میں کلمۂ شہادت پڑھوں گا تبھی وہ کھانا کھائیں گے اور مجھے غیرت محسوس ہوئی کہ میرے دسترخوان سے کوئی شخص کھانا کھائے بغیر چلا جائے، اس لیے میں نے بس انھیں دکھانے کے لیے کلمۂ شہادت پڑھا ہے، میرے دل میں اس تعلق سے کوئی شہادت نہیں ہے۔

اُبی نے کہا: اب میں تیرا سامنا کبھی نہیں کروں گا جب تک کہ تو محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کے چہرے پر نہ تھوکے۔ عقبہ نے کہا: ٹھیک ہے میں تیری خوشی کے لیے ضرور ایسا کروں گا۔ عقبہ کی جب نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ملاقات ہوئی تو اس نے آپ کے چہرۂ اقدس پر تھوک دیا۔ حضرت ضحاک فرماتے ہیں:

لَمَّا بَزَقَ عُقْبَةُ لَمْ تَصِلِ الْبَزْقَةُ اِلٰى وَجْهِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَلْ وَصَلَتْ اِلٰى وَجْهِهٖ هُوَ كَشِهَابِ نَارٍ فَاحْتَرَقَ مَكَانَهَا، وَكَانَ اَثَرُ الْحَرْقِ فِيْ وَجْهِهٖ اِلَى الْمَوْتِ۔

ترجمہ: جب عقبہ نے تھوکا تو وہ تھوک رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے چہرۂ اقدس تک نہیں پہنچا بلکہ وہ آگ کا گولا بن کر عقبہ ہی کے چہرے پر جالگا اوراس کے چہرے کا اُتنا حصہ جل گیا جس کا اثر اس کے چہرے پر اس کی موت تک باقی تھا۔

(السیر ۃ الحلبیۃ ،حصہ اول،ص: ۴۴۷)

اس طرح کی کئی نشانیاں ان لوگوں نے دیکھ لی تھیں اور بار بار ان پر واضح ہو چکا تھا کہ رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے دشمنی اور آپ کو تکلیف پہنچانا خود ان کے لیے نقصان دہ ہے، اس کے باوجود وہ سرکشی سے باز نہیں آتے تھے، کیوں کہ عداوتِ رسول ان کے سینوں میں رچ بس گئی تھی۔

ابوجہل کی طرف سے جسمانی اذیتیں

ابولہب کے بارے میں روایتوں میں یہی ہے کہ وہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اپنی زبان سے طعن وتشنیع کر کے غمزدہ کیا کرتا تھا لیکن ابوجہل کی عداوت میں خساست اور کمینگی بھی تھی۔ وہ نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو جسمانی اذیتیں بھی پہنچایا کرتا تھا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں:

قَالَ اَبُوْ جَهْلٍ: لَئِنْ رَاَيْتُ مُحَمَّدًا يُصَلِّيْ عِنْدَ الْكَعْبَةِ لَاَطَأَنَّ عَلٰى عُنُقِهٖ فَبَلَغَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: لَوْ فَعَلَهٗ لَاَخَذَتْهُ الْمَلَائِكَةُ۔ (صحیح البخاری، حصہ ششم،ص: ۱۷۴)

ترجمہ: ابوجہل نے قسم کھا رکھی تھی کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو کعبے کے پاس نماز پڑھتے دیکھے گا تو اپنے پیروں سے (معاذ اللہ) ان کی گردن کچل دے گا۔ نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہ سنا تو فرمایا: اگر وہ ایسا کرنے کا ارادہ کرے گا تو فرشتے ضرور اس کو اس

کے انجام تک پہنچا دیں گے۔

پھر ایسا ہی ہوا، اس نے جب کبھی آقائے کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو کعبۂ مقدسہ کے پاس نماز پڑھنے سے روکنے کی کوشش کی ذلیل ورسوا ہوا۔ اس کی تفصیل حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے یوں بیان فرمائی ہے:

كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيْ فَجَاءَ اَبُوْ جَهْلٍ فَقَالَ: اَلَمْ اَنْهَكَ عَنْ هٰذَا اَلَمْ اَنْهَكَ عَنْ هٰذَا فَانْصَرَفَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَزَبَرَهٗ فَقَالَ اَبُوْ جَهْلٍ: اِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا بِهَا رَجُلٌ اَكْثَرُ نَادِيًا مِّنِّيْ فَاَنْزَلَ اللهُ: فَلْيَدْعُ نَادِيَهٗ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ۔

ترجمہ: نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے کہ ابوجہل آ گیا۔ وہ آپ سے کہنے لگا: کیا میں نے تمھیں اس سے منع نہیں کیا تھا؟ کیا میں نے تمھیں اس سے منع نہیں کیا تھا؟ نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اسے جھڑک دیا۔ اس نے کہا: تمھیں معلوم ہے کہ مکے میں میرے پاس سب سے زیادہ دوست ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیۂ مقدسہ نازل فرمائی: اب پکارے اپنی مجلس کو، ابھی ہم سپاہیوں کو بلاتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں:

وَاللهِ لَوْ دَعَا نَادِيَهٗ لَاَخَذَتْهُ زَبَانِيَةُ اللهِ۔

ترجمہ: خدا کی قسم اگر وہ اپنے دوستوں کو بلاتا تو یقیناً اسے اللہ کے فرشتے تباہ و برباد کر دیتے۔ (الدر المنثور، حصہ ہشتم، ص: ۵۶۴)

روایتوں میں آیا ہے کہ ایک دن آقائے کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے تو وہ نزدیک آیا تاکہ اپنے خبیث ارادے کی تکمیل کرے۔ لیکن قریب آتے ہی اچانک

الٹے پاؤں پیچھے بھاگا اور اپنے ہاتھوں سے اپنا بچاؤ کرنے لگا۔ اس سے پوچھا گیا: یہ تم کیا کر رہے ہو؟ اس نے کہا: میرے اور ان کے درمیان ایک خندق ہے جس میں آگ بھڑک رہی ہے۔ ایک ہولناک منظر ہے اور فرشتے پر مارتے نظر آ رہے ہیں۔ حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر وہ بدبخت میرے قریب آتا تو فرشتے اس پر جھپٹ پڑتے اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے۔ (سیرت ضیاء النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، جلد دوم، ص: ۳۱۰)

مذکورہ واقعے کے ساتھ یہ بھی ذکر کیا گیا کہ پیغمبرِ امن صلّی اللہ علیہ وسلّم کی کس طرح حفاظت ہوتی تھی، یہ اس لیے تا کہ آپ کا تحمل واضح ہو سکے نیز یہ کہ پیغمبرِ امن صلّی اللہ علیہ وسلّم مجبور نہیں تھے بلکہ ہر اذیت ناک معاملے میں آپ کی دعا پر آسمان سے فرشتوں کی فوج نازل ہو سکتی تھی لیکن علی العموم آپ کبھی دعاے عذاب نہیں فرماتے بلکہ تحمل سے کام لیتے۔

تبلیغ کی راہ میں کفارِ مکہ کی رکاوٹ

نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کفار ومشرکین کے مظالم برداشت کرتے ہوئے، ان کی ایذاؤں پر صبر کرتے ہوئے اور ان کی طرف سے دی جانے والی تکلیفوں پر تحمل کرتے ہوئے اپنی تبلیغی سرگرمیاں جاری رکھتے۔ حج کے دوران جب لوگ جمع ہوتے، مکۂ معظّمہ کے اردگرد جب بازار لگتے اور جہاں کہیں بھی لوگوں کا اجتماع ہوتا تو یہ داعیِ برحق دعوتِ حق لیے ہوئے وہاں پہنچ جاتے، لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتے، امنِ دنیا اور نجاتِ آخرت کی دعوت دیتے، مگر ان کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا، وہ انتہائی ظالمانہ اور مایوس کن ہوتا:

حضرت ابوطارق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِسُوْقِ ذِی الْمَجَازِ یُعْرِضُ نَفْسَہٗ عَلٰی قَبَائِلِ الْعَرَبِ یَقُوْلُ: یٰاَیُّہَا النَّاسُ قُوْلُوْا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ تُفْلِحُوْا،

وَخَلْفَهُ رَجُلٌ لَهُ غَدِيرَتَانِ يَرْجُمُهُ بِالْحِجَارَةِ حَتّٰى اَدْمٰى كَعْبَهُ يَقُوْلُ يٰاَيُّهَا النَّاسُ لَا تَسْمَعُوْا مِنْهُ فَاِنَّهُ كَذَّابٌ، فَسَاَلْتُ عَنْهُ فَقِيْلَ اِنَّهُ غُلَامُ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ، فَقُلْتُ وَمَنِ الرَّجُلُ الَّذِيْ يَرْجُمُهُ؟ فَقِيْلَ هُوَ عَمُّهُ عَبْدُ الْعُزّٰى يَعْنِيْ اَبَالَهَبٍ۔ (السیرۃ الحلبیۃ، حصہ دوم، ص:۳)

ترجمہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ذوالمجاز کے بازار میں دیکھا کہ آپ عرب کے قبائل سے فرما رہے تھے: اے لوگو! کہو اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں، کامیابی پا جاؤ گے۔ ان کے پیچھے ایک شخص تھا جس کی دو چوٹیاں تھیں، وہ انھیں پتھروں سے مار رہا تھا یہاں تک کہ ان کے ٹخنے خون آلود ہو گئے تھے۔ وہ لوگوں سے کہتا تھا: اے لوگو! اس کی بات مت سنو، یہ جھوٹا ہے۔ میں نے نبیِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بارے میں پوچھا تو مجھے بتایا گیا کہ وہ عبدالمطلب کے بیٹے ہیں۔ میں نے کہا: ان کے پیچھے جو پتھر مار رہا ہے وہ کون شخص ہے؟ کہا گیا: وہ ان کا چچا عبدالعزّٰی یعنی ابولہب ہے۔

یہی کام ابوجہل بھی انجام دیا کرتا تھا۔ اسے بھی جہاں کہیں موقع ملتا نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچانے اور آپ کی دعوتِ حق کو روکنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑتا تھا۔

کنانہ کے ایک شخص بیان کرتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ذوالمجاز کے باغ میں دیکھا، آپ لوگوں سے فرما رہے تھے: اے لوگو! کلمۂ طیبہ پڑھ لو کامیاب ہو جاؤ گے۔ ایک شخص ان کے پیچھے کھڑے ہو کر ان پر مٹی پھینک رہا تھا، وہ ابوجہل تھا، کہتا تھا:

يٰاَيُّهَا النَّاسُ لَا يَغُرَّنَّكُمْ هٰذَا عَنْ دِيْنِكُمْ فَاِنَّمَا يُرِيْدُ اَنْ تَتْرُكُوْا عِبَادَةَ اللَّاتِ وَالْعُزّٰى۔ (دلائل النبوۃ للبیہقی، حصہ دوم، ص:۱۸٦)

ترجمہ: اے لوگو! یہ تمھیں تمھارے دین سے نہ پھیر دے۔ یہ چاہتا ہے کہ تم لات وعزّیٰ کی عبادت ترک کردو۔

یہ اور اس طرح کے کثیر واقعات ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ تبلیغ ودعوت کے کاموں میں کفار ومشرکین نے پیغمبرِ امن صلّی اللہ علیہ وسلّم کے لیے ہمیشہ رکاوٹیں کھڑی کیں اور بڑے بڑے رخنے ڈالے لیکن آپ نے ہمیشہ تحمل اور امن پسندی کا مظاہرہ فرمایا۔

جب کفارِ قریش کا ظلم انتہا کو پہنچ گیا

ظلم وزیادتی کی بھی ایک حد ہوتی ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ ظلم ناقابلِ برداشت ہوجاتا ہے۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر بھی اہلِ مکہ کا ظلم اسی حد تک پہنچ چکا تھا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے نبیِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اہلِ قریش پر دعاے ضرر فرماتے ہوئے صرف ایک بار دیکھا ہے۔ نبیِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے اور قریش کی ایک جماعت بیٹھی ہوئی تھی۔ وہیں پاس میں اونٹ کی اوجھڑی پڑی ہوئی تھی۔ ان لوگوں نے کہا: اس اوجھڑی کو لے کر اِن کی پیٹھ پر کون ڈالے گا؟ عقبہ بن ابی مُعَیط نے کہا: میں یہ کام کروں گا۔

اس نے اوجھڑی اٹھائی اور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پشتِ مبارک پر ڈال دیا۔ نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سجدہ طویل فرمادیا یہاں تک کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آئیں اور اس اوجھڑی کو آپ کی پیٹھ سے ہٹایا۔ نبیِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَللّٰهُمَّ عَلَيْكَ بِهٰذَا الْمَلَأِ مِنْ قُرَيْشٍ، اَللّٰهُمَّ عَلَيْكَ بِعُتْبَةَ بْنِ رَبِيْعَةَ، اَللّٰهُمَّ عَلَيْكَ بِشَيْبَةَ بْنِ رَبِيْعَةَ اَللّٰهُمَّ عَلَيْكَ بِأَبِي جَهْلِ بْنِ هِشَامٍ،

اَللّٰھُمَّ عَلَیْكَ بِعُقْبَۃَ ابْنِ اَبِیْ مُعَیْطٍ، اَللّٰھُمَّ عَلَیْكَ بِاُبَیِّ بْنِ خَلَفٍ۔

ترجمہ: اے اللہ! اس گروہ کا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے، اے اللہ! عتبہ بن ربیعہ کا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے، اے اللہ! شیبہ بن ربیعہ کا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے، اے اللہ! ابوجہل بن ہشام کا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے، اے اللہ! عقبہ بن ابی مُعَیط کا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے، اے اللہ! اُبی بن خلَف کا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے۔

راویِ حدیث حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں:

فَلَقَدْ رَاَیْتُھُمْ قُتِلُوْا یَوْمَ بَدْرٍ، فَاُلْقُوْا فِیْ بِئْرٍ غَیْرَ اُمَیَّۃَ، اَوْ اُبَیٍّ، فَاِنَّہٗ کَانَ رَجُلًا ضَخْمًا، فَلَمَّا جَرُّوْہُ تَقَطَّعَتْ اَوْصَالُہٗ قَبْلَ اَنْ یُلْقٰی فِی الْبِئْرِ۔

ترجمہ: میں نے انھیں دیکھا کہ سب کے سب روزِ بدر قتل کر دیے گئے اور انھیں ایک کنویں میں ڈال دیا گیا، سوائے اُمیہ بن خلف یا اُبی بن خلف کے کیوں کہ وہ بہت بھاری بھرکم انسان تھا، جب اسے کھینچا گیا تو اس کے جوڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور اسے کنویں میں نہیں ڈالا جا سکا۔ (صحیح البخاری، حصہ چہارم، ص: ۱۰۴)

نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حلیمانہ شان تھی کہ آپ نے ان پر فوری عذاب نازل ہونے کی دعا نہیں فرمائی بلکہ ان کا معاملہ اللہ کے سپرد کیا کہ مولا تو ہی انتقام لینے والا ہے اور بالآخر روزِ بدر وہ سب کے سب ذلیل ورسوا ہوئے۔ اگر آپ نزولِ عذاب کی دعا فرما دیتے تو آن کی آن میں وہ سب عذابِ الٰہی میں مبتلا ہو کر تباہ و برباد ہو جاتے۔

تیس راتوں کی بھوک

مکے والوں کے مظالم کی بنیاد پر سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو مختلف قسم کی اذیتوں کے ساتھ ساتھ بھوک اور پیاس کی تکلیفیں بھی برداشت کرنی پڑتیں، ایک مرتبہ کا ذکر

کرتے ہوئے خود ارشاد فرماتے ہیں:

لَقَدْ اُخِفْتُ فِي اللهِ وَمَا يُخَافُ اَحَدٌ، وَلَقَدْ اُوْذِيْتُ فِي اللهِ وَمَا يُؤْذٰى اَحَدٌ، وَلَقَدْ اَتَتْ عَلَيَّ ثَلَاثُوْنَ مِنْ بَيْنِ يَوْمٍ وَّلَيْلَةٍ وَمَا لِيْ وَلِبِلَالٍ طَعَامٌ يَأْكُلُهٗ ذُوْ كَبِدٍ اِلَّا شَيْءٌ يُوَارِيْهِ اِبْطُ بِلَالٍ۔ (سنن الترمذی، حصہ چہارم، ص:۲۲۶)

ترجمہ: اللہ کی راہ میں مجھے اس قدر ڈرایا گیا کہ کسی اور کو نہیں ڈرایا گیا ہوگا اور اللہ کی راہ میں مجھے اس قدر تکلیف دی گئی کہ کسی اور کو اتنی تکلیف نہیں دی گئی ہوگی۔ مجھ پر تیس راتیں ایسی گزریں کہ میرے اور بلال کے پاس کھانے کے لیے صرف وہ تھوڑی چیزیں تھیں جو بلال اپنی بغل میں دبا کر لائے تھے۔

شِعبِ ابی طالب میں تین سال کی محصوری

دو اونچے اونچے پہاڑوں کے درمیان جو گھاٹی یا تنگ میدان ہوتا ہے اسے عربی میں ''شِعب'' کہتے ہیں۔ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے چچا ابوطالب کو ایک شعب وراثت میں ملی تھی جو کہ ''شِعبِ ابی طالب'' کے نام سے مشہور تھی۔

جب قریش نے دیکھا کہ نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو حلقہ بگوشِ اسلام ہونے والوں کے ذریعے قوت مل رہی ہے اور حضرت عمر اور حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما جیسے جرأت مند اور طاقتور لوگ اسلام میں داخل ہو چکے ہیں، اسی کے ساتھ ساتھ متعدد مسلمانوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کر لی ہے اور وہاں انھیں عزت دی گئی تو قریش نے باہم اس بات پر اتفاق کیا کہ حضور نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو قتل کر دیا جائے۔

جب آپ کے چچا ابوطالب کو یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے بنو ہاشم اور بنو مطلب کو جمع کیا، دونوں قبیلوں نے مل کر اس بات پر اتفاق کیا کہ نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ

وسلم کو شعبِ ابی طالب میں محفوظ کر دیا جائے تاکہ جو لوگ قتل کا ارادہ رکھتے ہیں وہ وہاں تک آسانی سے نہ پہنچ سکیں۔ اس بات پر دونوں قبیلوں کے کفار نے بھی اتفاق کیا، اس لیے کہ دورِ جاہلیت میں یہ رواج تھا کہ جب کوئی قبیلہ کسی کے تعاون کے لیے تیار ہوتا تو ہر ہر فرد کو اس پر اتفاق کرنا ضروری ہوتا۔

جب اہلِ قریش نے یہ دیکھا تو ان لوگوں نے مل کر آپس میں فیصلہ کیا کہ بنو ہاشم اور بنو مطلب کا سوشل بائیکاٹ کر دیا جائے۔ ان لوگوں نے ایک مکتوب تیار کیا جس میں چند دفعات تحریر کیے گئے کہ جب تک بنو ہاشم اور بنو مطلب نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو قتل کرنے کے لیے اُن کے حوالے نہیں کر دیتے ہیں تب تک۔۔۔۔۔

(۱) بنو ہاشم اور بنو مطلب کے ساتھ شادی بیاہ کا کوئی معاملہ نہیں کیا جائے گا۔

(۲) بنو ہاشم اور بنو مطلب کے ساتھ خرید وفروخت کا کوئی معاملہ نہیں کیا جائے گا۔

(۳) بنو ہاشم اور بنو مطلب سے کسی صورت صلح نہیں کی جائے گی۔

یہ صحیفہ منصور بن عکرمہ نے اور ایک روایت کے مطابق بغیض بن عامر نے تحریر کیا، مکتوب لکھنے کے بعد اس کا ہاتھ شل اور بے حس ہو گیا تھا۔ اس مکتوب کو اہلِ قریش نے یکم محرم الحرام کو کعبۂ مقدسہ پر لٹکا دیا۔ اعلانِ نبوت کا یہ ساتواں سال تھا۔

ابولہب کے علاوہ بنو ہاشم اور بنو مطلب کے سارے افراد شعبِ ابی طالب میں محصور ہو گئے اور تین سال تک وہیں پر محصور رہے۔ اس دوران اہلِ مکہ نے ان کا سوشل بائیکاٹ کر دیا تھا، ان تک ضروریات زندگی کی کوئی چیز نہیں پہنچ پا رہی تھی۔ خفیہ طور پر تھوڑا بہت میسر آجاتا تو آجاتا۔ یہ تین سال بڑی تنگیوں اور مصیبتوں کے ساتھ گزرے۔

(المواہب اللدنیۃ بالمنح المحمدیۃ، حصہ اول، ص:۱۴۷)

قید و بند کے یہ ایام نبیِ اکرم حضور رحمتِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے خاندان کے ساتھ کن تنگیوں کے ساتھ گزارے ان کا ذکر بہت تفصیل طلب ہے۔ ان میں سے چند باتیں اجمالاً یہاں بیان کی جارہی ہیں:

☆ بازاروں اور منڈیوں پر پابندی لگادی گئی تھی کہ ان کو کوئی بھی کسی بھی طرح کی کوئی چیز فروخت نہیں کرسکتا ہے۔

☆ باہر سے تجارتی سامان لے کر قافلہ آتا تو ان سے کہا جاتا کہ سامان کا دام دس گنا بڑھا دو اور ان کو بھروسہ دلاتے کہ اگر مسلمانوں نے نہ خریدا تو ہم خرید لیں گے۔

☆ تجارت کا کوئی قافلہ آتا تو بارہا مکے کے تاجر آگے بڑھ کر ان سے پورا سامان خرید لیتے تاکہ مسلمانوں تک کوئی سامان نہ پہنچ سکے۔

☆ بسا اوقات کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں رہ جاتی تو درختوں کے پتے کھا کر بھوک مٹانے تک نوبت پہنچ جاتی۔

☆ بھوک سے بلک بلک کر بچے اس قدر روتے کہ شعب سے دور دور تک ان کے رونے کی آواز سنائی دیتی۔

شِعْبِ ابی طالب میں محصوری کیسے اختتام پذیر ہوئی اس تعلق سے مصنف سیرت ضیاء النبی لکھتے ہیں:

> ''ان مصائب وآلام کے باوجود نہ سرکار دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عزم وحوصلے میں کوئی لچک پیدا ہوئی اور نہ کسی دوسرے ساتھی نے کسی کمزوری کا اظہار کیا۔ رحمت عالم پورے جوش وخروش سے اسلام کی تبلیغ میں مصروف رہتے اور متعدد خفتہ بختوں کے مقدر کو جگاتے رہتے۔ یہ محاصرہ

نبوت کے ساتویں سال ماہ محرم میں شروع ہوا اور تین سال کے طویل عرصے تک بڑی شدّ ومد سے جاری رہا۔ آخر نبوت کے دسویں سال اللہ تعالیٰ نے ایسے اسباب پیدا کر دیے کہ جور وستم کی اس دستاویز کو خود اہل مکہ نے چاک کر دیا اور رحمت عالمیان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنے محصور ساتھیوں سمیت شعب ابی طالب سے نکل کر پھر مکۂ مکرمہ میں رونق افروز ہوئے۔''

(سیرت ضیاء النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جلد دوم، ص: ۳۸۸،۳۸۷)

اپنے قبیلے اور خاندان کے لوگوں سے اس قدر ظلم وزیادتی برداشت کرنے والے رسول، جنھیں تبلیغِ دین کی راہ میں طرح طرح سے ستایا گیا، جنھیں لمحہ لمحہ ذہنی اور جسمانی تکلیف دی گئی، جنھیں تین سالوں تک محصوری کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا گیا، جنھیں اپنا وطن عزیز چھوڑ کر میلوں دور ہجرت کرنے پر مجبور کیا گیا، جب وہ فاتحانہ شان کے ساتھ مکۂ معظّمہ میں دوبارہ داخل ہوتے ہیں اور کسی کہنے والے کی زبان سے سنتے ہیں: **اَلْیَوْمَ یَوْمُ الْمَلْحَمَۃِ**، آج تو بدلہ لینے کا دن ہے۔ تو بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں: **اَلْیَوْمَ یَوْمُ الْمَرْحَمَۃِ**، نہیں نہیں بلکہ آج تو رحم وکرم کرنے کا دن ہے۔

اس لیے کہ انھیں امن ورحمت کا پیغمبر بنا کر بھیجا گیا تھا، وہ دنیا میں رحمت وشفقت کے پھول کھلانے آئے تھے، بدلے کی آگ جلانا کم ظرفوں کا کام ہوتا ہے، ان کا سینہ کشادہ تھا، ان کا دل بڑا تھا، ان کی فطرت میں عفو ودرگزر تھی۔ سب کو معاف کر دیا، سب کو امان دیا، سب کو جینے کا حق دیا اور ساری دنیا کو امن وسکون کا گہوارہ بنا دیا۔

طائف میں سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قدمان مبارک لہولہان ہوئے

پیغمبرِ امن صلی اللہ علیہ وسلم ساری دنیا میں امن وامان کی فضا ہموار کرنے تشریف لائے تھے۔ مکۂ معظّمہ میں سالہا سال تبلیغی سرگرمیاں جاری تھیں مگر خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہورہے تھے۔ لہٰذا آپ نے دائرۂ امن کو وسیع کرنے اور حلقۂ تبلیغ کو دراز کرنے کا ارادہ فرمایا اور طائف کے گمراہ لوگوں کو اللہ کی طرف بلانے نکل پڑے۔

مکۂ معظّمہ سے ایک سو بیس میل کی دوری پر طائف نامی یہ شہر ہے، جہاں اُس زمانے میں قبیلۂ بنوثقیف آباد تھا۔ طائف کا شہر متعدد خصوصیات کا حامل تھا، وہاں کے لوگ زراعت پیشہ تھے، مالی اعتبار سے مضبوط تھے اور علم حاصل کرنے کا ذوق رکھتے تھے۔ سرورِ کائنات تنِ تنہا طائف کی طرف روانہ ہوگئے، بعض حضرات نے لکھا ہے کہ اس سفر میں آپ کے ساتھ آپ کے خادمِ خاص حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تھے۔

طائف پہنچنے کے بعد سرورِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تبلیغ اسلام شروع فرمائی۔ طائف کے سبھی قابلِ ذکر افراد کے پاس تشریف لے جاتے، انھیں اللہ کی وحدانیت پر ایمان لانے کی دعوت دیتے، دین اسلام کے بنیادی عقائد اور اساسی تعلیمات سے آگاہ فرماتے۔ گھر گھر جاکر اسلام کی دعوت دینے کا یہ سلسلہ ایک ماہ تک جاری رہا۔

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو توقع تھی کہ اہلِ طائف کا رویہ اہلِ مکہ کی طرح معاندانہ نہ ہوگا بلکہ وہ دعوتِ اسلام قبول کرنے میں تامل سے کام نہیں لیں گے۔ لیکن یہاں تو حال اور بھی بدتر تھا کہ کسی نے خوش اسلوبی سے جواب دینے کی زحمت تک گوارا نہیں کی۔ ان کے غیر متوقع طرزِ عمل سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے خاطر اقدس پر بڑی گرانی محسوس ہوئی۔ ان لوگوں نے آپ سے کہا: تم ہمارے شہر سے فوراً نکل جاؤ، ہمیں خدشہ ہے کہ تم

ہمارے نوجوانوں کو اپنی باتوں سے بگاڑ دو گے۔

ان لوگوں نے شہر کے اوباشوں کو نبیِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے لگا دیا، وہ جلوس کی شکل میں اکٹھے ہو گئے اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا تعاقب شروع کر دیا۔ یہ لوگ آوازیں کستے ہوئے، پھبتیاں اڑاتے ہوئے، گالیاں دیتے ہوئے اور اپنے بتوں کے نعرے لگاتے ہوئے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے لگ گئے۔ جس راستے سے سرکارِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو گزرنا تھا اس راستے پر طائف کے لوگ صفیں بنا کر بیٹھ گئے اور جب آپ ان کے درمیان سے گزرے تو انھوں نے پتھر برسانے شروع کیے۔ ان ظالموں کی سنگ باری سے سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مبارک قدم زخمی ہو گئے اور خون بہنا شروع ہو گیا۔ ان کی سنگ باری جب شدت اختیار کر لیتی تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم درد کی شدت سے بیٹھ جاتے، وہ ظالم آگے بڑھتے، آپ کو بازوؤں سے پکڑتے اور کھڑا کر دیتے، پھر پتھر برسانا شروع کر دیتے اور ساتھ ہی قہقہے لگاتے۔

اس طرح طائف کے ان بدبخت شہریوں نے اپنے اس معزز و مکرم مہمان کو اپنے یہاں سے نکلنے پر مجبور کیا۔ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب طائف شہر کے باہر پہنچے تو دل ان کے ظالمانہ سلوک سے از حد مغموم تھا، سارا جسم زخموں سے چور چور تھا اور قدمہائے مبارک سے خون بہہ رہا تھا۔ قریب ہی ایک باغیچہ تھا، آپ اس میں جا کر بیٹھ گئے۔

(ملخصًا از سیرت ضیاء النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جلد دوم، ص: ۴۳۹-۴۴۳)

اس باغیچے میں پہنچ کر آپ نے دو رکعت نماز ادا فرمائی، پھر رب کی بارگاہ میں جو دعا فرمائی اسے پڑھ کر اندازہ کیجیے کہ اس قدر ظلم سہنے کے بعد کسی شخص کے دل سے نکلنے والے الفاظ ظالموں کے لیے ہلاکت کا پیغام لے کر آ سکتے تھے مگر اُس پیغمبرِ امن صلی اللہ تعالیٰ علیہ

وسلم نے اپنے رب کی بارگاہ میں جو التجا کی اس کے الفاظ یہ ہیں:

اَللّٰھُمَّ اِلَیْكَ اَشْکُوْ ضَعْفَ قُوَّتِیْ، وَقِلَّةَ حِیْلَتِیْ، وَھَوَانِیْ عَلَی النَّاسِ اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ، اَنْتَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْنَ، اِلٰی مَنْ تَکِلُنِیْ؟ اِلٰی عَدُوٍّ یَتَجَھَّمُنِیْ، اَمْ اِلٰی قَرِیْبٍ مَّلَّکْتَهٗ اَمْرِیْ، اِنْ لَّمْ تَکُنْ غَضْبَانًا عَلَیَّ فَلَا اُبَالِیْ، اِنَّ عَافِیَتَكَ اَوْسَعُ لِیْ، اَعُوْذُ بِنُوْرِ وَجْھِكَ الَّذِیْ اَشْرَقَتْ لَهُ الظُّلُمَاتُ، وَصَلَحَ عَلَیْهِ اَمْرُ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ اَنْ تُنْزِلَ بِیْ غَضَبَكَ، اَوْ تُحِلَّ عَلَیَّ سَخَطَكَ، لَكَ الْعُتْبٰی حَتّٰی تَرْضٰی، لَا قُوَّةَ اِلَّا بِكَ۔ (المعجم الکبیر للطبرانی، حصہ: ۱۳، ص: ۷۳)

ترجمہ: اے اللہ! میں اپنی ناتوانی، قوتِ عمل کی کمی اور لوگوں کی نگاہوں میں اپنی بے بسی کا شکوہ تیری بارگاہ میں کرتا ہوں۔ اے ارحم الراحمین! تو ہی ارحم الراحمین ہے۔ تو مجھے کس کے حوالے کرتا ہے؟ اس دشمن کے حوالے جو میرے ساتھ ترش روئی کے ساتھ پیش آتا ہے یا ایسے قریبی کے حوالے جس کو تو نے میرے معاملے کا مالک بنایا ہے۔ اگر تو مجھ سے ناراض نہیں ہے تو مجھے ان تکلیفوں کی کوئی پروا نہیں ہے۔ یقیناً تیری طرف سے ملنے والی عافیت میرے لیے زیادہ وسعت رکھتی ہے۔ تیری ذات کا نور جس کے سبب سے تاریکیاں روشن ہوگئیں اور دنیا اور آخرت کے کام سنور گئے میں اس کی پناہ چاہتا ہوں اس بات سے کہ تو مجھ پر اپنا غضب نازل فرمائے یا اپنی ناراضگی اتارے۔ میں تیری رضا طلب کرتا رہوں گا یہاں تک کہ تو راضی ہو جائے۔ سبھی طاقت وقوت تیری ہی طرف سے ہے۔

جب نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم طائف سے واپس ہونے لگے اس وقت آپ کی جانب سے رحم وکرم کا ایک عظیم واقعہ پیش آیا۔ قاضی ابوالفضل عیاض بن موسی سبتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ شفا شریف میں تحریر فرماتے ہیں:

وَلَمَّا كَذَّبَهُ قَوْمُهُ اَتَاهُ جِبْرِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَقَالَ لَهُ: اِنَّ اللهَ تَعَالٰى قَدْ سَمِعَ قَوْلَ قَوْمِكَ لَكَ وَمَا رَدُّوْا عَلَيْكَ وَقَدْ اَمَرَ مَلَكَ الْجِبَالِ لِتَاْمُرَهُ بِمَا شِئْتَ فِيْهِمْ. فَنَادَاهُ مَلَكُ الْجِبَالِ، وَسَلَّمَ عَلَيْهِ وَقَالَ: مُرْنِيْ بِمَا شِئْتَ، اِنْ شِئْتَ اَنْ اُطْلِقَ عَلَيْهِمُ الْاَخْشَبَيْنِ، قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: بَلْ اَرْجُوْ اَنْ يُّخْرِجَ اللهُ مِنْ اَصْلَابِهِمْ مَنْ يَعْبُدُ اللهَ وَحْدَهُ وَلَا يُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا۔ (الشفا بتعریف حقوق المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، حصہ اول، ص:۲۵۵)

ترجمہ: جب سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ان کی قوم نے جھٹلا دیا تو جبریل امین علیہ السلام ان کے پاس آئے اور عرض کی: اللہ تبارک وتعالیٰ نے وہ بات سن لی ہے جو آپ کی قوم نے آپ سے کہی ہے اور جو انھوں نے آپ کو جواب دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کے فرشتے کو حکم فرمایا ہے کہ وہ آپ کے حکم کی تعمیل کرے۔ اس وقت پہاڑوں کے فرشتے نے نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں سلام عرض کیا اور کہا: آپ مجھے جو چاہیں حکم فرمائیں۔ آپ چاہیں تو میں دونوں پہاڑوں کو آپس میں ملا دوں جس میں وہ سب کے سب پس کر فنا ہو جائیں۔ نبیِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں نہیں، ایسا کچھ مت کرنا، اس لیے کہ مجھے امید ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کی پشتوں سے ایسے لوگوں کو نکالے گا جو خدائے وحدہٗ لاشریک کی عبادت کریں گے۔

کیا امن پسندی کی کوئی اتنی عظیم مثال پیش کر سکتا ہے؟ طائف والوں نے جس کی دعوت ٹھکرا دی، جس پر سنگ باری کر کے لہولہان کر دیا، جس کا مذاق اڑایا ان پر بھی سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت وشفقت کا یہ عالم ہے کہ اگر ایک اشارہ کر دیتے تو آن کی آن میں وہ تہس نہس ہو جاتے مگر آپ نے انھیں چھوڑ دیا۔

چوتھا باب

حضور ﷺ کی پُرامن مدنی زندگی

مکۂ معظّمہ میں ظلم وستم سہتے ہوئے سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تیرہ سال گزار دیے۔ اس دوران دشمنانِ اسلام نے سیدالانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی دعوت وتبلیغ کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی، انھیں ذہنی وجسمانی اذیتیں پہنچائیں، انھیں جادوگر کہا، انھیں پاگل کہا، ان پر پتھر برسائے، ان کی شبیہ بگاڑنے کی کوشش کی لیکن ہر جگہ انھیں ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جس مشن کو لے کر پیغمبرِ امن صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم چلے تھے وہ مشن آگے ہی بڑھتا گیا اور روز بروز مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ اس پر کفارِ مکہ کو بڑی تشویش ہوئی کہ اگر اسی طرح نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تبلیغ جاری رہی تو وہ دن دور نہیں کہ مکۂ معظّمہ میں زیادہ تعداد مسلمانوں کی ہوگی اور پھر جب ان کا غلبہ ہوجائے گا تو لات وعزّٰی کے پرستاروں کو مکے میں جینا مشکل ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ مکۂ معظّمہ کے باہر دوسرے علاقوں سے بھی وفود کی آمد ہوئی تھی جو اسلام قبول کر کے واپس ہوئے تھے، خاص کر مدینۂ منورہ میں اسلام پہنچ چکا تھا۔ اہلِ مکہ کو یہ بھی خوف ہوا کہ اگر نبیِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مکہ چھوڑ کر کسی دوسرے مقام پر منتقل ہو گئے اور وہاں کے لوگوں کے تعاون سے اہلِ مکہ پر حملہ کر دیا تو ان لوگوں کا کیا ہوگا؟

بالآخر انھوں نے ''دارُالندوہ'' میں ایک عظیم میٹنگ طلب کی جس میں انھوں نے مکۂ معظّمہ کے ہر بااثر شخص کو بلایا۔ اسی میٹنگ میں عرب کے قبیلوں کے بڑے بڑے نامور افراد شریک ہوئے، خصوصیت کے ساتھ ابوسفیان، ابوجہل، عتبہ، جبیر بن مطعم، نضر بن

حارث، ابوالبختری، زمعہ بن اسود، حکیم بن حزام، اُمیہ بن خلف وغیرہم۔ ابلیس بھی ایک شیخ کی شکل میں اس میٹنگ میں شریک ہوا، اس نے اپنے آپ کو شیخِ نجد بتایا تو مکہ والوں نے اسے بھی شریکِ مُشاوَرت کرلیا۔

کسی نے مشورہ دیا کہ انھیں ہاتھ پاؤں باندھ کر کسی تاریک کوٹھری میں بند کر دیا جائے اور ایک سوراخ سے کھانا پینا دیا جائے۔ ابلیس نے کہا: یہ رائے اچھی نہیں ہے۔ ان کے جاں نثاروں کو تم جانتے نہیں ہو، وہ اپنی جانوں پر کھیل کر بھی انھیں رہا کرا لیں گے۔

کسی نے کہا کہ ان کو شہر بدر کر دیا جائے تاکہ ان کی باتیں سننے سے ہمیں نجات مل جائے۔ ابلیس نے کہا: کیا تمھیں پتہ نہیں کہ ان کے کلام میں کتنی تاثیر ہے، وہ اسے جہاں بھی پڑھیں گے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیں گے اور پھر جب وہ ایک طاقت جمع کر لیں گے تو تمھارے سر پر تلوار منڈلانے لگے گی۔

ابوجہل نے کہا: میرے ذہن میں ایک رائے آئی ہے کہ ہر قبیلے کا ایک ایک مشہور بہادر تلوار لے کر اٹھ کھڑا ہو اور سب یکبارگی حملہ کر کے محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کو قتل کر ڈالیں۔ اس تدبیر سے خون کرنے کا جرم تمام قبیلوں کے سر پر رہے گا۔ ظاہر ہے کہ خاندان بنو ہاشم اس خون کا بدلہ لینے کے لیے تمام قبیلوں سے لڑنے کی طاقت نہیں رکھ سکتے، لہٰذا یقیناً وہ خون بہا لینے پر راضی ہو جائیں گے اور ہم لوگ مل جل کر آسانی کے ساتھ خون بہا کی رقم ادا کر دیں گے۔

ابوجہل کی یہ خونی تجویز سن کر شیخ نجدی (ابلیس) مارے خوشی کے اُچھل پڑا اور کہا کہ بے شک یہ تدبیر بالکل درست ہے۔ اس مشورے پر سب نے اتفاق کیا اور اس پر سب لوگ رضامند ہو گئے۔ (ملخصًا از سیرۃ المصطفیٰ، ص:۱۵۶-۱۵۸)

ان کی اس میٹنگ اور اس میں ہونے والی پلاننگ کے بارے میں اللہ رب العزت نے اپنے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو آگاہ فرما دیا۔ ارشادِ خداوندی ہے:

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ؕ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ○ (سورۂ انفال، آیت: ۳۰)

ترجمہ: اور اے محبوب! یاد کرو جب کافر تمھارے ساتھ مکر کرتے تھے کہ تمھیں بند کر لیں یا شہید کر دیں یا نکال دیں اور وہ اپنا سا مکر کرتے تھے اور اللہ اپنی خفیہ تدبیر فرماتا تھا اور اللہ کی خفیہ تدبیر سب سے بہتر۔ (کنزالایمان)

پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ہجرت کا حکم فرمایا اور جس رات کافروں نے آپ کے گھر کا محاصرہ کیا تھا اور آپ کے قتل کا ناپاک ارادہ کیا تھا اسی رات اللہ تعالیٰ نے بحفظ وامان انھیں مکۂ معظّمہ سے نکال دیا۔ آپ مکۂ معظّمہ کو خیرباد کہہ کر مدینۂ منورہ میں جلوہ افروز ہو گئے اور یہاں سے پورے عالم میں امن وامان پھیلانے کا پروگرام بنایا۔

آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عقدِ مواخات سے انصار ومہاجرین کے درمیان امن قائم فرمایا

رفتہ رفتہ تقریباً سبھی مسلمان مدینۂ منورہ کی طرف ہجرت کر گئے۔ چوں کہ مہاجرین اپنا گھر بار، اہل وعیال اور سب کچھ چھوڑ کر تنِ تنہا آئے تھے اس لیے یہاں آنے کے بعد انصارِ مدینہ نے مہاجرینِ مکہ کی ہر اعتبار سے مدد کی، ان کی اچھے انداز میں ضیافت کی اور انھیں کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ لیکن چوں کہ مہاجرین ہمیشہ سے اپنے دست وبازو کی کمائی کھانے کے عادی تھے۔ اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ مہاجرین کے لیے

مستقل ذریعۂ معاش مہیا کرنے کے لیے کوئی انتظام کیا جائے۔ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سبھی انصار و مہاجرین کو جمع فرمایا، ان کے درمیان عقدِ مواخات قائم فرمایا اور انصار و مہاجرین کو بھائی بھائی بنا دیا۔ اس عقد کا اس قدر مثبت اثر ہوا کہ انصار و مہاجرین میں ایک دوسرے کی مدد کا جذبہ موجزن ہو گیا اور مہاجرین کے معاش کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔

کتاب سیرت مصطفیٰ جانِ رحمت میں عقدِ مواخات کی تفصیل اس طرح ہے:

مسجد نبوی کی تعمیر کے بعد ایک دن حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مکان میں انصار و مہاجرین کو جمع فرمایا، اس وقت مہاجرین کی تعداد پینتالیس یا پچاس تھی۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انصار کو مخاطب کر کے فرمایا کہ یہ مہاجرین تمھارے بھائی ہیں۔ پھر مہاجرین و انصار میں سے دو دو شخص کو بلا کر فرماتے گئے کہ ''یہ اور تم بھائی بھائی ہو''۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ارشاد فرماتے ہی یہ رشتۂ اخوت بالکل حقیقی بھائی جیسا رشتہ بن گیا، چنانچہ انصار نے مہاجرین کو ساتھ لے جا کر اپنے گھر کی ایک ایک چیز سامنے لا کر رکھ دی اور کہہ دیا کہ آپ ہمارے بھائی ہیں اس لیے ان سب سامانوں میں آدھا آپ کا اور آدھا ہمارا ہے۔

حد ہو گئی کہ حضرت سعد بن ربیع انصاری جو حضرت عبدالرحمن بن عوف مہاجر کے بھائی قرار پائے تھے، ان کی دو بیویاں تھیں، حضرت سعد بن ربیع انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا کہ میری ایک بیوی جسے آپ پسند کریں میں اس کو طلاق دے دوں اور آپ اس سے نکاح کر لیں۔ (جلد اول، ص: ۸۱۶،۸۱۵)

سیرتِ ضیاء النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ہے:

''اس مؤاخات کا مقصد یہ تھا کہ دونوں ایک دوسرے کی مدد کر سکیں اور مشکلات میں ہاتھ بٹا سکیں تا کہ دلوں میں مزید الفت پیدا ہو۔''

(سیرت ضیاء النبی ﷺ، جلد سوم، ص:۱۷۷)

ایک مقام پر مذکور ہے:

''اس حکیمانہ حکمت عملی سے مسلم جماعت جو مختلف عناصر اور احزاب کا مجموعہ تھی، جن میں تفرقہ اور انتشار کے بیسوں عوامل موجود تھے، مواخات کے اس نظام نے ان سب کو ایک امت میں تبدیل کر دیا جن کا نفع اور نقصان، عزت وذلت، فتح وشکست کو ایک کر دیا گیا اور محبت و پیار کے ایسے رشتے میں پرو دیا گیا ان میں مغایرت کا کوئی جرثومہ تک باقی نہ رہا۔ اس نظام کی برکت سے اجنبیت کی جو دیواریں مہاجرین وانصار میں حائل تھیں وہ پیوند خاک ہو گئیں اور یہ مہاجر بھائیوں پر اپنا سب کچھ نثار کرنے کے لیے بے چین ہو گئے۔ ایثار وقربانی کی ایسی مثالیں قائم کیں کہ دنیا کی کوئی قوم ان کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔'' (ایضاً، ص:۱۸۰)

قیام امن کے لیے پیغمبر رحمت ﷺ کا یہودیوں سے معاہدہ

مدینۂ منورہ میں مسلمانوں کے علاوہ یہودیوں کی ایک طاقتور جمعیت موجود تھی، وہ معاشی لحاظ سے بھی خوش حال تھے اور صاحبِ کتاب ہونے کے باعث علمی طور پر بھی اوس وخزرج پر فوقیت رکھتے تھے۔ یہاں کے معاشرے میں اس وقت تک اتحاد اور یک رنگی پیدا نہیں ہو سکتی تھی جب تک ان یہودیوں کو بھی اپنے ساتھ نہ ملایا جائے۔ اسی کے ساتھ ساتھ

اسلام کے اولین دشمن رؤساے مکہ ابھی تک مسلمانوں کی بیخ کنی کی کوشش میں تھے اور کسی بھی وقت وہ اس چھوٹی سی بستی پر حملہ آور ہو سکتے تھے۔ ان تمام اندرونی اور بیرونی مشکلات سے چھٹکارا پانے کے لیے ایک منشور کی ضرورت تھی اس لیے رحمتِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایک ایسی دستاویز تیار کی جس میں مہاجرین وانصار کے علاوہ یہاں کے یہودیوں کو بھی شامل کیا گیا۔ اس دستاویز کے ذریعے مدینۂ طیبہ کے جملہ باشندوں کا بلا امتیاز مذہب وقومیت اندرونی و بیرونی خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک اتحادِ عمل میں لایا گیا۔

(سیرت ضیاء النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جلد سوم، ص: ۱۸۵)

وہ دستاویز جن دفعات پر مشتمل تھی ان پر غور کریں تو ہر ہر جملے سے یہ بات واضح ہوگی کہ سرکارِ ابدقرار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے امن وامان کی فضا ہموار کرنے اور دنیا سے شر وفساد کے خاتمے کی کس قدر جدوجہد فرمائی ہے۔ اس دستاویز کے دفعات ذکر کیے جاتے ہیں:

(۱) یہ تحریر دستاویز ہے اللہ کے نبی محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کی قریش، یثرب کے اہل ایمان اور ان لوگوں کے باب میں جو ان کے ساتھ شامل ہوں اور ان کے ہمراہ جنگ میں حصہ لیں۔

(۲) یہ (تمام گروہ) دنیا کے (دوسرے) لوگوں سے ممتاز وممیز ایک علیحدہ (سیاسی) وحدت متصور ہوں گے۔

(۳) مہاجرین جو قریش میں سے ہیں علیٰ حالہ دیتوں اور خوں بہا وغیرہ کے معاملات میں اپنے قبیلے کے طے شدہ رواج پر عمل کریں گے، اپنے قیدیوں کو مناسب فدیہ دے کر چھڑائیں گے اور دوسرے مسلمانوں کے ساتھ عدل وانصاف کریں گے۔

(۴) بنو عوف بھی اپنی جگہوں پر قائم رہیں گے اور خوں بہا وغیرہ کا طریقہ ان میں حسبِ

سابق قائم رہے گا، ہر گروہ عدل وانصاف کے تقاضوں کوملحوظ رکھتے ہوئے اپنے قیدیوں کوفدیہ دے کر چھڑائے گا۔

(۵) بنو حارث بھی اپنی جگہوں پر قائم رہیں گے اور خوں بہا کا طریقہ ان میں حسب دستور سابق رہے گا، ہر گروہ عدل وانصاف کے تقاضوں کوملحوظ رکھتے ہوئے اپنے قیدی کوفدیہ دے کر چھڑائے گا۔ اسی طرح بنو ساعدہ، بنو جشم، بنو نجار، بنو عمرو بن عوف، بنو البنیت اور بنو الاوس بھی اپنی جگہوں پر قائم رہیں گے، ان میں خون بہا کا جو طریقہ رائج ہے حسبِ دستور وہی باقی رہے گا، ہر گروہ عدل وانصاف کے تقاضوں کوملحوظ رکھتے ہوئے اپنے قیدیوں کوفدیہ دے کر چھڑائے گا۔

(۶) اہل ایمان اپنے کسی زیر بار قرض دار کو بے یار ومددگار نہیں چھوڑیں گے بلکہ قاعدے کے مطابق فدیہ، دیت اور تاوان ادا کرنے میں اس کی مدد کریں گے۔

(۷) کسی مومن کے آزاد کردہ غلام کو کوئی مومن حلیف نہ بنائے گا۔

(۸) تمام تقویٰ شعار مومنین متحد ہو کر ہر اس شخص کی مخالفت کریں گے جو سرکشی کرے، ظلم، گناہ اور تعدی کے ہتھکنڈوں سے کام لے اور ایمان والوں کے درمیان فساد پھیلائے۔ ایسے شخص کی مخالفت میں ایمان والوں کے ہاتھ ایک ساتھ اٹھیں گے، اگرچہ وہ ان میں سے کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

(۹) کوئی مومن کسی دوسرے مومن کو کافر کے عوض قتل نہیں کرے گا اور نہ مومن کے خلاف وہ کسی کافر کی مدد کرے گا۔

(۱۰) اللہ کا ذمہ اور پناہ سب کے لیے یکساں ہے، ادنیٰ ترین مسلمان بھی کافر کو پناہ دے سکتا ہے، اہلِ ایمان دوسرے لوگوں کے مقابلے میں باہم بھائی اور مددگار

وکارساز ہیں۔

(۱۱) یہودیوں میں سے جو بھی ہمارا اتباع کرے گا، تو اسے مدد اور مساوات حاصل ہوگی، ان یہود پر نہ تو ظلم کیا جائے گا اور نہ ہی ان کے خلاف کسی دشمن کی مدد کی جائے گی۔

(۱۲) تمام اہلِ ایمان کی صلح یکساں اور برابر کی حیثیت رکھتی ہے، کوئی مومن قتال فی سبیل اللہ میں دوسرے مومن کو چھوڑ کر دشمن سے صلح نہیں کرے گا اور اسے مسلمانوں کے درمیان عدل و مساوات کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔

(۱۳) جو لشکر ہمارے ساتھ جہاد میں شریک ہوگا اس کے افراد آپس میں باری باری ایک دوسرے کی جانشینی کریں گے۔

(۱۴) اہلِ ایمان کفار سے انتقام لینے میں ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔

(۱۵) تمام تقویٰ شعار مسلمان اسلام کے احسن او راقوم طریق پر ثابت قدم رہیں گے۔

(۱۶) مدینے کا کوئی مشرک قریش کے کسی شخص کو مالی یا جانی کسی طرح کی پناہ نہ دے گا اور نہ مسلمان کے مقابلے پر اس (قریشی) کی حمایت و مدد کرے گا۔

(۱۷) جو شخص ناحق کسی مومن کا خون کرے گا، اسے مقتول کے عوض بطور قصاص قتل کیا جائے گا، مگر یہ کہ اس مقتول کا ولی اس کے عوض خون بہا لینے پر رضا مند ہو جائے اور تمام اہلِ ایمان قاتل کے خلاف رہیں گے۔

(۱۸) کسی ایمان والے کے لیے جو دستور العمل کے مندرجات کی تعمیل کا اقرار کر چکا ہے اور اللہ اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتا ہے، یہ ہرگز جائز نہ ہوگا کہ وہ کوئی نئی بات نکال کر فتنہ انگیزی کے ذمے دار کی حمایت کرے یا اسے پناہ دے۔ جو ایسے کسی

(مجرم) کی حمایت ونصرت کرے گا یا اسے پناہ دے گا تو وہ قیامت کے دن اللہ کی لعنت اور اس کے غضب کا مُستوَجِب ٹھہرے گا اور جہاں اس کی نہ تو توبہ قبول کی جائے گی، نہ کوئی فدیہ لیا جائے گا۔

(۱۹) جب مسلمانوں میں کسی قسم کا تنازعہ ہوگا تو اسے اللہ اور اس کے رسول محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

(۲۰) جب تک جنگ رہے یہودی اس وقت تک مومنین کے ساتھ مل کر مَصَارِف (خرچ) اٹھائیں گے۔

(۲۱) یہود بنی عوف اور ان کے حُلَفَا ومَوَالِی سب مل کر مسلمانوں کے ساتھ ایک جماعت متصور ہوں گے۔ یہودی اپنے دین پر رہنے کے مجاز ہوں گے اور مومن اپنے دین پر کاربند رہیں گے۔ البتہ جس نے ظلم یا عہد شکنی کا ارتکاب کیا تو وہ محض اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو مصیبت میں ڈالے گا۔ اسی طرح یہود بنی نجار، یہود بنی حارث یہود بنی ساعدہ، یہود بنی جشم، یہود بنی الاوس، یہود بنی ثعلبہ، بنی جفنہ، بنی الشطیبہ، موالی ثعلبہ اور یہودی قبائل کی ذیلی شاخوں کو وہی کچھ حقوق ومراعات ہیں جو بنی عوف کے یہودیوں کے لیے ہیں، ہر ایک پر اس دستاویز کی وفا شعاری لازم ہے، نہ کہ عہد شکنی۔ البتہ جو ظلم اور عہد شکنی کا مرتکب ہو تو خود اس کی ذات اور اس کے گھرانے کے سوا کوئی دوسرا مصیبت میں نہیں پڑے گا۔ مزید یہ کہ ان قبائل میں سے کوئی فرد حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر نہیں نکلے گا۔

(۲۲) کسی مار یا زخم کا بدلہ لینے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی اور ان میں جو فرد یا جماعت قتل ناحق یا خوں ریزی کا ارتکاب کرے تو اس کا وبال اور ذمے داری اس

کی ذات اور اس کے اہل وعیال پر ہوگی ورنہ ظلم ہوگا اور اللہ اس کے ساتھ ہے جو اس سے بری الذمہ ہے۔

(۲۳) یہودیوں پر ان کے مصارف واخراجات کا بار ہوگا اور مسلمانوں پر ان کے مصارف کا۔

(۲۴) اس صحیفے والوں کے خلاف جو بھی جنگ کرے تو تمام فریق (یہودی اور مسلمان) ایک دوسرے کی مدد کریں گے نیز خلوص کے ساتھ ایک دوسرے کی خیر خواہی کریں گے اور ان کا شیوہ وفاداری ہوگا نہ کہ عہد شکنی اور ہر مظلوم کی بہر حال حمایت ومدد کی جائے گی۔

(۲۵) اس صحیفے والوں کے لیے حدودِ یثرب (مدینہ شریف) کا داخلی علاقہ حرم کی حیثیت رکھے گا۔

(۲۶) پناہ گزیں، پناہ دہندہ کی مانند ہے، نہ کوئی اس کو ضرر پہنچائے گا اور نہ وہ خود عہد شکنی کر کے گنہگار بنے۔

(۲۷) کسی پناہ گاہ میں وہاں والوں کی اجازت کے بغیر کسی کو پناہ نہیں دی جائے گی۔

(۲۸) اس صحیفے کے ماننے والوں میں اگر کوئی نئی بات پیدا ہو (جس کا ذکر اس دستاویز میں نہیں) یا کوئی اور جھگڑا جس سے کسی نقصان اور فساد کا اندیشہ ہو تو اس متنازع فیہ امر میں فیصلے کے لیے اللہ اور اس کے رسول محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ اللہ کی تائید اس شخص کے ساتھ ہے جو اس صحیفے کے مندرجات کی زیادہ سے زیادہ احتیاط اور وفا شعاری کے ساتھ تعمیل کرے۔

(۲۹) قریش مکہ اور اس کے حامیوں کو کوئی پناہ نہیں دی جائے گی۔

(۳۰) یثرب (مدینہ طیبہ) پر جو بھی حملہ آور ہو تو اس کے مقابلے میں یہ سب (یہودی اور مسلمان) ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔

(۳۱) ان مسلمانوں میں جو اپنے حلیف کے ساتھ صلح کرنے کے لیے یہود کو دعوت دے تو یہود اس سے صلح کرلیں گے۔ اسی طرح اگر وہ (یہود) کسی ایسی صلح کی دعوت دیں تو مومنین بھی اس دعوت کو قبول کرلیں گے، مگر یہ کہ کوئی دین ومذہب کے لیے جنگ کرے۔

(۳۲) تمام لوگ اپنی اپنی جانب کے علاقے کی مدافعت کے ذمے دار ہوں گے۔

(۳۳) یہ نوشتہ کسی ظالم یا مجرم کو اس کے جرم کے عواقب سے بچانے کے لیے آڑے نہ آئے گا، جو جنگ کے لیے نکلے یا کسی اور جگہ نقل مکانی کرے وہ بھی اور جو گھر (مدینے) میں بیٹھا رہے وہ بھی امن کا حقدار ہوگا، اس پر کوئی مواخذہ نہیں، البتہ صرف وہ لوگ مستثنیٰ ہوں گے جو ظلم یا جرم کے مرتکب ہوں اور جو اس نوشتے کی وفا شعاری اور احتیاط سے تعمیل کرے گا تو اللہ اور اس کے رسول محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی اس کے نگہبان اور خیر اندیش ہیں۔

(سیرت مصطفیٰ جانِ رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جلد اول، ص: ۸۰۹ تا ۸۱۴)

ان دفعات کو اور خاص طور پر خط کشیدہ سطور کو بار بار پڑھیں اور اندازہ کریں کہ اس وقت جو مدینۂ منورہ کے حالات تھے ایسے ماحول میں امن وامان کے قیام کے لیے کن کن باتوں کی ضرورت تھی ان سب کا ذکر ان دفعات میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ اس دستاویز کی جامعیت دیکھیں کہ ہر اس چھوٹی سی چھوٹی بات کا خیال کیا گیا ہے جو امن وسکون غارت کرنے اور شر وفساد کو ہوا دینے میں اثر انداز ہو سکتی تھیں۔

مصنف ''سیرت مصطفیٰ جانِ رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' مذکورہ منشور ذکر کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

''اس منشور کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ نہ تو کسی شخص اور قبیلے کے حق کو غصب کیا گیا ہے اور نہ کسی پر مذہبی عقیدے میں کوئی جبر کیا گیا ہے، نہ ان کے معاشرے میں رواج پذیر رسوم ورواج کو چھیڑا گیا ہے اور نہ ان کے نجی معاملات میں کسی قسم کی مداخلت بے جا کی گئی ہے۔ مدینے کے لوگ جو مدتِ دراز سے جنگ کی بھٹی میں جل رہے تھے ان کو باہمی امن وصلح کی ضمانت دی جا رہی ہے اسی لیے تمام اہلِ یثرب نے قبائلی اور مذہبی اختلافات کے باوجود اس منشور کو صدق دل سے قبول کرلیا۔

اس منشور سے پہلے عرب حد درجہ انفرادیت کا شکار تھے وہ نہ کسی قانون کے پابند تھے اور نہ کسی قوتِ حاکمہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے عادی تھے۔ ان میں سے اگر کوئی قتل ہو جاتا تو اس کا انتقام لینا ان کی اپنی قوت بازو پر منحصر تھا۔ وہ اپنی حق تلفی کا مداوا اپنے زور سے کیا کرتے تھے۔ وہاں کوئی ایسی اجتماعی قوت نہ تھی جو ان کی جان و مال اور عزت وآبرو کی حفاظت کی ضمانت دے۔ لیکن اس منشور میں ان ساری انفرادیتوں کو زندہ درگور کر دیا گیا اور اس نے نئے معاشرے میں ایک ایسی مرکزی قیادت قائم کر دی جس کی طرف ہر موقع پر رجوع کر سکتے تھے جب ان کی جان و مال اور آبرو پر کوئی دست درازی کرتا۔ وہ اصولِ انفرادیت جو اسلام سے قبل عرب کی معاشرت کا طرۂ امتیاز تھا اس نوشتے کے ذریعے اجتماعیت سے بدل دیا گیا۔ یوں طوائف الملوکی کا بھی خاتمہ

ہو گیا اور نسلی و مذہبی لحاظ سے منتشر افراد ایک لڑی میں پرو دیے گئے اور تمام باشندوں کو یکساں حقوق میسر آ گئے۔'' (جلد اول،ص: ۸۱۴،۸۱۵)

قیدیوں کے ساتھ پیغمبر امن صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا رحیمانہ سلوک

بدر کی لڑائی کفار اور مسلمانوں کے درمیان فیصلہ کن لڑائی تھی۔ اُدھر ایک ہزار کا لشکر تھا، اِدھر صرف تین سو تیرہ سپاہی تھے۔ اُدھر جنگ آزمودہ پہلوان تھے، اِدھر نہتے مسلمان تھے۔ البتہ انھیں اپنے ظاہری اسباب اور جنگی ساز وسامان پر ناز تھا لیکن اِنھیں اللہ تبارک وتعالیٰ کی نصرت واعانت اور نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذات پر بھروسہ تھا۔ بالآخر مسلمانوں کو جنگ میں فتح حاصل ہوئی۔ دشمنوں کی کثیر تعداد، خصوصًا ان کے کئی سردار قتل کیے گئے اور ستّر لوگ قید کر لیے گئے۔

سیرتِ ضیاء النبی میں ہے:

جنگ کے بعد مسلمانوں کے لیے سب سے اہم مسئلہ یہ پیش آیا کہ ان قیدیوں کے ساتھ کیا کیا جائے؟ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے مشورہ کیا تو صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ رائے پیش کی کہ اُنھیں فدیہ لے کر آزاد کر دیا جائے اس لیے کہ فدیے سے جو سرمایہ اکٹھا ہوگا اس سے مسلمانوں کو قوت ملے گی۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ مشورہ دیا کہ ہر قیدی کو اس کے مسلمان رشتے دار کے حوالے کیا جائے اور مسلمان اپنے ہاتھوں سے اپنے کافر رشتے دار کو قتل کریں۔

حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے یہ تجویز پیش کی کہ آگ جلا کر بھڑکتے ہوئے شعلوں میں ان سبھی قیدیوں کو ڈال دیا جائے تاکہ جل کر خاکستر ہو جائیں۔

نبیِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی

رائے کو پسند فرمایا اور اس تجویز پر عمل کرنے سے اسلام کو خیر عظیم میسر آئی۔ ان قیدیوں میں سے بہت سے مشرف با سلام ہوئے، ان کی نسلوں سے بڑے بڑے جلیل القدر اشخاص پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے گلشن اسلام کو سدا بہار کر دیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ فدیے کی رقم سے مسلمانوں کو بڑی مالی تقویت پہنچی۔

(ملتقطاً از سیرت ضیاء النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، جلد سوم، ص: ۳۸۵ تا ۳۸۷)

قیدیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید

زمانۂ جاہلیت میں قیدی بے دست و پا ہوا کرتے، انھیں کوئی رعایت حاصل نہ ہوتی، ان کے ساتھ کسی قسم کی خیر خواہی روا نہیں سمجھی جاتی، ہر طرح کی بدتمیزی ان کے ساتھ روزانہ کا معمول تھی۔

جنگ بدر میں جب مسلمانوں کے حصے میں کچھ قیدی آئے تو سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان قیدیوں کے ساتھ صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو حسنِ سلوک پر آمادہ فرمایا اور قیدیوں کے تئیں خیر خواہی کی تلقین کی۔ (المعجم الکبیر للطبرانی، ص: ۴۰۹)

آقائے کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ بدر کے قیدیوں سے متعلق فرمایا: قیدیوں کا اِکرام کرو، اس حکم پر عمل کرتے ہوئے صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین قیدیوں کو کھانا کھلانے میں اپنی ذات پر مقدم رکھتے تھے۔ (تفسیر ابن کثیر، حصہ ہشتم، ص: ۲۹۵)

حضرت ابوسعید انصاری رضی اللہ عنہ جب بحرین سے فتح مند ہو کر واپس آئے تو آپ کے ساتھ بہت سے قیدی تھے۔ ان سبھوں کو صف بستہ کھڑا کر دیا گیا۔ نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ان میں سے ایک عورت رو رہی ہے۔ آپ نے پوچھا: کیوں رو رہی ہو؟ اس نے کہا: میرا بیٹا بنو عبس میں بیچ دیا گیا ہے۔ نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے

حضرت ابواُسید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فوراً حکم فرمایا کہ جاؤ اور اس بچے کو واپس لے آؤ۔ وہ گئے اور اس بچے کو واپس لے کر آئے۔ (مستدرک، حصہ سوم، ص:۵۹۱)

وہ عورت قیدی تھی، نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کے ساتھ بھی احسان فرمایا کہ اس کے بچے کو اس سے جدا نہ ہونے دیا۔ فوراً حکم فرمایا کہ اس بچے کو جا کر واپس لایا جائے اور اس عورت کے حوالے کیا جائے۔

بدر کے ایک قیدی ابوعزیز کا بیان

جنگ بدر کے قیدیوں میں سے ابوعزیز بھی تھے، ان کا نام زُرارہ تھا، نضر بن حارث کے جہنم رسید ہونے کے بعد یہ مشرکین کے علم بردار بنے تھے، بعد میں یہ مشرف باسلام ہوئے اور ان کا شمار صحابہ میں ہوا۔ صحابۂ کرام نے زمانۂ اسیری میں اسیرانِ بدر کے ساتھ جو سلوک کیا اس کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

كُنْتُ فِي رَهْطٍ مِنَ الْاَنْصَارِ حِيْنَ اَقْبَلُوْا بِيْ مِنْ بَدْرٍ، فَكَانُوْا اِذَا قَدَّمُوْا غَدَاءَهُمْ وَعَشَاءَهُمْ خَصُّوْنِي بِالْخُبْزِ وَاَكَلُوْا التَّمْرَ لِوَصِيَّةِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِيَّاهُمْ بِنَا، مَا تَقَعُ فِي يَدِ رَجُلٍ مِّنْهُمْ كِسْرَةُ خُبْزٍ اِلَّا نَفَحَنِيْ بِهَا فَاَسْتَحْيِيْ فَاَرُدُّهَا فَيَرُدُّهَا عَلَيَّ مَا يَمَسُّهَا۔ (سیرت ابن کثیر، حصہ دوم، ص:۴۷۵)

ترجمہ: بدر سے قید کر کے لانے کے بعد مجھے انصار کے ایک گروہ کے ساتھ رکھا گیا، وہ خود تو کھجوروں پر اکتفا کر لیتے تھے لیکن جب مجھے کھانا پیش کرتے تو روٹیوں کا انتظام کرتے، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انھیں ہمارے تعلق سے تاکید فرمائی تھی۔ جب بھی ان میں سے کسی شخص کے پاس روٹیوں کا انتظام ہوتا وہ میرے لیے حاضر

کرتا، مجھے لینے میں شرم آتی، میں واپس دے دیتا لیکن وہ شخص اسے چھوتا بھی نہیں بلکہ وہ واپس مجھے دے کر چلا جاتا۔

جھنڈا تو وہی شخص تھامتا ہے جو مخالف سے سخت متنفر ہو، خود بہادر ہو اور اپنے مخالف کو نیست و نابود کر دینے کا عزم بھی رکھتا ہو۔ غور طلب امر یہ ہے کہ ایسے مخالف کے ساتھ بھی پیغمبرِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو انسانی اصولوں کے تقاضے کے مطابق رحم و کرم کا پہلو اپنانے کی خاص تلقین کی ہے۔

قیدیوں کے لیے لباس کا انتظام

لباس انسان کی اہم ضرورت ہے، جسے زیب تن کر کے انسان ستر پوشی کرتا ہے اور لباس سے حسن و جمال کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ عموماً ہر جگہ کا یہ ماحول ہے کہ قیدیوں کو ایسے لباس پہنائے جاتے ہیں جن سے ان کی توہین اور ہتک ہوتی ہے، لباس کی ساخت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ غریب سے غریب تر انسان بھی قید خانے کے باہر اس طرح کا لباس استعمال کرنا پسند نہیں کرتا۔ قربان جایئے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی پر جنھوں نے قیدیوں کی بھی عزتِ نفس کا لحاظ کیا اور ان کے لیے بھی عمدہ لباس کا انتظام فرمایا۔

امام بیہقی علیہ الرحمہ رقم طراز ہیں:

جب ہوازِن کے قیدی آئے تو ان کے لیے سرکارِ کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے عمدہ کپڑے خریدنے کا حکم فرمایا، پھر ان کپڑوں کو قیدیوں کو زیب تن کروایا۔

(دلائل النبوۃ للبیہقی، حصہ پنجم، ص: ۲۶۴)

کپڑوں کی عمدگی کا اندازہ اس سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ جب کوئی قیدی آزاد ہو کر نکلتا تو اسی لباس کو زیب تن کرتا۔

اسی طرح حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان فرماتے ہیں:

لَمَّا كَانَ يَوْمَ بَدْرٍ أُتِيَ بِأُسَارٰى، وَأُتِيَ بِالْعَبَّاسِ وَلَمْ يَكُنْ عَلَيْهِ ثَوْبٌ، فَنَظَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَهُ قَمِيْصًا، فَوَجَدُوْا قَمِيْصَ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ أُبَيٍّ يَقْدُرُ عَلَيْهِ، فَكَسَاهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِيَّاهُ۔

(صحیح البخاری، حصہ چہارم، ص:۶۰)

ترجمہ: بدر کے دن جب قیدی پکڑ کر لائے گئے، ان میں حضرت عباس بھی تھے، ان کے بدن پر مناسب لباس نہیں تھا۔ نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کے لیے کپڑا تلاش کیا تو صرف عبداللہ بن اُبی کی قمیص ان کے ناپ کی تھی۔ نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انھیں وہ قمیص پہنایا۔

عبداللہ بن اُبی منافق تھا لیکن مسلمانوں کے ساتھ مل کر اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتا تھا۔ حضرت عباس کو جو عبداللہ بن اُبی نے قمیص دی تھی جب عبداللہ بن اُبی کا انتقال ہوا تو نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اسی کا قرض اُتارنے کے لیے اپنی قمیص اسے پہنانے کا حکم فرمایا تھا۔ (ایضًا)

قیدیوں کے لیے مناسب رہائش کا انتظام

عمومًا قیدیوں کے لیے رہنے سہنے کا انتظام بالکل الگ تھلگ کیا جاتا ہے کہ ان سے عوامی رابطہ اور تعلق بالکل منقطع ہوجائے۔ اس وجہ سے وہ قیدی وحشت محسوس کرتا ہے اور پژمردگی کا شکار ہوجاتا ہے۔

نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اسیرانِ بدر کے لیے دو جگہوں کا انتخاب فرمایا۔ بعض کو صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے ساتھ ان کے گھروں میں رہنے دیا اور حکم

فرمایا کہ ان کے ساتھ حسنِ سلوک کیا جائے اور بعض کو مسجد نبوی میں رکھنے کا حکم فرمایا۔

گھر میں رہنے کے تعلق سے ابوعزیز کے بارے میں پیچھے روایت گزر چکی ہے۔ مسجد میں رکھنے کے متعلق حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس روایت سے اشارہ ملتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نجد کی طرف ایک لشکر بھیجا، جب لشکر واپس آیا تو قیدیوں میں ثُمامہ بن اُثال نامی ایک شخص تھا، اسے نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مسجد کے ایک ستون سے باندھنے کا حکم فرمایا۔ پھر بعد میں نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ ثُمامہ کو کھول دو۔ کھلنے کے بعد وہ مسجد سے قریب ایک کھجور کے درخت کے پاس گیا، غسل کیا، پھر مسجد میں داخل ہوا اور کلمۂ شہادت پڑھ کر اسلام میں داخل ہو گیا۔ (صحیح البخاری، حصہ اول، ص:۹۹)

نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس قیدی کو مسجد میں باندھنے کا حکم اس لیے دیا کہ قیدی مسجد میں رہ کر مسلمانوں کے اعمال و اخلاق دیکھے گا اور متاثر ہو کر اسلام قبول کر لے گا۔

حنین کے قیدیوں کی رہائی

حنین مکہ اور طائف کے درمیان ایک مقام کا نام ہے۔ فتحِ مکہ کے بعد اسلام کی حقانیت کا یقین ہر کسی کو ہو گیا اس لیے کہ ان کا اعتقاد تھا کہ کعبۂ مقدسہ کو جو بھی فتح کرے گا وہ حق پر ہوگا۔ البتہ مقام حُنین میں دو قبیلے بنوثقیف اور بنوہوازِن آباد تھے جن پر فتحِ مکہ کا اُلٹا اثر پڑا۔ درحقیقت وہ اپنے آپ کو جنگ آزمودہ اور بہت بہادر سمجھتے تھے۔ ان لوگوں نے سوچا کہ فتحِ مکہ کے بعد اب ان کی باری بھی آسکتی ہے اس لیے ان لوگوں نے نبیِ کریم صلی

اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے جنگ کی تیاری شروع کر دی۔ نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو حالات معلوم کرنے کے لیے بھیجا تو پتہ چلا کہ ان لوگوں نے جنگ کی بہت زبردست تیاری کی ہے اور میدانِ جنگ میں اپنی عورتوں اور بچوں تک کو لے کر آنے والے ہیں تا کہ میدانِ جنگ سے کوئی بھاگ نہ سکے۔

نبیِ اکرم نورمجسم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بھی بارہ ہزار کالشکر جمع فرمایا، پہلے مرحلے میں تو کفار کا حملہ بڑا سخت تھا لیکن پھر نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی آواز پر انصار ومہاجرین نے جم کر جنگ کی اور بنوثقیف کے جوان جو تیراندازی میں بڑے ماہر تھے اور بالکل قدم جما کرلڑ رہے تھے، ان میں سے ستر قتل ہو گئے۔ جب ان کا سردار مارا گیا تو پھر وہ شکست کھا کر بھاگے۔ مسلمانوں کو فتح مبین میسر آئی، کثیر تعداد میں مالِ غنیمت ہاتھ لگا اور کثیر تعداد میں قیدی مسلمانوں کے قبضے میں آئے۔

حُنین سے بھاگنے والے کفار میں سے بعض اوطاس گھاٹی میں جا کر چھپ گئے اور بعض طائف کی طرف بھاگ نکلے تا کہ طائف کے مضبوط قلعے میں پناہ لیں۔ نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بھیجے ہوئے ایک فوجی دستے نے اوطاس میں چھپے کافروں کوشکست دی اور آپ نے طائف کا بھی محاصرہ کرنے کا حکم فرمایا۔

طائف کا آپ نے اٹھارہ دن محاصرہ فرمایا، دونوں طرف سے تیروں سے کاروائیاں ہوئیں لیکن طائف کا قلعہ فتح نہیں ہوا۔ پھر آپ نے ماہرین جنگ سے مشورہ کرنے کے بعد محاصرہ اٹھانے کا حکم فرمایا۔

(ملتقطاً از شرح الزرقانی علی المواہب، جلد سوم، ص:۴۹۶ تا ۵۳۰)

جنگ حُنین کے اموالِ غنیمت میں چوبیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار سے زائد

بکریاں، کئی من چاندی اور چھ ہزار قیدی تھے۔قیدیوں کے تعلق سے حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کے رشتے داروں کے آنے کا انتظار فرمایا۔کئی دن کے انتظار کے بعد بھی جب کوئی نہیں آیا تو آپ نے مالِ غنیمت کے تقسیم کا حکم فرمایا۔ پھر ہوازن کا وفد مسلمان ہوکر نبیِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان لوگوں نے گزارش کی کہ ان کے اموال اور قیدیوں کو چھوڑ دیا جائے۔

نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے تم لوگوں کا دس دن سے زیادہ انتظار کیا، پھر جب ایسا لگا کہ کوئی آنے والا نہیں ہے تو اموال اور قیدی تقسیم کر دیے گئے ہیں۔ اب ایک ہی صورت ہے کہ مجاہدین سے یا تو اموال واپس مل سکتے ہیں یا پھر قیدی۔ان لوگوں نے عرض کی کہ ہمیں ہمارے رشتے دار واپس مل جائیں ہم اس پر راضی ہیں۔ نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سبھی حضرات کو جمع فرمایا اور اعلان فرمایا کہ یہ تمھارے بھائی مسلمان ہو کر آئے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ ان کے رشتے دار جو قید ہوئے ہیں انھیں واپس دے دیے جائیں۔ جو خوش دلی کے ساتھ اس کارِ خیر میں حصہ لینا چاہے وہ بتا دے۔سبھی حضرات نے عرض کی کہ ہم سب قیدیوں کو واپس دینے کے لیے تیار ہیں۔

اس طرح سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہوازن سے گرفتار شدہ چھ ہزار قیدیوں کو ایک ساتھ رہا فرما دیا۔ (صحیح البخاری، حصہ سوم، ص:۹۹)

جنگ کا یہ دستور ہوتا ہے کہ جو فوج جنگ جیتا کرتی ہے ان کی گرفت میں مدمقابل کے جو لوگ بھی آجائیں وہ انھیں قید کر لیتے ہیں اور پھر مجاہدین کے درمیان انھیں بطورِ غنیمت تقسیم کر دیا جاتا ہے جن سے وہ خدمت کا کام لیتے ہیں۔تاریخِ عالم کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ ایک بار اگر کوئی شخص اسیری کی زنجیر میں بندھ گیا تو اس کی نسلوں کو غلاموں اور

باندیوں کی حیثیت سے استعمال کیا گیا ہے مگر سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا کریمانہ اُسلوب ہے کہ آپ نے ایک ہی وقت میں چھ ہزار لوگوں کو اسیری سے نجات عطا فرمائی۔

صلحِ حدیبیہ امن کی بحالی کا عظیم پیش خیمہ تھی

۶ ھ میں سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم چودہ سو صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو ساتھ لے کر عمرے کا احرام باندھ کر نکلے۔ آپ کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ کفار آپ کو مکۂ معظّمہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ آپ نے ایک شخص کو مکہ بھیجا تا کہ وہ کفار کے ارادوں کی خبر لائے۔ اس شخص نے آ کر بتایا کہ کفار مکہ نے تمام قبائلِ عرب کے کافروں کو جمع کر کے یہ کہہ دیا ہے کہ مسلمانوں کو ہرگز ہرگز مکے میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔ کفار قریش نے اپنے تمام ہمنوا قبائل کو جمع کر کے ایک فوج تیار کر لی اور مسلمانوں کا راستہ روکنے کے لیے مکے سے باہر نکل کر مقام بلدح (مکہ میں ایک وادی) میں پڑاو ڈال دیا۔

مقام حدیبیہ پہنچ کر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہ دیکھا کہ کفار قریش کا ایک عظیم لشکر جنگ کے لیے آمادہ ہے اور اِدھر یہ حال ہے کہ سب لوگ احرام باندھے ہوئے ہیں، اس حالت میں جوئیں بھی نہیں مار سکتے۔ تو آپ نے مناسب سمجھا کہ کفار مکہ سے مصالحت کی گفتگو کرنے کے لیے کسی کو مکہ بھیج دیا جائے۔ آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مکۂ معظّمہ روانہ فرمایا، کفارِ مکہ نے ان سے کہا کہ ہم تمھیں اجازت دیتے ہیں کہ اپنا عمرہ مکمل کر لو لیکن محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کو ہم ہرگز مکے میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ انھوں نے کہا کہ میں بغیر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ساتھ لیے ہرگز اکیلے اپنا عمرہ نہیں ادا کر سکتا۔ اس پر بات بڑھ گئی اور کفار نے آپ کو مکے میں روک لیا۔ اِدھر حدیبیہ کے میدان میں

یہ بات مشہور ہوگئی کہ کفار قریش نے ان کو شہید کر دیا۔

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو جب یہ خبر پہنچی تو آپ نے فرمایا کہ عثمان کے خون کا بدلہ لینا فرض ہے۔ یہ فرما کر آپ ایک ببول کے درخت کے نیچے بیٹھ گئے اور صحابۂ کرام سے فرمایا کہ تم سب لوگ میرے ہاتھ پر اس بات کی بیعت کرو کہ آخری دم تک تم لوگ میرے وفادار اور جاں نثار رہو گے۔

تمام صحابۂ کرام نے نہایت ہی ولولہ انگیز جوش وخروش کے ساتھ جاں نثاری کا عہد کرتے ہوئے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دست حق پرست پر بیعت کر لی۔ اس بیعت کا نام ''بیعتِ رضوان'' ہے۔ بیعتِ رضوان کے بعد پتہ چلا کہ حضرت عثمان کی شہادت کی خبر غلط تھی، وہ مکے میں صحیح سالم تھے، پھر بخیر وعافیت حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر بھی ہو گئے۔

حدیبیہ میں کفار کی طرف سے سب سے پہلے آنے والا شخص بدیل بن ورقا خزاعی تھا۔ اس کے ذریعے نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قریش کو یہ پیغام بھیجا کہ جا کر ان سے کہہ دو کہ ہم جنگ کے ارادے سے نہیں آئے ہیں اور نہ ہی ہم جنگ چاہتے ہیں۔ ہم صرف عمرے کے ارادے سے آئے ہیں۔ مسلسل لڑائیوں سے قریش کو بہت جانی ومالی نقصان پہنچ چکا ہے لہٰذا ان کے حق میں یہی بہتر ہے کہ وہ جنگ نہ کریں بلکہ مجھ سے ایک مدتِ معینہ کے لیے صلح کا معاہدہ کر لیں۔

سرکارِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مقامِ حدیبیہ ہی میں تھے، کفار کی طرف سے سہیل بن عمرو آیا، اس نے آ کر کہا کہ چلیے ہم آپس میں معاہدے کی دستاویز لکھتے ہیں۔ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے معاہدہ لکھنے کے لیے حضرت علی کو طلب فرمایا۔ اس دستاویز

میں یہ طے کر دیا گیا کہ فریقین کے درمیان دس سالوں تک لڑائی بالکل موقوف رہے گی۔

صلح نامے کی دفعات اور شرطیں یہ تھیں:

(۱) مسلمان اس سال عمرہ ادا کیے بغیر واپس چلے جائیں۔

(۲) آئندہ سال عمرے کے لیے آئیں اور صرف تین دن مکے میں ٹھہر کر واپس چلے جائیں۔

(۳) تلوار کے سوا کوئی دوسرا ہتھیار لے کر نہ آئیں، تلوار بھی نیام کے اندر رکھ کر تھیلے وغیرہ میں بند ہو۔

(۴) مکے میں جو مسلمان پہلے سے مقیم ہیں ان میں سے کسی کو اپنے ساتھ نہ لے کر جائیں اور مسلمانوں میں سے اگر کوئی مکے میں رہنا چاہے تو اس کو نہ روکیں۔

(۵) کافروں یا مسلمانوں میں سے کوئی شخص اگر مدینے چلا جائے تو واپس کر دیا جائے لیکن اگر کوئی مسلمان مدینے سے مکے میں چلا جائے تو وہ واپس نہیں کیا جائے گا۔

(۶) قبائل عرب کو اختیار ہوگا کہ فریقین میں سے جس کے ساتھ چاہیں دوستی کا معاہدہ کر لیں۔

ظاہر ہے کہ یہ شرطیں مسلمانوں کے سخت خلاف تھیں اور صحابۂ کرام کو اس پر بڑی زبردست ناگواری ہو رہی تھی مگر وہ فرمانِ رسالت کے خلاف دم مارنے سے مجبور تھے۔

(ملتقطاً از سیرت مصطفیٰ جانِ رحمت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، ص: ۸۳ تا ۹۱)

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جن دفعات پر سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کفارِ مکہ کے ساتھ صلح فرمانے پر رضامند ہوئے وہ مغلوبی کی طرف اشارہ کرتی ہیں لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ سب سے پہلی بات یہ کہ اس وقت صلح پر رضامند نہ ہونا بہت بڑے خون خرابے کا

باعث ہوتا جس کی بنیاد پر امن وسکون غارت ہو جاتا اور نبی پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس بات کو ہرگز پسند نہیں فرماتے تھے۔

اس کے علاوہ اس کی عظیم حکمت اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآنِ مقدس میں بیان فرمائی جسے سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نگاہِ دوربین دیکھ رہی تھی۔فرمانِ قرآن ہے:

هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ ؕ وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَـُٔوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۚ لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ○

(سورۂ فتح، آیت:۲۵)

ترجمہ: وہ ہیں جنھوں نے کفر کیا اور تمھیں مسجدِ حرام سے روکا اور قربانی کے جانور رکے پڑے اپنی جگہ پہنچنے سے اور اگر یہ نہ ہوتا کچھ مسلمان مرد اور کچھ مسلمان عورتیں جن کی تمھیں خبر نہیں کہیں تم انھیں روند ڈالو، تو تمھیں ان کی طرف سے انجانے میں کوئی مکروہ پہنچے تو ہم تمھیں ان کی قتال کی اجازت دیتے، ان کا یہ بچاؤ اس لیے ہے کہ اللہ اپنی رحمت میں داخل کرے جسے چاہے، اگر وہ جدا ہوجاتے تو ہم ضرور ان میں کے کافروں کو دردناک عذاب دیتے۔(کنزالایمان)

یعنی مکۂ معظّمہ میں بہت سے مرد وعورت مغلوبی کے سبب خفیہ مسلمان ہیں جن کی تمھیں خبر نہیں، اگر جنگ ہوتی تو وہ بھی تمھاری تلوار کے سائے میں آسکتے تھے۔ان کے علاوہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو ابھی تو کافر ہیں لیکن عنقریب اللہ انھیں اپنی رحمت میں لے گا اور انھیں اسلام کی دولت عطا فرمائے گا۔

سلاطین کے نام حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے امن بھرے خطوط

۶ ھ میں صلحِ حدیبیہ کے بعد جب جنگ وجدال کے خطرات ٹل گئے اور ہر طرف امن وسکون کی فضا پیدا ہوگئی تو چوں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت کا دائرہ صرف خطۂ عرب ہی تک محدود نہیں تھا بلکہ آپ تمام عالم کے لیے نبی بنا کر بھیجے گئے تھے اس لیے آپ نے ارادہ فرمایا کہ اسلام کا پیغام تمام دنیا میں پہنچا دیا جائے۔

چنانچہ آپ نے روم کے بادشاہ قیصر، فارس کے بادشاہ کسریٰ، حبشہ کے بادشاہ نجاشی، مصر کے بادشاہ عزیز اور دوسرے سلاطینِ عرب وعجم کے نام دعوتِ اسلام کے خطوط روانہ فرمائے۔ (سیرت مصطفیٰ جانِ رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حصہ دوم، ص:۱۰۱)

جن بادشاہوں کو آقائے کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خطوط بھیجے ان کے اسما درجِ ذیل ہیں:

(۱)	ہرقل قیصر روم	(۲)	خسرو پرویز شاہ ایران
(۳)	مقوقس عزیز مصر	(۴)	نجاشی بادشاہ حبشہ
(۵)	ہوزہ بادشاہ یمامہ	(۶)	حارث غسانی والیِ غسان

خط کا مضمون عموماً درج ذیل باتوں پر مشتمل تھا:

- ☆ میں آپ کو اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔
- ☆ اسلام میں داخل ہو جاؤ، سلامتی میں داخل ہو جاؤ گے۔
- ☆ اگر آپ نے اسلام سے انکار کیا تو آپ پر آپ کی قوم کا بھی عذاب ہوگا۔
- ☆ آپ اسلام قبول کرلیں گے تو آپ کی سلطنت پہلے کی طرح باقی رہے گی۔
- ☆ اگر آپ خود اسلام قبول نہیں کرتے ہو تو اپنی رعایا کو اسلام قبول کرنے کی آزادی دو۔

☆ (اہلِ کتاب کی طرف بھیجے گئے خطوط میں تھا) اللہ آپ کو دوہرا اجر عطا فرمائے گا۔

☆ ایسی بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور آپ کے درمیان یکساں ہے کہ ہم اللہ کے علاوہ کسی کی بندگی نہیں کریں گے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے اور ہم اللہ کو چھوڑ کر کسی کو خدا نہیں بنائیں گے۔

(ملتقطاً از سیرت ضیاء النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جلد چہارم، ص:۱۸۰ تا ۲۰۷)

سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا شاہانِ عالم کی طرف خط بھیجنا اور خط کے مذکورہ مضامین یہ بات بالکل عیاں کر رہے ہیں کہ۔۔۔

☆ آپ نے پوری دنیا کو امن کا گہوارہ بنانے کی سعیِ بلیغ فرمائی تھی۔

☆ اللہ کا قانون جو ساری انسانیت کے لیے امن وسکون کا ضامن ہے، آپ نے اس قانون کو پوری دنیا میں عام فرمانے کی پیش قدمی فرمائی۔

☆ دنیا کے بادشاہوں نے اپنی سلطنتوں میں جو قوانین رائج کیے تھے وہ ان کے اپنے بنائے ہوئے تھے، ان میں نہ انسانی مساوات اور برابری کا خیال تھا اور نہ ہی ہر فردِ مملکت کے لیے حقوق کی ضمانت تھی۔ اس کے علاوہ وہ قوانین بھید بھاؤ پر بھی مشتمل تھے۔ ان کے مقابل میں اللہ کا بنایا ہوا قانون ہر فردِ بشر کے حق کی ضمانت لیے ہوئے اور ہر کسی کے لیے رحمت کا پیغام لیے ہوئے تھا۔ اسی قانون کو پوری دنیا میں نافذ کرنے کے لیے آپ نے سلاطینِ عالم کو اپنے پیغامِ امن میں شریک کرنے کی کوشش فرمائی۔

☆ شاہانِ عالم کے بنائے ہوئے قوانین میں عدل کے مقابل ظلم کا پہلو غالب تھا، اگر کہیں عدل تھا بھی تو وہ جزوی طور پر تھا۔ اس کے مقابل میں اللہ کا بنایا ہوا قانون سراپا عدل

ومساوات تھا۔ اس لیے اللہ کے بنائے ہوئے قانون کو آپ نے سارے عالم کے لیے قابل عمل بنانے کا ارادہ فرمایا۔

☆ یہ خطوط خود ان شاہانِ مملکت کے لیے امن کا پیغام تھے جیسا کہ خطوط میں خود مذکور ہے کہ اسلام قبول کرو، امن وسلامتی تمھارا مقدر ہو جائے گی اور اللہ تمھیں دوہرا اجر دے گا۔ اگر اسلام قبول نہیں کرتے ہو تو تم پر تمھاری قوم کا بھی وبال ہوگا۔ اس لیے کہ قوم اپنے بادشاہ کے تابع ہوتی ہے۔

ان کے علاوہ آپ کے اس اقدام میں مختلف زاویوں سے دنیا کو امن وسکون کا گہوارہ بنانے کی عدیم المثال کوشش تھی۔

فتحِ مکہ کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امن پسندی

حُدیبیہ کے صلح نامے میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ عرب کا جو قبیلہ چاہے وہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے معاہدہ کرے اور جو قبیلہ چاہے وہ قریش سے معاہدہ کرے۔ اسی بنا پر بنی بکر نے قریش سے معاہدہ کرلیا اور بنی خزاعہ نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے باہمی امداد کا معاہدہ کرلیا۔ یہ دونوں قبیلے مکے کے قریب ہی میں آباد تھے لیکن ان دونوں میں عرصۂ دراز سے سخت عداوت اور مخالفت چلی آرہی تھی۔ بنو بکر نے بنو خزاعہ سے اپنی پرانی عداوت کا انتقام لینا چاہا اور اپنے حلیف کفار قریش سے مل کر بالکل اچانک بنو خزاعہ پر حملہ کر دیا جس میں قریش کے تمام رؤسا اور سرداروں نے علانیہ طور پر بنو خزاعہ کو قتل کیا۔

قریش نے اپنی اس حرکت سے حدیبیہ کے معاہدے کو عملی طور پر توڑ ڈالا اور پھر بنی خزاعہ کے سردار عمرو بن سالم خزاعی چالیس آدمیوں کا وفد لے کر فریاد کرنے اور امداد طلب کرنے کے لیے بارگاہِ رسالت میں پہنچے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے پاس قاصد بھیجا اور تین شرطیں پیش کیں:

(۱) بنی خزاعہ کے مقتول کا خون بہا دیا جائے۔

(۲) قریش، قبیلۂ بنو بکر کی حمایت سے الگ ہو جائیں۔

(۳) اعلان کر دیا جائے کہ حدیبیہ کا معاہدہ ٹوٹ گیا۔

ان شرطوں کو سن کر قرطہ بن عبد عمرو نے قریش کا نمائندہ بن کر جواب دیا کہ نہ ہم مقتولوں کے خون کا معاوضہ دیں گے، نہ اپنے حلیف قبیلۂ بنو بکر کی حمایت چھوڑیں گے۔ البتہ ہمیں تیسری شرط منظور ہے اور ہم اعلان کرتے ہیں کہ حدیبیہ کا معاہدہ ٹوٹ گیا۔

اس کے بعد حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے لوگوں کو جنگ کی تیاری کا حکم دیا، حضرت بی بی عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بھی فرما دیا کہ جنگ کے ہتھیار درست کر دیں اور اپنے حلیف قبائل کو بھی جنگی تیاریوں کے لیے حکم نامہ بھیج دیا۔

۱۰ رمضان ۸ ھ کو رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مدینے سے بارہ ہزار کا لشکر لے کر مکے کی طرف روانہ ہوئے۔ پھر فاتحانہ شان وشوکت کے ساتھ پیغمبرِ امن صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مکے کی سرزمین میں نزولِ اجلال فرمایا اور حکم دیا کہ میرا جھنڈا مقام حجون کے پاس گاڑا جائے۔ (ملتقطاً از سیرت مصطفیٰ جانِ رحمت، ج ۲ ص: ۱۶۹ تا ۱۷۶)

یہاں خاص طور سے قابلِ ذکر وہ فرمان ہے جو تاجدارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مکۂ معظّمہ میں فاتحانہ شان کے ساتھ داخل ہوتے وقت جاری فرمائے کہ اس کے لفظ لفظ سے امن ورحمت کے دریا موجزن ہیں:

☆ جو ہتھیار ڈال دے اسے امان ہے۔

☆ جو کعبے میں داخل ہو جائے اسے امان ہے۔

☆ جو اپنے گھر میں بیٹھا رہے اسے امان ہے۔

☆ جو حکیم بن حزام کے گھر میں داخل ہو جائے اسے امان ہے۔

☆ بھاگنے والے کا پیچھا نہ کیا جائے۔

☆ زخمی کو قتل نہ کیا جائے۔

☆ قیدی کو قتل نہ کیا جائے۔

حضرت ابوسفیان اسی موقع پر مشرف باسلام ہوئے، حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے فرمایا: ابوسفیان فخر پسند انسان ہیں، آپ ان کے لیے ایسا کوئی بات فرما دیجیے جس سے ان کی شان بلند ہو جائے۔حضور نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اعلان فرما دیا کہ:

☆ جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے اس کو امان ہے۔

(دلائل النبوۃ، حصہ پنجم، ص: ۳۴)

اہلِ قریش کی عام معافی کا اعلان

آج کے دن وہ لوگ بھی پیغمبرِ امن صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سامنے موجود تھے جنھوں نے آپ کو اور آپ کے خاندان کو تین سالوں تک ایک شِعب میں محصور کر کے آب ودانہ تک بند کر دیا تھا اور اناج کا ایک دانہ تک نہیں پہنچنے دیتے تھے۔ وہ لوگ بھی کھڑے تھے جو آپ پر ایمان لانے والوں کو تپتی ہوئی ریت پر ڈال کر گھسیٹا کرتے تھے۔ وہ مغرور ہستیاں بھی موجود تھیں جنھوں نے قسم کھا رکھی تھی کہ ہم داعیِ اسلام کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیں گے اور ایسے لوگ بھی تھے جو خونِ رسالت سے اپنی پیاس بجھانا چاہتے تھے۔ یہ سبھی مجرم سر جھکائے کھڑے تھے۔

اُدھر دس ہزار تلواریں شہنشاہِ عرب وعجم کے ایک اشارے کی منتظر تھیں کہ حکم ہو تو ہم ان مجرموں کے سر قلم کر دیں۔ آپ نے ان مجرموں کی طرف دیکھا اور دریافت کیا: تمھیں کچھ معلوم ہے کہ اب میں تمھارے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہوں؟ یہ سن کر اہلِ مکہ نے کہا:

نَقُوْلُ خَيْرًا وَنَظُنُّ خَيْرًا، اَخٌ كَرِيْمٌ وَابْنُ اَخٍ كَرِيْمٍ۔

ترجمہ: ہم تو آپ کے بارے میں بھلا ہی کہتے ہیں اور آپ سے بھلائی ہی کی امید کرتے ہیں۔ آپ شریف بھائی اور شریف بھتیجے ہیں۔

اہلِ مکہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیغمبرانہ اخلاق سے واقف تھے، آپ کے صبر وتحمل کو دیکھا تھا، آپ کی ذات سے بھلائی ہی کی امید کرتے تھے۔

ان کے جواب میں پیغمبر امن صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

فَاِنِّيْ اَقُوْلُ كَمَا قَالَ اَخِيْ يُوْسُفُ: لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَهُوَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ۔

ترجمہ: میں بھی اپنے بھائی یوسف (علیہ السلام) کی طرح تم سے کہتا ہوں کہ آج تم پر کوئی الزام اور مواخذہ نہیں ہے۔ خدا ے برتر تمھارے قصور معاف کرے اور وہی ارحم الراحمین ہے۔ (مغازی الواقدی، حصہ دوم، ص: ۸۳۵)

غور کریں کہ جس مقام پر کسی شخص نے مظلومی کے دن گزارے ہوں اور بالآخر اسے وہاں سے ہجرت پر مجبور کر دیا گیا ہو، پھر اسی مقام پر وہ فاتحانہ شان کے ساتھ داخل ہو، اس کے باوجود امن وامان کا ایسا فرمان جاری کرنا سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذات کے علاوہ کسی اور سے سوچا نہیں جا سکتا ہے۔

اس عام معافی، اس امن کے مظاہرے اور اس حسنِ سلوک کے بعد لوگوں کے دل

میں سرورِ کائنات محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عقیدت ایسی بسی اور اسلام کی عظمت ایسی راسخ ہوئی کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پکار اٹھے:

فَخَرَجُوْا كَاَنَّمَا نُشِرُوْا مِنَ الْقُبُوْرِ فَدَخَلُوْا فِي الْاِسْلَامِ۔

ترجمہ: سب کے سب ایسے نکلے جیسے (قیامت قائم ہو چکی ہے اور) سب کو قبروں سے اٹھا دیا گیا ہے اور سب لوگ اسلام میں داخل ہو گئے۔

(شرح معانی الاثار، حصہ سوم، ص: ۳۲۵)

فتحِ مکہ کے وقت مسلمان چاہتے تو ان ظالموں سے ایک ایک ظلم کا بدلہ لے سکتے تھے مگر نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے عفو وکرم کی جو مثال قائم فرمائی وہ رہتی دنیا تک یاد کی جائے گی۔

حضرت سعد سے علم واپس لے لیا

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو کہ قبیلہ خزرج کے رئیس اعظم تھے اور قریش مکہ نے قبول اسلام کی پاداش میں جنھیں بری طرح اپنے جور وستم کا تختۂ مشق بنایا تھا، وہ ایک فوجی دستے کے علمبردار تھے۔ انھوں نے ابوسفیان سے کہا: آج کا دن قتل اور خون ریزی کا دن ہے۔ آج کے روز خدائے شدید العقاب قریش کو ذلیل کرے گا۔

یہ سن کر ابوسفیان حواس باختہ ہو گئے، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نظر آئے تو کہا: یارسول اللہ! کیا آپ نے اپنی ہی قوم قریش کے قتل وغارت کا حکم دے دیا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہرگز نہیں۔ ابوسفیان نے کہا: سعد تو یہی کہہ رہے ہیں۔

رحمتِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سعد غلط کہتے ہیں، تم اطمینان رکھو۔ آج کا دن لطف ورحمت کا دن ہے۔

رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ سعد سے جھنڈا لے لو اس لیے کہ ڈر ہے کہ کہیں وہ جذبات سے مغلوب ہو کر انتقامی کاروائی نہ کر بیٹھیں۔

(سیرت ابن ہشام، حصہ دوم، ص: ۴۰۶)

نبیِ اکرم اروا حنا فداہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بس اتنا خدشہ ہوا کہ کہیں حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جذباتی ہو جانا امن کے غارت ہونے کا سبب نہ بن جائے، تو آپ نے فوراً ان سے علم واپس لینے کا حکم جاری فرمایا اور اس فوجی دستے کی سالاری فوراً حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالے فرما دی۔

تکلیف پہنچانے والوں کی معافی

اتنا بڑا شہر جہاں قدم قدم پر وہ لوگ موجود تھے جنھوں نے ایک لمبے عرصے تک حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچائی، ان میں سے صرف تین آدمی مجرم قرار پائے اور باقی سب معاف کر دیے گئے۔ ان معافی پانے والوں میں ابوجہل کے بیٹے حضرت عِکرمہ بھی ہیں، اُمیہ بن خَلَف کے بیٹے حضرت صفوان بھی ہیں، حضرت کعب بن زُہیر بھی ہیں جو اسلام لانے سے پہلے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لیے ہتک آمیز اشعار کہا کرتے تھے، حضرت وحشی بھی ہیں جنھوں نے جنگِ اُحد میں حضرت امیر حمزہ کا قتل کیا تھا، حضرت ابوسفیان کی بیوی ہندہ بھی ہیں جنھوں نے حضرت امیر حمزہ کا جگر چبایا تھا۔

نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دلی تکلیف پہنچانے والوں میں ابولہب کے دونوں بیٹے عتبہ اور عُتیبہ بھی تھے، ان دونوں کے نکاح میں سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی دو بیٹیاں تھیں جنھیں ان لوگوں نے اپنے ماں باپ کے کہنے پر طلاق دے دیا تھا۔ عُتیبہ نے

طلاق دینے کے بعد سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ بدتمیزی کی تھی اور آپ کی قمیصِ مبارک کو پھاڑ دیا تھا، پھر وہ شام کے تجارتی قافلے کے ساتھ نکلا تو اسے شیر نے پھاڑ کھایا۔

عتبہ کے علاوہ ابولہب کے ایک اور بیٹے مُعَتَّب تھے، عتبہ اور معتب فتح مکہ کے دن وہاں سے روپوش ہو چکے تھے۔ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان دونوں کے تعلق سے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا تو پتہ چلا کہ وہ دونوں روپوش ہو گئے ہیں۔ آپ نے انھیں تلاش کر کے لانے کا حکم فرمایا۔ جب وہ دونوں آئے تو نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انھیں اسلام کی دعوت دی، ان دونوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ان دونوں حضرات کو لے کر ملتزم کے پاس آئے، ان کے لیے دعاے خیر فرمائی اور جب لوٹے تو آپ کے چہرۂ مبارک پر خوشی کے آثار نمایاں تھے۔

حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں: **فَقُلْتُ لَهٗ: سَرَّكَ اللّٰهُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَاِنِّيْ اَرَى السُّرُوْرَ فِيْ وَجْهِكَ، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: نَعَمْ، اِنِّيْ اسْتَوْهَبْتُ ابْنَيْ عَمِّيْ هٰذَيْنِ رَبِّيْ فَوَهَبَهُمَا لِيْ۔**

ترجمہ: میں نے کہا: یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیک وسلم! اللہ آپ کو خوش رکھے، میں آپ کے چہرۂ مبارک پر خوشی کے آثار دیکھ رہا ہوں۔ نبیِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں، میں نے اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے ان دونوں چچا زاد بھائیوں کے لیے دعا کی تھی، اللہ نے میری دعا قبول فرما لی ہے۔ (شرف المصطفیٰ، حصہ سوم، ص: ۳۸۱)

آپ اندازہ کریں کہ مکۂ معظّمہ میں جن لوگوں نے آقاے کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچائی تھی آپ نے سب کو معاف فرما دیا، جو لوگ نظر نہیں آئے انھیں طلب فرمایا، اسلام کی دعوت پیش کی اور انھوں نے اسلام قبول کر لیا تو سب کچھ بھلا کر ان کے اسلام

میں داخل ہونے پر مسرت کا اظہار فرمایا۔

عثمان بن طلحہ کو کعبے کو چابی واپس عطا فرما دی

کلیدِ بردارِ کعبہ حضرت عثمان بن طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنا واقعہ خود بیان فرماتے ہیں کہ نبیِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہجرت سے پہلے مجھے دعوتِ اسلام دی تھی لیکن میں نے ان سے کہا کہ تم نے اپنے آبا واجداد کا دین ترک کر دیا ہے اور ایک نیا دین لے آئے ہو تو میں کیسے تمھارے دین میں داخل ہو سکتا ہوں؟

دورِ جاہلیت میں ہم پیر اور جمعرات کے دن خانۂ کعبہ کا دروازہ کھولتے تھے۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خانۂ کعبہ میں داخل ہونے کا ارادہ کیا تو میں نے انھیں داخل ہونے سے روک دیا، آپ نے تحمل فرمایا اور مجھ سے کہا: ایک دن تم یہ چابی میرے ہاتھ میں دیکھو گے، پھر میں جسے چاہوں گا اسے دے دوں گا۔ میں نے کہا: یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب قریش ہلاک ہو جائیں یا ذلیل ہو جائیں۔ انھوں نے فرمایا: نہیں بلکہ اس دن قریش نئی زندگی پائیں گے اور انھیں عزت ملے گی۔

ان کی بات میرے دل میں بیٹھ گئی اور مجھے ایسا لگنے لگا کہ ان کی بات سچ ہو کر رہے گی، میں نے سوچا کہ میں اسلام قبول کر لیتا ہوں لیکن میری قوم مجھے بہت زیادہ عار دلانے لگی۔ فتحِ مکہ کے دن سرکارِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: اے عثمان! چابی لاؤ، میں چابی لے کر آیا۔ آپ نے چابی لی اور پھر یہ کہہ کر چابی میرے حوالے کر دی کہ:

خُذُوْهَا خَالِدَةً تَالِدَةً لَّا يَنْزَعُهَا مِنْكُمْ إِلَّا ظَالِمٌ۔

ترجمہ: اسے ہمیشہ کے لیے لے لو اور تم سے اب کلیدِ کعبہ کوئی ظالم ہی واپس لے سکتا ہے۔ (سبل الہدی والرشاد فی سیرۃ خیر العباد، حصہ پنجم، ص: ۲۴۴)

تاریخ شاہد ہے کہ آج بھی کلیدِ خانۂ کعبہ حضرت عثمان بن طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خاندان میں ہی ہے۔ یہاں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ہجرت سے پہلے حضرت عثمان بن طلحہ نے نبیِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو خانۂ کعبہ میں داخل ہونے سے روک دیا تھا۔ فتحِ مکہ کے بعد آپ چاہتے تو چابی کسی اور کے حوالے کر دیتے، اس کے باوجود آپ نے حضرت عثمان بن طلحہ کے پاس ہی رہنے دی اور یہ بشارت بھی دی کہ قیامت تک ان کے خاندان ہی میں کعبہ کی کنجی رہے گی۔

خطبۂ حجۃ الوداع امن کا عالمی پیغام

ہجرت سے پہلے حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کتنے حج کیے اس کے تعلق سے مؤرخین کے متعدد اقوال ملتے ہیں۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہجرت سے پہلے ہر سال حج ادا فرماتے تھے۔ البتہ ہجرت کے بعد نو سالوں تک مدینۂ منورہ میں سکونت پذیری کے دوران آپ نے ایک بھی حج ادا نہیں فرمایا۔ پھر جب اسلام کی عظمت وسطوت کا پرچم جزیرۂ عرب کے گوشے گوشے میں لہرانے لگا تو ضرورت اس بات کی تھی کہ پیغمبرِ امن صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بنفسِ نفیس مسلمانوں کی کثیر تعداد کے ساتھ حج ادا فرمائیں تاکہ حج کے دوران مروّج جاہلانہ رسوم کا بالکلیہ خاتمہ ہو جائے اور حج کی ادائیگی کے صحیح طریقے سے ہر کوئی آگاہ ہو جائے۔

تمام اسلامی آبادیوں میں یہ اعلان کر دیا گیا کہ اس سال حجاج کرام کا جو قافلہ خداوند ذوالجلال کے مقدس گھر کی زیارت اور طواف کے لیے نیز فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے جائے گا اس قافلۂ عشاق کے سالار حضور رحمۃ للعالمین محبوبِ ربُّ العالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خود ہوں گے۔ یہ خوشخبری سننے کے بعد ہر شخص اُس سفرِ سعادت اثر میں شریک ہونے

کی تیاری کرنے لگا۔ اس موقع پر سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی قیادت میں سعادتِ حج سے سرفراز ہونے کے لیے بہت بڑی تعداد شریک ہوئی۔

(ملتقطاً از سیرت ضیاء النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جلد چہارم ص: ۷۴۵ تا ۷۵۲)

اس موقع پر میدانِ عرفات میں سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جو خطبہ ارشاد فرمایا اس کا لفظ لفظ امن ورحمت سے مرصع تھا اور ہر ہر جملے میں امنِ عالم کے راز ہائے سربستہ تھے۔ اس خطبے کا اور خصوصیت کے ساتھ ان نکات کا ذکر ضروری ہے جن میں امنِ عالم کا روشن پیغام ہے:

قیامت تک مسلمانوں کی جان ومال کی حرمت ہے:

☆ اَیُّهَا النَّاس، اِنَّ دِمَاءَ کُمْ وَاَمْوَالَکُمْ عَلَیْکُمْ حَرَامٌ اِلٰی اَنْ تَلْقَوْا رَبَّکُمْ کَحُرْمَةِ یَوْمِکُمْ هٰذَا، وَکَحُرْمَةِ شَهْرِکُمْ هٰذَا۔

ترجمہ: اے لوگو! یقیناً تمھارے خون اور تمھارے مال تم پر عزت وحرمت والے ہیں یہاں تک کہ تم اپنے رب سے جا ملو، جس طرح تمھارا یہ دن اور یہ مہینہ حرمت والا ہے۔

امانت ادا کرنے کی تاکید:

☆ فَمَنْ کَانَتْ عِنْدَهٗ اَمَانَةٌ فَلْیُؤَدِّهَا اِلٰی مَنْ ائْتَمَنَهٗ عَلَیْهَا۔

ترجمہ: جس کے پاس کسی کی امانت ہو وہ صاحبِ امانت کو ادا کردے۔

ہر طرح کا سود کالعدم قرار دیا جاتا ہے:

☆ وَاِنَّ کُلَّ رِبًا مَوْضُوْعٌ، وَلٰکِنْ لَکُمْ رُءُوْس اَمْوَالِکُمْ، لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ۔

ترجمہ: ہر طرح کا ربا یعنی سود کالعدم ہے، البتہ تمھارے لیے تمھارے اصل مال

ہیں کہ نہ تم حد سے بڑھو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔

دورِ جاہلیت کے سبھی خون معاف:

☆ وَاَنَّ كُلَّ دَمٍ كَانَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوعٌ، وَاِنَّ اَوَّلَ دِمَائِكُمْ اَضَعُ دَمُ رَبِيعَةَ بْنِ الْحَارِثِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ، وَكَانَ مُسْتَرْضَعًا فِي بَنِي لَيْثٍ، فَقَتَلَتْهُ هُذَيْلٌ فَهُوَ اَوَّلُ مَا اَبْدَأُ بِهِ مِنْ دِمَاءِ الْجَاهِلِيَّةِ۔

ترجمہ: میں دورِ جاہلیت کا ہر خون کالعدم قرار دیتا ہوں۔ سب سے پہلے ربیعہ بن حارث بن عبدالمطلب کا خون کالعدم قرار دیتا ہوں جو کہ بنی لیث میں دودھ پی رہے تھے تو انھیں ہُذیل نے قتل کر دیا تھا۔ زمانۂ جاہلیت کا یہ سب سے پہلا خون ہے جسے میں کالعدم قرار دیتا ہوں۔

چھوٹے چھوٹے گناہوں سے بھی بچنے کی تاکید:

☆ اِنَّ الشَّيْطَانَ قَدْ يَئِسَ مِنْ اَنْ يُعْبَدَ بِاَرْضِكُمْ هٰذِهٖ اَبَدًا، وَلٰكِنَّهٗ اِنْ يُّطَعْ فِيْمَا سِوٰى ذٰلِكَ فَقَدْ رَضِيَ بِهٖ مِمَّا تَحْقِرُوْنَ مِنْ اَعْمَالِكُمْ، فَاحْذَرُوْهُ عَلٰى دِيْنِكُمْ۔

ترجمہ: شیطان اس بات سے مایوس ہو چکا ہے کہ کبھی تمھاری اس زمین پر اس کی عبادت کی جائے لیکن وہ اس بات سے خوش ہوتا ہے کہ وہ شرک کے علاوہ دوسرے گناہ جنھیں تم چھوٹا سمجھتے ہو ان گناہوں کے ذریعے اس کی اطاعت کی جائے۔ تو اپنے دین کے معاملے میں ان چھوٹے چھوٹے گناہوں سے بھی پرہیز کرو۔

میاں بیوی کے باہمی حقوق ہیں:

☆ اَيُّهَا النَّاسُ، فَاِنَّ لَكُمْ عَلٰى نِسَائِكُمْ حَقًّا، وَلَهُنَّ عَلَيْكُمْ حَقًّا۔

ترجمہ: اے لوگو! تمھاری بیویوں پر تمھارے اور تم پر ان کے حقوق ہیں۔

ناحق کسی کا مال لینا جائز نہیں:

☆ تَعَلَّمُنَّ اَنَّ كُلَّ مُسْلِمٍ اَخٌ لِلْمُسْلِمِ، وَاَنَّ الْمُسْلِمِيْنَ اِخْوَةٌ. فَلَا يَحِلُّ لِامْرِءٍ مِّنْ اَخِيْهِ اِلَّا مَا اَعْطَاهُ عَنْ طِيْبِ نَفْسٍ مِّنْهُ. فَلَا تَظْلِمُنَّ اَنْفُسَكُمْ۔

ترجمہ: اچھی طرح جان لو کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، تو ہر کسی کے لیے اپنے بھائی کا مال اسی قدر حلال ہے جو وہ اپنے دل کی خوشی سے اسے دے دے۔ تو تم آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔

اس خطبے کے ان اقتباسات پر غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ آپ نے اس میں جن باتوں کا ذکر فرمایا ہے ان پر عمل پیرا ہونے میں واقعی معنوں میں امنِ عالم کی ضمانت ہے:

☆ دنیا میں امن کو سب سے بڑا خطرہ قتلِ ناحق سے ہوتا ہے، عرب میں ایک قتل کا بدلہ لینے کے لیے بڑے پیمانے پر جنگیں چھڑ جاتی تھیں اور بارہا ایسی جنگیں نسلوں تک باقی رہ جاتی تھیں۔

☆ کسی کا مال ناحق کھانا باہمی جھگڑا لڑائی کا باعث ہے اور جھگڑا لڑائی میں امن کی غارت گری ہے۔

☆ امانت ادا نہ کرنا یا امانت میں خیانت کرنا جدل وجدال بلکہ بارہا قتل وقتال کا باعث بن جاتا ہے۔

☆ سودی کاروبار ایک طبقے کو سرمایہ دار اور دوسرے طبقے کو خطِ افلاس پر لاتا ہے جس کے بعد چوری، رہزنی، غصب اور ان جیسے دوسرے جرائم کا دروازہ کھلتا ہے جن سے دنیا

سے امن کا خاتمہ ہوتا ہے۔

☆ دورِ جاہلیت میں ایک خون کا بدلہ لینے کے لیے درجنوں، سیکڑوں بلکہ ہزاروں جانیں قربان کر دی جاتی تھیں۔

☆ چھوٹے چھوٹے گناہوں کو چھوٹا سمجھ کر ان کا مرتکب ہونے والے کے لیے بڑے گناہوں میں پڑنے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔

☆ دورِ جاہلیت میں صرف شوہروں کے جابرانہ حقوق تھے بیویاں حقوق پانے کی مجاز نہیں تھیں۔

☆ اپنے زورِ بازو کا استعمال کر کے کسی کا مال ناحق لینا کئی جرائم کو ہوا دے سکتا تھا۔

سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے موقع پر مختلف دیار وامصار سے جمع ہونے والوں کے درمیان جو جامع خطبہ ارشاد فرمایا اور ان میں جو اصول وضوابط بیان فرمائے ان میں دنیا سے ظلم و جبر کے خاتمے اور امن وامان کے قیام کے کس قدر راز ہائے سربستہ ہیں اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

جہاد کرنے والوں سے آقائے رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیتیں

آقائے کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی امن پسندی اور امنِ عالم کے لیے آپ کی جد وجہد ان وصیتوں سے بھی آشکارا ہوتی ہے جو آپ جنگی دستے روانہ فرماتے وقت سپہ سالاروں سے فرمایا کرتے تھے۔ احادیث مبارکہ میں جگہ جگہ مختلف الفاظ میں اس بات کا ذکر ہے کہ جس سے تمھیں کسی طرح کا کوئی ضرر پہنچنے کا اندیشہ نہیں ہے انھیں ہرگز قتل نہ کرنا۔

مُثلہ کرنے اور چھوٹے بچوں کے قتل کی ممانعت

چھوٹے بچے جو جنگ میں کسی طرح سے حصہ نہیں لے سکتے اور نہ ہی کسی طرح سے

مسلمانوں کو نقصان پہنچا سکتے ہیں، دورانِ جنگ انھیں قتل کرنے سے آقائے نعمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے منع فرمایا:

حضرت صفوان بن عسال رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں:

بَعَثَنَا رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي سَرِيَّةٍ فَقَالَ: سِيْرُوْا بِاسْمِ اللهِ، وَفِي سَبِيْلِ اللهِ، قَاتِلُوْا مَنْ كَفَرَ بِاللهِ، وَلَا تُمَثِّلُوْا، وَلَا تَغْدِرُوْا، وَلَا تَغُلُّوْا، وَلَا تَقْتُلُوْا وَلِيْدًا۔ (سنن ابن ماجہ، حصہ دوم، ص: ۹۵۳)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہمیں ایک سریہ میں روانہ فرمایا تو ہم سے ارشاد فرمایا: اللہ کے نام سے اللہ کی راہ میں نکلو، کافروں کے ساتھ جہاد کرو، لیکن مثلہ مت کرنا، غدر مت کرنا، خیانت مت کرنا اور کسی بچے کو قتل مت کرنا۔

زمانۂ جاہلیت میں یہ رواج تھا کہ جب کوئی قوم کسی قوم سے جنگ جیت جاتی تو ان کے مقتولین کے جسم کو عیب دار کر دیتے، کان ناک کاٹ لیتے اور چہرے بگاڑ دیتے تھے۔ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کاموں سے منع فرمایا جب کہ خود مسلمان مقتولین کی لاشوں کا کافروں نے مثلہ بنایا تھا۔ اسی طرح چھوٹے بچے جن کے اندر جنگ میں کسی طرح کا تعاون کرنے کی کوئی طاقت نہیں ہوتی ہے انھیں بھی قتل کرنے سے منع فرمایا۔

عورتوں اور شیوخ فانی کے قتل سے ممانعت

جنگ کے دوران عموماً عورتوں سے بھی نقصان کا خدشہ نہیں ہوتا ہے اس لیے عام حالات میں دورانِ جنگ عورتوں کے قتل سے بھی ممانعت فرمائی۔ اسی طرح شیوخ فانی جن کے اندر جنگ کرنے یا جنگ کے دوران کسی طرح سے امداد کرنے کی طاقت نہیں رہ گئی ہے انھیں قتل کرنے سے بھی سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے منع فرمایا۔

حضرت رباح بن ربیع بیان فرماتے ہیں:
ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک غزوے میں تھے، آپ نے دیکھا کہ لوگ کسی چیز پر بھیڑ لگائے ہوئے ہیں۔ آپ نے ایک شخص کو بھیجا کہ دیکھیں ماجرا کیا ہے۔ انھوں نے آکر بتایا کہ ایک عورت قتل کردی گئی ہے۔ نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ تو جنگ بھی نہیں کرسکتی تھی۔ مقدمے پر حضرت خالد بن ولید تھے، ان کے پاس آپ نے ایک شخص کو بھیجا اور فرمایا کہ جاکر خالد سے کہہ دو کہ کسی عورت کا ہرگز قتل نہ کریں۔

(سنن ابی داؤد، حصہ سوم، ص: ۵۳)

البتہ اگر کوئی عورت جنگ میں حصہ لے رہی ہے اور اس سے ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہے تو اسے قتل کرنا جائز ہے۔

ایک روایت حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اِنْطَلِقُوْا بِاسْمِ اللهِ وَبِاللهِ وَعَلٰى مِلَّةِ رَسُوْلِ اللهِ، وَلَا تَقْتُلُوْا شَيْخًا فَانِيًا وَّلَا طِفْلًا وَّلَا صَغِيْرًا وَّلَا امْرَأَةً۔ (سنن ابی داؤد، حصہ سوم، ص: ۳۷)

ترجمہ: اللہ کے نام اور اس کی توفیق سے اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دین پر نکلو۔ کسی شیخِ فانی، کسی بچے اور کسی عورت کا قتل مت کرنا۔

دورانِ جنگ بھی کسی چیز کو نقصان پہنچانے کی ممانعت

کافروں سے لڑنے کی اجازت یا حکم اس لیے ہے کہ مسلمانوں سے مرعوب ومغلوب ہوجائیں۔ اس مقصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جنگ کرنے کا حکم ہے۔ لڑائی کے دوران بھی کسی عام افادے کی چیز کو ویران کرنا یا اسے نقصان پہنچانا حدیثِ پاک میں ممنوع

قرار دیا گیا ہے۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ سرکارِ ابد قرار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

كَانَ نَبِيُّ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا بَعَثَ جَيْشًا مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ إِلَى الْمُشْرِكِيْنَ قَالَ: لَا تَقْتُلُوا وَلِيْدًا طِفْلًا، وَلَا امْرَأَةً، وَلَا شَيْخًا كَبِيْرًا، وَلَا تُغَوِّرُنَّ عَيْنًا، وَلَا تَعْقِرُنَّ شَجَرَةً إِلَّا شَجَرًا يَمْنَعُكُمْ قِتَالًا أَوْ يَحْجِزُ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الْمُشْرِكِيْنَ، وَلَا تُمَثِّلُوا بِآدَمِيٍّ وَلَا بَهِيْمَةٍ، وَّلَا تَغْدِرُوْا، وَلَا تَغُلُّوْا۔ (السنن الکبریٰ للبیہقی، حصہ نہم، ص: ۱۵۴)

ترجمہ: نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب مسلمانوں کی کوئی فوج مشرکین کی طرف بھیجتے تھے تو فرماتے تھے: کسی بچے، کسی عورت اور کسی شیخِ فانی کا قتل مت کرنا۔ کسی جاری چشمے کو خشک مت کرنا، کسی درخت کو مت کاٹنا سوائے اس درخت کے جو تمھارے لیے جہاد سے رکاوٹ بنے یا تمھارے اور مشرکین کے درمیان حائل ہو۔ کسی انسان یا جانور کا مُثلہ مت بنانا، (یعنی ناک کان وغیرہ مت کاٹنا) چوری مت کرنا اور خیانت مت کرنا۔

سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ان وصیتوں کے ساتھ سرایا روانہ فرمایا کرتے تھے۔ ان میں خاص تاکید یہ تھی کہ نفعِ عام کی چیزوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے اور مقصدِ جنگ سے ہٹ کر ہر کام سے پرہیز لازم قرار دیتے تھے۔ یہ آپ کی امن پسندی تھی جسے آپ نے جنگ کے دوران بھی ملحوظ رکھنے کا حکم فرمایا۔

پیغمبر امن صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عدل پسند فرمایا

سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی آمد سے قبل دنیا میں عدل وانصاف کا تصور ناپید تھا، آپ کی ذاتِ گرامی سارے عالم کو امن کا گہوارہ بنانے کے لیے آئی تھی اس لیے آپ نے ظلم کی بیخ کنی اور عدل وانصاف کی آبیاری فرمائی۔ خود بھی عدل وانصاف کے پیکر بنے رہے اور ساری دنیا کو عدل ومساوات کا پیغام دیا۔

جو قانون لائے اس کا ایک حصہ یہ بھی ہے:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى۔ (سورۂ مائدہ، آیت:۸)

ترجمہ: اور تم کو کسی قوم کی عداوت اس پر نہ ابھارے کہ انصاف نہ کرو، انصاف کرو وہ پرہیز گاری سے زیادہ قریب ہے۔ (کنزالایمان)

اس آیۂ مقدسہ میں اس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ اگر کسی قوم سے دشمنی بھی ہو اور پھر تم ان پر غالب بھی آجاؤ تب بھی دل میں عدل سے عدول واِعراض کا خیال نہیں آنا چاہیے بلکہ ایسے میں بھی عدل وانصاف کے پیکر بنے رہو اور ظلم سے اپنے آپ کو بچاؤ۔ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہر حال میں عدل وانصاف سے کام لینے کی تاکید بھی فرمائی اور خود بھی اس پر سختی سے کاربند رہے۔

عدل کا نمایاں مزاج

حقوق رسانی میں مساوات کا خیال کرنا بھی عدل کا حصہ ہوتا ہے لیکن عدل کی سب سے عمدہ صورت تعزیرات کے باب میں قرب وبعد کا لحاظ نہ رکھنا ہے۔ یہ مزاج صرف سرورِ

عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا تھا اور یہ تصور صرف آپ نے عطا فرمایا کہ عدل وانصاف کے معاملے میں کسی کے ساتھ کوئی بھید بھاؤ نہیں کیا جائے گا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں: ایک مخزومی عورت نے چوری کی تو قریش کے لیے یہ لمحۂ فکریہ ہو گیا۔ انھوں نے آپس میں بات کی کہ کوئی شخص ایسا ہونا چاہیے جو جا کر سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اس تعلق سے بات کرے۔ کسی نے کہا کہ اُسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے علاوہ کسی کے اندر اتنی ہمت نہیں ہے جو سرکار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سامنے اس تعلق سے لب کشائی کر سکے۔ حضرت اُسامہ نے اس تعلق سے نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے گفتگو کی تو آپ نے فرمایا: کیا تم اللہ کی مقرر کردہ حدود میں سفارش کرتے ہو؟ آپ کھڑے ہوئے، خطبہ دیا اور فرمایا:

يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا هَلَكَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا اِذَا سَرَقَ فِيْهِمُ الشَّرِيْفُ تَرَكُوْهُ، وَاِذَا سَرَقَ فِيْهِمُ الضَّعِيْفُ اَقَامُوْا عَلَيْهِ الْحَدَّ، وَاَيْمُ اللهِ لَوْ اَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ، لَقَطَعْتُ يَدَهَا۔

ترجمہ: اے لوگو! اگلے لوگ اس لیے ہلاک کر دیے گئے کہ اگر ان میں سے کوئی اعلیٰ خاندان والا چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے تھے اور اگر کوئی کمزور شخص چوری کرتا تو اس پر حد قائم کرتے۔ خدا کی قسم! اگر فاطمہ بنت محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) چوری کرتی تب بھی میں ضرور اس کا ہاتھ کاٹتا۔ (سنن ابن ماجہ، حصہ دوم، ص:۸۵۱)

دنیا سے برائیوں اور جرائم کا خاتمہ نہ ہونے کی ایک بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کے قانون میں وی۔ آئی۔ پی (VIP) لوگوں کے لیے لچک ہوتی ہے، پھر جس جرم سے وہ عوام کو روکتے ہیں انھی جرائم کو ان کے خواص ہوا دیتے ہیں۔ مگر سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ

وسلم کے قانون میں اپنی چہیتی بیٹی کے لیے بھی کوئی لچک نہیں ہے۔

قیدیوں کے ساتھ عدل وانصاف

اسیرانِ بدر کی مدینۂ منورہ میں پہلی رات تھی اور مسلمانوں نے انھیں خوب مضبوطی سے باندھ رکھا تھا۔ ان میں رحمتِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تھے جو کہ ناز ونعمت کے ساتھ پالے ہوئے تھے، اس لیے ہاتھ پاؤں کی بندشیں انھیں بہت تکلیف دے رہی تھیں اور وہ درد سے کراہ رہے تھے۔

سرورِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ان کا کراہنا برداشت نہیں ہو رہا تھا اس لیے آپ بھی اضطراب کی حالت میں جاگ رہے تھے۔ آپ کی یہ کیفیت دیکھ کر ایک صحابی نے عرض کی: یا رسول اللہ! مزاجِ عالی کیوں بے قرار ہے؟ فرمایا: عباس کی کراہوں نے بے تاب کر رکھا ہے۔

وہ صحابی گئے اور چپکے سے حضرت عباس کی بندشیں ڈھیلی کر آئے۔ تھوڑی دیر بعد رحمتِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حیرت سے پوچھا: کیا بات ہے، اب چچا عباس کی کراہوں کی آواز نہیں آ رہی ہے؟ انھوں نے کہا: یا رسول اللہ! میں نے ان کی بندشیں نرم کر دی ہیں۔ یہ سن کر سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: پھر ایسا کرو کہ تمام قیدیوں کی بندشیں ڈھیلی کر دو۔ (سبل الہدی والرشاد فی سیرۃ خیر العباد، حصہ یازدہم، ص: ۹۸)

اس روایت میں خصوصًا دو باتیں قابلِ ذکر ہیں کہ حضرت عباس کا کراہنا خاندانی قرابت کی وجہ سے خاطرِ اقدس پر گراں گزر رہا تھا اس کے باوجود آپ نے انھیں خود اپنی طرف سے کوئی سہولت نہیں دی بلکہ سارے قیدیوں کے ساتھ جو معاملہ کیا جا رہا تھا وہی ان کے ساتھ بھی جاری رکھا۔ دوسری بات یہ کہ جب صحابی نے سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی

بے چینی دیکھ کر حضرت عباس کی بندش ڈھیلی کر دی تو بتقاضائے عدل سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سارے قیدیوں کی بندشیں ڈھیلی کرنے کا حکم فرمایا۔ دوسرے قیدی اگرچہ اس بندش کی وجہ سے کراہ نہیں کر رہے تھے مگر پھر بھی عدل اور مساوات کے خیال سے آپ نے ایسا کرنے کا حکم فرمایا۔

سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خاندان یا قرابت داری کی بنیاد پر کبھی کسی کو برتری نہیں دی بلکہ ہر مقام پر عدل کو ملحوظ فرمایا۔

مقدمات کے فیصلوں میں بھید بھاؤ سے احتراز

مقدمات کے فیصلوں میں عموماً دنیا والوں کا دستور ہے کہ اپنے قریبیوں کے لیے گنجائش کا پہلو نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جن مقدمات کے فیصلے فرمائے وہ مذہب وملت اور رنگ ونسل کے بھید بھاؤ سے پاک تھے۔

ایک منافق (جو بظاہر مسلمان تھا) اور یہودی کے درمیان کھیت میں پانی ڈالنے کے مسئلے میں تنازعہ تھا، دونوں حصولِ انصاف کی خاطر حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس چلے گئے۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دونوں کے دلائل سننے کے بعد یہودی کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ منافق کو اس کا بہت رنج ہوا اور وہ یہودی کو لے کر حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس جا پہنچا اور اپنا تنازعہ بیان کیا۔ یہودی نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بتایا کہ اس سے قبل حضورِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس معاملے کا میرے حق میں فیصلہ کر چکے ہیں۔ یہ سن کر حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: میں ابھی فیصلہ کرتا ہوں، آپ اندر گئے، اپنی تلوار لے آئے اور اُس منافق کا سر تن سے جدا کر دیا اور کہا: جسے حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا فیصلہ منظور نہیں، اُس کے لیے عمر کا یہی فیصلہ ہے۔

(تفسیر ابن کثیر، حصہ دوم، ص:۳۵۱)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ مقدمات کے فیصلوں میں سرکارِ ابد قرار صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کی کوئی رعایت نہیں فرمائی، اگر حق کسی غیر مسلم کا بنتا ہے تو آپ نے اس کے حق میں فیصلہ فرمایا۔ ایک بات اور قابلِ ذکر ہے کہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا عقیدہ بھی یہی تھا کہ آقائے کونین صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کسی کے حق میں ناانصافی پر مبنی فیصلہ کر ہی نہیں سکتے۔

پیغمبرِ امن صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سیرت میں اس طرح کے بے شمار واقعات ملیں گے جو آپ کے عدل وانصاف کی شہادت دیتے ہیں اور اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ عدل وانصاف کی جس راہ پر آپ نے چل کر دکھایا دنیا میں اس کی کوئی مثال نہیں ہے۔

پیغمبرِ امن صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غزوات ومعرکے کیوں فرمائے؟

کسی کے ذہن میں یہ سوال اُبھر سکتا ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جب ساری زندگی دنیا میں امن وامان کی بحالی کی کوشش میں صرف فرمادی تو پھر آپ نے جنگ کیوں کی؟ جنگ تو قتل وقتال کا نام ہے۔ یہ سوال دراصل اسی شخص کے ذہن میں آ سکتا ہے جو اس بات سے ناواقف ہو کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کی ابتدا نہیں فرمائی بلکہ جنگیں آپ پر مسلط کی گئیں۔ جو شخص اس بات کو جان لے وہ اچھی طرح سمجھ جائے گا کہ جنگ کرنے یا صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو جنگ کی اجازت دینے میں آقائے رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے جو مقاصد تھے وہ دنیا کے امن وامان ہی پر مبنی تھے۔

مدینۂ منورہ میں آنے کے بعد جنگ شروع کرنے کے اسباب کیا بنے، اس تعلق سے چند اہم باتیں ذکر کی جاتی ہیں تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ امنِ عالم کے قیام کا جو ایجنڈا لے کر آپ نکلے تھے اس کی راہوں میں بننے والی رکاوٹوں کو ختم کرنے اور اپنا دفاع

کرنے کے لیے آپ جنگ کرنے پر مجبور ہوئے، مختصراً یہ کہ وہ جنگیں عالمی پیمانے پر پیغامِ امن پہنچانے میں حائل ہونے والی رکاوٹوں کو ختم کرنے کے لیے تھیں۔

غارت گری اور قتل وقتال ہی مقصود ہوتا تو جنگیں قبلِ ہجرت چھڑ جاتیں

قبلِ ہجرت سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر اہلِ مکہ نے ظلم وستم کے جو پہاڑ توڑے اس سے کون واقف نہیں ہے اور ہجرت سے پہلے آپ کے پاس جاں نثاروں کی ایک بڑی جماعت تیار ہو چکی تھی۔ اگر آپ کا مقصود قتل وغارت گری ہی ہوتا تو آپ ہجرت نہ فرماتے ہوئے جنگ کی خفیہ تدبیر فرماتے اور یقیناً کامیاب بھی ہوتے۔ متعدد مقامات پر صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے اپنی خواہش کا اظہار بھی کیا کہ کیوں نہ ہم جنگ کریں اور کفار کے مقابلے کے لیے صف آرا ہو جائیں مگر پیغمبرِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہی فرمایا کہ مجھے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ایسا کوئی حکم نہیں ملا ہے۔

حضرت عبدالرحمن بن عوف حضرت مقداد بن اسود، حضرت قدامہ بن مظعون اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین جنھیں مکۂ معظّمہ میں کفار ومشرکین خوب ستایا کرتے تھے، ایک بار یہ حضرات سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور عرض کی:

يَا رَسُوْلَ اللهِ كُنَّا فِيْ عِزٍّ وَّنَحْنُ مُشْرِكُوْنَ، فَلَمَّا اٰمَنَّا صِرْنَا اَذِلَّةً، فَأْذَنْ لَنَا فِيْ قِتَالِ هٰؤُلَآءِ۔

ترجمہ: یارسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیک وسلم! جب ہم مشرک تھے تو ہمیں معاشرے میں اونچا مقام حاصل تھا، جب سے ہم ایمان لائے ہیں اہلِ مکہ نے معاشرے میں ہمارا کوئی مقام نہیں رکھا ہے۔ آپ ہمیں ان سے جنگ کی اجازت عطا فرمائیں۔

ان کے جواب میں نبیِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

كُفُّوْا اَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ فَاِنِّيْ لَمْ اُوْمَرْ بِقِتَالِهِمْ۔

ترجمہ: اپنے ہاتھوں کو ان سے روکے رکھو، مجھے جنگ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

(السیرۃ الحلبیۃ، حصہ دوم، ص:۱۷۰)

مظلوم صحابۂ کرام نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوتے اور عرض کرتے کہ یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیک وسلم! مشرکینِ مکہ کی طرف سے ظلم کی انتہا ہو چکی ہے۔ اب تو ان کے ساتھ جنگ کی اجازت دے دیجیے۔ آپ جواباً فرماتے:

اِصْبِرُوْا فَاِنِّيْ لَمْ اُوْمَرْ بِالْقِتَالِ۔

ترجمہ: ابھی صبر کرو، ابھی مجھے جنگ کا حکم نہیں ہوا ہے۔

(المواہب اللدنیۃ بالمنح المحمدیۃ، حصہ اول، ص:۱۹۹)

ان دونوں روایتوں سے پتہ چلا کہ نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حکمِ الٰہی کے مطابق امن کا ماحول قائم رکھنے کے لیے اپنے آپ کو اور اپنے صحابہ کو جنگ سے روکا تھا ورنہ اگر اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے آپ تلوار نکالتے تو جس خدائے قدیر نے بدر میں صف بستہ فرشتوں کے ذریعے مدد فرمائی وہی خدا مکۂ معظّمہ میں مسلمانوں کی مدد اور اپنے محبوب کے دفاع کے لیے ضرور فرشتوں کو اتار دیتا۔

پیغمبرِ امن صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جنگ کرنے پر ہجرت کو ترجیح دی

بالآخر جب صبر کی انتہا ہو گئی اور کفارِ مکہ نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قتل کے درپے ہو گئے تب بھی آپ نے ان کے خلاف تلوار اٹھانے سے گریز کیا جب کہ آپ کو تلوار اٹھانے کی بھی ضرورت نہ تھی، صرف لبہائے مبارک کو جنبش دے دیتے تو آن کی آن

میں کفار و مشرکین نیست و نابود ہو جاتے۔ اقوامِ ماضیہ نے انبیاے کرام پر جو مظالم ڈھائے اور پھر انبیاے کرام کے سوزِ دروں کے نتیجے میں ان کا جو حشر ہوا ان کی حکایتیں قرآنِ مقدس میں جا بجا موجود ہیں۔

پھر بھی پیغمبرِ امن صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قتل و قتال کا ماحول گرم کرنے سے اپنے ہاتھوں کو روکا اور وطن عزیز چھوڑ کر ہجرت کر گئے۔

مصنفِ سیرتِ ضیاء النبی لکھتے ہیں:

انھیں خیال تھا کہ اپنے وطنِ عزیز، اپنے مال و منال، اپنے اہل و عیال کو پیچھے چھوڑ کر تین سو میل دور واقع شہر یثرب میں پہنچ کر انھیں چین کا سانس لینا نصیب ہوگا اور امن و سکون کے ساتھ وہ زندگی بسر کر سکیں گے اور اہلِ مکہ کے غضب و عناد کے مشتعل جذبات میں اعتدال رونما ہوگا اور وہ ان کے بارے میں اپنی موجودہ روش کو ترک کر دیں گے۔ لیکن صد حیف! کہ ایسا نہ ہوا۔ انھوں نے مکہ میں بیٹھ کر یثرب کے ان لوگوں سے اپنا رابطہ قائم کیا جو دل سے مسلمانوں کے بدخواہ تھے، جن میں عبداللہ بن اُبی اور اس کے حواری اور یہودی قبائل، ایسے عناصر تھے جن کو وہ بآسانی مسلمانوں کے خلاف استعمال کر سکتے تھے۔ (سیرت ضیاء النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جلد چہارم، ص: ۲۴۹)

اہلِ مدینہ کو مشرکین نے دھمکی آمیز خطوط بھیجے

نبیِ اکرم نورِ مجسم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بقاے امن کی خاطر دیارِ عزیز کو چھوڑ بھی دیا پھر بھی مشرکینِ مکہ کے دل کو راحت نہیں ملی۔ وہ اب بھی فتنے کو ہوا دینا چاہتے تھے اور نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی امن پسندی کو ان کی کمزوری سمجھ کر انھیں اور ان کے اصحاب کو

اب بھی مشقِ ستم بنانے کے درپے تھے۔

سننِ ابی داؤد میں مذکور یہ روایت پوری صورتِ حال کی وضاحت کرتی ہے:

یہ بات غزوۂ بدر سے پہلے کی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب مدینۂ منورہ میں جلوہ افروز ہوئے تو کفارِ قریش نے عبداللہ بن اُبی (رئیس المنافقین) اور اوس وخزرج قبیلوں کے بت پرستوں کو یہ خط لکھا کہ ہمارے آدمی کو تم لوگوں نے اپنے شہر میں پناہ دی ہے۔ تم لوگ یا تو ان کے ساتھ جنگ کرو یا انھیں اپنے شہر سے نکال دو ورنہ ہم اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ ہم تم پر اپنے پورے لشکر کے ساتھ حملہ کریں گے، تمھارے جوانوں کو تہِ تیغ کر دیں گے اور تمھاری عورتوں کو اپنی لونڈیاں بنالیں گے۔

جب یہ خط عبداللہ بن اُبی اور اس کے مشرک حواریوں کے پاس پہنچا تو انھوں نے آپس میں مشورہ کر کے یہ فیصلہ کیا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ کریں گے۔ نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو جب یہ بات معلوم ہوئی کہ عبداللہ بن اُبی اور اس کے مشرک حواری یہ ارادہ رکھتے ہیں تو آپ ان سے ملنے ان کے پاس تشریف لائے اور ان سے فرمایا کہ اگر تم لوگ قریش کی دھمکی سے مرعوب ہو کر ہمارے ساتھ جنگ کرو گے تو تمھیں زیادہ نقصان پہنچے گا، اس کے مقابل میں اگر تم اہلِ مکہ کے ساتھ جنگ کرو گے تو تمھیں کم نقصان پہنچے گا۔ کیوں کہ وہ تمھارے قرابت دار یا تمھارے قبیلے کے لوگ نہیں ہیں۔ اگر تم انھیں قتل کرو گے تو اپنے قبیلے کے لوگوں کے قتل کرنے والے نہیں کہلاؤ گے۔ اس کے مقابل میں اگر تم

ہمارے ساتھ جنگ کروگے تو تمھارے قبیلے کے جو لوگ اسلام میں داخل ہو چکے ہیں تمھیں ان کو قتل کرنا پڑے گا اور وہ تمھارے بیٹے، تمھارے باپ، تمھارے بھائی اور تمھارے قریبی رشتے دار ہیں۔ ان لوگوں نے نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی یہ بات سن کر اپنا فیصلہ بدل دیا۔

(سنن ابی داؤد، حصہ سوم، ص:۱۵۶)

اپنے اس حربے میں ناکام ہونے کے بعد کفارِ مکہ نے اسی طرح کی دھمکی مدینۂ منورہ اور اطراف میں بسنے والے یہودیوں کو دی۔ بنی نضیر نے اگرچہ پہلے نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے دوستی کا معاہدہ کیا تھا لیکن اس دھمکی آمیز خط کے ملنے کے بعد انھوں نے معاہدہ توڑ دیا اور نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے جنگ کرنے پر آمادہ ہوئے۔ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دوسرے دن بنی نضیر کا محاصرہ کیا اور انھیں معاہدے کی تجدید کاری پر آمادہ کیا، لیکن انھوں نے معاہدے سے انکار کیا تو پھر ان کے ساتھ مسلمانوں کی جنگ ہوئی، ان لوگوں نے ہزیمت پائی اور بالآخر مدینۂ منورہ سے جلاوطن کردیے گئے۔

سرکارِ کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بنی قریظہ کی بستی پر چڑھائی کی اور ان سے معاہدے کی تجدید کاری کا ذکر کیا تو وہ لوگ معاہدہ کرنے پر تیار ہو گئے۔ اس طرح سے قریشِ مکہ ایک بار پھر اپنے حربے میں ناکام ہوئے۔ (ایضًا ملخصًا)

مشرکین کی مسلمانوں کو براہِ راست دھمکیاں

جب اپنے ان دونوں حربوں میں مشرکینِ مکہ ناکام ہو گئے تو ان لوگوں نے مسلمانوں کو براہِ راست یہ دھمکی آمیز خط بھیجا:

مسلمانو! تم خوش نہ ہونا کہ تم ہمارے چنگل سے نکل کر وہاں پہنچ گئے ہو

جہاں تم آزادی سے زندگی بسر کر سکتے ہو۔ یاد رکھو ہم تمھاری بستی پر چڑھائی کریں گے اور تم میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے بلکہ سب کو تہِ تیغ کر کے رہیں گے۔ (سیرت ضیاء النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جلد چہارم، ص: ۲۵۲، ۲۵۳)

کفار کی طرف سے اس طرح کی دھمکیوں کا موصول ہونا اس بات کا اشاریہ تھا کہ وہ ہر طرح سے جنگ وجدال پر آمادہ تھے اور انھیں ایسا لگتا تھا کہ جنگ چھڑی تو وہ مسلمانوں کو چٹکیوں میں مسل کر رکھ دیں گے۔ ایسے ماحول میں مسلمانوں کا ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہنا بھی صحیح نہیں تھا بلکہ ان لوگوں کو ان کی مغلوبی کا احساس دلا کر ان کے غرور کو خاکستر کرنا بھی ضروری تھا ورنہ وہ جب بھی ضرر رسانی کا موقع پاتے اسے ہاتھ سے جانے نہ دیتے۔

کفارِ مکہ کی دھمکیوں پر مسلمانوں کی جوابی کاروائی

ان کی دھمکیاں موصول ہونے کے بعد ان کی لگام کسنے کے لیے سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حکمتِ عملی کے جو اقدامات فرمائے ان کی تفصیل بڑے انوکھے انداز میں سیرت ضیاء النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں مذکور ہے:

صورت حال سے نمٹنے کے لیے حضور کریم رحمۃ للعالمین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے ضروری اقدامات فرمائے، سب سے پہلے مدینۂ طیبہ میں آباد مختلف قبائل اور مختلف مذاہب کے ماننے والوں کو ایک دستور کا پابند کر کے کمالِ حکمت سے اندرونی اضطرابات پر قابو پانے کی کامیاب کوشش فرمائی۔ اس کے بعد کفار مکہ کو ان کے معاندانہ رویے سے باز رکھنے، اسلام اور اہلِ اسلام کے خلاف انھیں سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے روکنے کی طرف توجہ مبذول فرمائی۔ اس کا آسان اور مؤثر طریقہ یہ تھا کہ ان کی

تجارتی شاہراہ پر اپنی گرفت مضبوط کی جائے جو بحر احمر کے کنارے یمن سے شام کی طرف جاتی تھی، جس پر اہلِ مکہ اور دوسرے قبائل کے تجارتی کارواں اپنا بیش قیمت سامان لے کر جاتے تھے۔

نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سب سے پہلے جہینہ، بنی صبرہ، بنی مدلج وغیرہ قبائل سے دوستی کے معاہدے کیے جو اس شاہراہ کے ارد گرد سکونت پذیر تھے اور مدینۂ طیبہ پر حملہ آور ہونے کی صورت میں قریش ان قبائل کو اور ان کے وسائل کو اہلِ اسلام کے خلاف استعمال کر سکتے تھے، ان قبائل کو اپنے ساتھ ملانے کے بعد کفارِ مکہ کو مرعوب کرنے اور ان کو اپنی بالا دستی کا احساس دلانے کے لیے گاہے گاہے چھوٹے چھوٹے دستے بھیجنے شروع کر دیے۔ یہ ابتدائی فوجی مہمیں بظاہر بڑی مختصر ہوا کرتی تھیں اور ان میں مجاہدین کی تعداد بہت قلیل ہوا کرتی تھی: کسی میں دس بارہ، کسی میں تیس چالیس، کسی میں اسی۔ (جلد چہارم، ص: ۲۵۴، ۲۵۵)

فوجی مہمیں بھیجنے کے اغراض ومقاصد

نبیِ اکرم تاج دار عرب وعجم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جو یہ فوجی مہمیں بھیجا کرتے تھے ان کے پیچھے درج ذیل مقاصد تھے:

(۱) حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ مہاجرین، مدینۂ طیبہ کی پر امن فضا میں آباد ہو کر اپنے ان دشمنوں کو فراموش نہ کر دیں جنھوں نے برسہا برس ان پر جور وستم کے پہاڑ توڑے ہیں، ان کو اپنے گھروں سے نکالا ہے، ان کے مکانات اور جائیداد پر غاصبانہ قبضہ کر لیا ہے اور ہر وقت ان کے اس نشیمن پر بجلی بن کر گرنے کی

تیاریاں کر رہے ہیں۔ مسلمان ہمیشہ ہوشیار رہیں اور آنے والے مشکل اوقات کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر مستعد رہیں۔

(۲) ان پر کفارِ مکہ نے جو بے پناہ مظالم کیے تھے اس سلسلے میں بیرونی قبائل کی ہمدردیاں حاصل کرنا ضروری تھیں۔ اگر مظلوم خود ہی خاموش ہو جائے اور ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائے تو بیرونی لوگ ان سے دلچسپی لینا چھوڑ دیتے ہیں اس لیے ضروری تھا کہ مسلمان کفار پر چھاپے مارتے رہیں تا کہ لوگوں کی توجہ ان کی طرف مبذول رہے۔

(۳) کفارِ مکہ کی افرادی قوت سے ٹکر لینے سے پہلے نبیِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس بات کو ضروری سمجھتے تھے کہ ان کی معیشت پر ضرب کاری کی جائے تا کہ ان کے دماغوں میں دولت وثروت کا جو غرور ہے اس کا توڑ ہو سکے۔

(۴) کفار نے مہاجرین کے سارے اموال اور جائیدادوں پر غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا، اپنے مغصوبہ اموال کو واپس لینا ان کا قانونی اور اخلاقی حق تھا اس لیے ان کے تجارتی کاروانوں پر چھاپا مارنے کے لیے یہ مہمیں روانہ کی جاتی تھیں اگر مسلمان ان کی اس تجارتی شاہراہ پر قابض ہو جاتے تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ اہلِ مکہ کو اس کے بجائے عراق کا راستہ اختیار کرنا پڑتا جو بڑا طویل اور دشوار گزار تھا۔

(۵) قریش کو اپنی بہادری اور جنگی مہارت پر بڑا گھمنڈ تھا، اس گھمنڈ کو توڑنے کے لیے بھی یہ فوجی مہمیں روانہ کی جاتی رہیں تا کہ انھیں مرعوب کیا جا سکے۔

(۶) اس کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ مہاجرین اس علاقے کے جغرافیائی حالات سے پوری طرح آگاہ ہو جائیں، اس کے میدان، اس کے نشیب وفراز، اس کی وادیوں اور

اس کے پہاڑوں سے پوری طرح واقف ہوں تا کہ اگر کفار سے جنگ کا موقع آئے تو مسلمان اس علاقے سے پوری طرح باخبر ہوں۔

(۷) مسلمانوں کی حوصلہ افزائی اور ان کے اندر جرأت و ہمت پیدا کرنے کے لیے بھی ان فوجی مہموں کا سلسلہ ازبس مفید تھا۔

(سیرت ضیاء النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جلد چہارم، ص: ۲۵۵، ۲۵۶)

اسلامی جنگوں کی خصوصیات

اسلامی جنگوں کی خصوصیات سمجھنے کے لیے عہدِ جاہلیت کی جنگوں پر ایک سرسری نظر پڑ جائے تو بات آسانی سے سمجھ میں آئے گی کہ دنیا کے مختلف گوشوں، خصوصًا عرب میں چھوٹے چھوٹے فوائد کو حاصل کرنے کے لیے یا پھر بار ہا بے مقصد بڑی بڑی جنگیں چھڑ جایا کرتی تھیں اور قتل وخوں ریزی کا ایسا معرکہ گرم ہوتا تھا کہ ہزاروں کو اپنی جانوں سے ہاتھ دھونا پڑتا تھا۔

عہدِ نبوی سے قبل جو اقوام دنیا میں بستی تھیں ان کو دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ایک متمدن اور تہذیب یافتہ کہلائے گا اور دوسرا غیر متمدن اور غیر مہذب کہلائے گا۔

غیر مُتمدّن قوموں کی جنگ:

غیر متمدن قوموں کے نزدیک انسانی جان کی کوئی اہمیت نہ تھی اور جنگ ان کا قومی پیشہ بن گیا تھا۔ معمولی معمولی باتوں پر شمشیریں بے نیام ہو جاتیں، ایک بار جنگ کی آگ بھڑک جاتی تو کئی کئی پشتوں تک اس کا سلسلہ جاری رہتا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ انتقامی جذبے کی تسکین اور حرص وہوس کی تکمیل کے لیے تمام غیر انسانی سلوک روا رکھے جاتے۔

لاشوں کی بے حرمتی، ناک کان کاٹ کر ان کا ہار بنا کر پہننا، دشمنوں کی

کھوپڑیوں میں شراب پینے کی نذر ماننا، دشمنوں کی لاشوں کو نذرِ آتش کر دینا، قیدیوں کے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک کرنا۔

وہ لوگ انسانیت کے تمام حدود کو پار کر کے سنگ دلی اور درندگی کے اس مقام پر پہنچ گئے تھے کہ انسانی کلیجے چبا ڈالتے تھے اور اس پر طرہ یہ کہ اس کو فخر و شجاعت کا ذریعہ سمجھتے تھے اور اس طرح کی خونی داستانوں کو وہ اشعار میں فخریہ بیان کرتے تھے۔

مُتمدّن قوموں کی جنگ:

جو قوم مہذب اور متمدن کہلاتی تھی اس کا جنگی رویہ بھی ان غیر متمدن اور غیر مہذب کہلانے والی قوموں سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا۔ جنگ کے لیے کوئی اصول اور قانون نہ تھا، زمین کے جس حصے پر وہ چڑھ آتے وہاں قیامتِ صغریٰ برپا کر دیتے، جنگ کا بگل بجتے ہی یکساں طور پر بوڑھوں، بچوں، عورتوں، بیماروں، معذوروں اور گوشہ نشینوں کا بھی صفایا کر دیتے۔ فصلیں اجاڑ دیتے، باغات کو ویران کر دیتے، آبادیوں کو تہس نہس کر دیتے۔ ان کے اندر مذہبی عناد بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، متبرک مقامات کی بے حرمتی بھی جنگ کا ایک حصہ تھا۔ ایک بار جنگ چھڑی تو ہزاروں لاکھوں جانوں کا خاتمہ یقینی ہو جاتا تھا۔

(مستفاد از اخلاقِ رسول، جلد دوم، ص: ۸۲)

اهلیانِ اسلام کی جنگ:

گزشتہ صفحات میں یہ بات تفصیل سے گزر چکی ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو جب جنگ کے لیے تلوار اٹھانے پر مجبور کیا گیا تبھی آپ نے تلوار کشی کی ورنہ اس سے پہلے خود بھی پیکرِ صبر و حلم بنے ہوئے تھے اور صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو بھی اس کا حکم اور تاکید فرمایا کرتے تھے۔

جنگ کے سلسلے میں حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اولاً گزشتہ طریقوں کی اصلاح کی، اس کے بعد اس کے لیے ایسے پاکیزہ اصول طے کیے کہ پہلے جس جنگ کا نام سنتے ہی روح کانپ اٹھتی تھی اور مفتوح قوم کھلی آنکھوں موت کا مشاہدہ کرنے لگتی تھی، وہی جنگ انسانیت کی اخلاقی، جانی اور مادی تحفظ کا ذریعہ بن گئی۔ اولاً صلح وامن سے کام لینے کی تاکید کی گئی اور انتہائی ناگفتہ بہ حالات میں سخت شرائط کے ساتھ تلوار اٹھانے کی اجازت دی گئی۔ پیغمبرِ امن صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی مسلسل تیرہ سالوں تک ظلم وستم کی چکی میں پستے رہے، بغیر کسی جرم وخطا کے ان کو ان کے گھروں سے نکال کر جلاوطن کر دیا گیا، جلاوطنی کے بعد بھی تعاقب جاری رہا اور انھیں بار بار دھمکیاں دی جانے لگیں تب کہیں جا کر جنگ کی اجازت دی گئی، اجازت بھی ملی تو اس طرح کہ پرانے تمام جنگی طریقۂ کار کو منسوخ کر دیا گیا اور جنگ کا ایسا طریقہ رائج کیا گیا جو امنِ عالم کا ضامن بن جائے۔

جنگ کے تعلق سے پیغمبر امن صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایات:

جنگ کے تعلق سے سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ہدایات انسانی تاریخ میں منفرد اہمیت کی حامل ہیں:

(۱) پیغمبر امن صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اہلِ قتال اور غیر اہلِ قتال کا فرق واضح کرتے ہوئے غیر اہلِ قتال کو نقصان پہنچانے سے منع کیا۔ اور حکم دیا کہ عورتوں، بچوں، بوڑھوں، بیماروں، گوشہ نشینوں، زاہدوں اور راہبوں کو قتل نہ کیا جائے۔ (ابوداؤد)

(۲) اہلِ عرب عموماً شب خون مارتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس عادت کو بند کروا دیا اور صبح سے پہلے حملہ کرنے کی ممانعت کی۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کسی قوم کے پاس

رات کو پہنچ جاتے تو صبح ہونے سے پہلے اس پر حملہ نہیں کرتے تھے۔ (بخاری)

(۳) پہلے دستور تھا کہ فتح پانے والی قوم اپنے مدمقابل کے مقتولین کو آگ میں جلا دیتی تھی۔ نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس دل سوز اور جاں سوز رواج کو ختم فرمایا اور فرمایا: آگ کے پیدا کرنے والے خدا کے علاوہ کسی کو آگ کا عذاب دینے کا حق نہیں ہے۔ (ابوداؤد)

(۴) پہلے یہ رواج تھا کہ جب کوئی لشکر جنگ کے لیے نکلتا تو راستے میں لوٹ مار کرتے ہوئے جاتا۔ آقاے کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے لشکریوں کے لیے تنگی کے ساتھ گزارہ کرنا پسند فرمایا لیکن لوٹ مار کر کے کسی کی کوئی چیز ناحق چھین کر کھانا پسند نہیں فرمایا اور جاہلیت کے اس رواج کو بھی ختم فرمایا۔ غزوۂ عسیرہ جس میں مسلمانوں کے پاس اشیاے خوردنی کی بہت تنگی تھی، اس موقع پر لشکر کے کچھ لوگوں نے کسی ریوڑ سے ایک بکری اٹھا لی اور اس کا گوشت پکا کر کھانا چاہا۔ جب نبیِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو علم ہوا تو آپ نے ہانڈی کو اپنے نیزے سے الٹ دیا۔

(ابوداؤد)

(۵) افواج کی پیش قدمی کے وقت فصلوں کو خراب کرنا، کھیتیوں کو تباہ کرنا، بستیوں میں قتلِ عام اور آتش زنی کرنا اسلامی نقطۂ نظر سے ناجائز ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۲۰۵ میں اسے منافقین کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ پیغمبرِ امن صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صرف اس صورت میں درختوں کے کاٹنے کی اجازت دی جب کہ جنگ کے میدان میں ان کی وجہ سے دشواری پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔

(۶) دشمنوں کی لاشوں کی بے حرمتی کرنا اور ان کے اعضا کاٹ کر مثلہ بنانے سے بھی

آپ نے سختی سے منع کیا۔ (بخاری)

(۷) مقتولین یعنی مارے جانے والوں کی تعداد کم سے کم ہو اس کا پیغمبرِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پورا خیال فرمایا ہے۔ فتحِ مکہ کے موقع پر شہرِ مکہ میں داخل ہونے سے پہلے اعلان فرمایا: کسی زخمی پر حملہ نہ کیا جائے، کسی بھاگنے والے کا پیچھا نہ کیا جائے، کسی قیدی کو قتل نہ کیا جائے، جو اپنے گھر میں بند ہو جائے اسے قتل نہ کیا جائے، جو خانۂ کعبہ میں پناہ لے لے اسے قتل نہ کیا جائے، جو ہتھیار ڈال دے اسے قتل نہ کیا جائے، جو ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے لے اسے قتل نہ کیا جائے۔

(سیرت ابن ہشام)

ان کے علاوہ کثیر احادیث مبارکہ اور کتبِ سیر کے کثیر صفحات سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے رائج کردہ طریقۂ جنگ کی امتیازی خصوصیات پر مشتمل ہیں جن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبرِ امن صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جنگ و جہاد کو ان تمام وحشیانہ افعال سے پاک کر دیا جو اس عہد میں جنگ کا ایک لازمی جز بنے ہوئے تھے۔ وحشیانہ افعال اور کسی بھی فائدے کی چیز کو نقصان پہنچانے کو آئینِ جنگ کے خلاف قرار دیا گیا۔ جنگ کو پیغمبرِ امن صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے عبادت کا درجہ دیا اور آئینِ جنگ کی خلاف ورزی کو ثوابِ عبادت سے محرومی کی علت قرار دیا۔ جنگ صرف ایسی چیز رہ گئی جس میں شریف اور بہادر آدمی دشمن کو کم سے کم نقصان پہنچا کر اس کے شر کو دفع کرنے کی کوشش کرے اور عالم کو اس کے فساد سے پاک کرنے کی سعیِ بلیغ کرے۔

پیغمبرانہ جہاد کے نتائج:

گیارہ سالوں میں کفار و مشرکین کے ساتھ جتنی جنگیں لڑی گئیں ان میں فریقین کا

کتنا جانی نقصان ہوا اس کی تفصیلات پڑھ کر آپ ششدر رہ جائیں گے۔

☆ ابتدائی سرایا و غزوات میں نہ دشمن کا کوئی آدمی قتل ہوا، نہ کوئی کلمہ گوشہید ہوا، وہ غزوات وسرایا یہ ہیں: (۱) الابواء (۲) سیف البحر (۳) بواط (۴) العشیر ۃ اور (۵) بدرِ اولیٰ۔ ان میں فریقین کا کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔

☆ عبداللہ بن جحش کے سریے میں کفار کا ایک آدمی عمرو بن حضرمی مارا گیا۔ اسلامی جنگوں میں یہ پہلا مقتول تھا۔

☆ غزوۂ بدر الکبریٰ میں کفار کے ستر آدمی قتل ہوئے اور چودہ مسلمان شرفِ شہادت سے مشرف ہوئے۔ غزوۂ بدر کے بعد اپنے سنگین جرائم کی پاداش میں دو مشرکوں کو قتل کیا گیا، ایک کا نام حارث اور دوسرا عقبہ بن ابی معیط تھا۔

☆ غزوۂ سویق میں صرف ایک مشرک قتل ہوا۔

☆ غزوۂ بنی سلیم میں تین انصاری شہید ہوئے۔

☆ غزوۂ ذی امر جو نجد میں ہوا اس میں کوئی شخص نہیں مارا گیا۔

☆ یہودی قبیلے بنی قینُقاع کے جلاوطن کرنے کی کاروائی میں دو آدمی مارے گئے۔

☆ سریہ زید بن حارثہ میں فریقین کا کوئی آدمی نہیں مارا گیا۔ اس کے بعد اسلام دشمنی اور شر انگیزی کے باعث یہودیوں میں سے کعب بن اشرف، ابورافع سلام بن ابی الحقیق اور کعب بن یہوذا کو قتل کیا گیا۔

☆ غزوۂ اُحد میں ستّر مسلمان نعمتِ شہادت سے بہرہ ور ہوئے اور بائیس مشرک مقتول ہوئے۔

☆ غزوۂ حمراء الاسد میں ایک بدزبان ابوعزیٰ موت کے گھاٹ اتارا گیا۔

☆ یوم رجیع میں چھ مسلمانوں نے جامِ شہادت نوش کیا۔

☆ بئر معونہ کے غدارانہ منصوبے میں ستر مسلمانوں نے تاج شہادت زیب سر کیا۔ اس کے بعد عمرو بن اُمیہ نے غلطی سے تین کافروں کو مار ڈالا، ان میں سے دو کی دیت رحمتِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خود ادا کی۔

☆ غزوۂ بنی نضیر میں ایک آدمی کا قتل ہوا۔

☆ غزوۂ ذات الرقاع میں ایک انصاری شہید ہوئے۔ وہ رات کو پہرہ دے رہے تھے کہ کافروں نے یکے بعد دیگرے انھیں تین تیروں کا نشانہ بنایا۔

☆ بدرِ اُخریٰ میں کوئی آدمی قتل نہیں ہوا۔

☆ غزوۂ خندق میں تین مشرک قتل کیے گئے اور چھ مسلمانوں نے جامِ شہادت نوش کیا۔

☆ غزوۂ بنی قریظہ میں دو مسلمان شہید ہوئے اور چھ یا سات سو یہودی مقتول ہوئے، اس کے بعد خالد بن سفیان الہذ لی قتل کیا گیا۔

☆ غزوۂ ذی قرد میں پانچ افراد مارے گئے۔

☆ غزوۂ بنی مصطلق میں دو لوگوں کا قتل ہوا۔

☆ غزوۂ حدیبیہ میں ایک آدمی کا قتل ہوا۔

☆ غزوۂ خیبر میں جانبین سے بیس آدمی مارے گئے۔

☆ غزوۂ خیبر کے بعد کسی سریے میں کوئی آدمی نہیں مارا گیا۔

☆ جب بنی قضاعہ کی گوشمالی کے لیے کعب بن عمر کی سربراہی میں سریہ روانہ کیا گیا تو اس میں چودہ آدمی مقتول ہوئے۔

☆ غزوۂ موتہ میں بارہ اشخاص مارے گئے۔

☆ غزوۂ فتح مکہ میں بھی بارہ آدمی مارے گئے۔
☆ غزوۂ حنین اور ہوازن میں چار مسلمان شہید ہوئے اور قبیلۂ ثقیف کے پچھتر کافر مارے گئے۔
☆ غزوۂ طائف میں بارہ مسلمان سعادتِ شہادت سے مشرف ہوئے۔
☆ غزوۂ تبوک میں ایک مسلمان شہید ہوئے۔

(سیرت ضیاء النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جلد سوم، ص: ۲۸۰ تا ۲۸۱)

گیارہ سالہ طویل مدت میں دو درجن سے زیادہ غزوات وسرایا میں جانبین سے چار سو چالیس لوگوں کا قتل ہوا۔ اس شمار میں وہ لوگ بھی ہیں جنھیں دھوکے اور غدر سے قتل کیا گیا تھا یا غلطی سے قتل ہوئے تھے۔

اس دور میں جو جنگی ماحول تھا اس کے مقابل میں اتنی قلیل قربانیوں اور نقصانات سے نوعِ انسانی کو جو فائدے پہنچے وہ بے مثال ہیں۔

ان فوائد کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

☆ اسلام سے پہلے جزیرۂ عرب سیکڑوں حصوں میں بٹا ہوا تھا، سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انھیں ایک کر دیا۔
☆ جزیرۂ عرب کا ہر حصہ مطلق العنان تھا، کہیں کوئی ذمے دار حکومت نہ تھی۔ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انھیں نظم وضبط کا پابند کیا۔
☆ قانون وعدل کا کوئی نظام نہیں تھا، پیغمبرِ امن صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انھیں الٰہی قانون عطا فرمایا۔
☆ خطۂ عرب کے باشندوں کے لیے معاشی فلاح اور معاشرتی بہبود کے لیے کوئی منصوبہ

بندی نہ تھی، آقائے رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کی فلاح و بہبود کی راہیں ہموار فرمائیں۔

☆ قبائلی عصبیت کی حکمرانی تھی، اس عصبیت کو سرکارِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ختم فرمایا۔

☆ طاقتور جس طرح چاہتے تھے کمزوروں کا استحصال کرتے تھے، کوئی باز پرس کرنے والا نہیں تھا۔ پیغمبر امن صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس ماحول کا خاتمہ فرمایا۔

☆ ان کی پیشانیاں سیکڑوں معبودانِ باطلہ کے سامنے جھکتی تھیں، رسولِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کی آوارہ پیشانیوں کو ایک معبودِ برحق کے آگے جھکنے کی پابند کیا۔

(ملخصًا از سیرت ضیاء النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جلد سوم، ص: ۲۷۹ تا ۲۸۰)

یہ تو غزوات و سرایا کا سرسری جائزہ تھا جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ قلیل بلکہ اقل جانی نقصان کے عوض میں عالمی سطح پر امن کی بحالی کا جو فائدہ میسر آیا وہ بہت عظیم ہے۔ اس کے علاوہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پرامن معاہدے، صلح کی کوششیں، عدل و انصاف کے معاملات، قیدیوں کے ساتھ اچھے سلوک اور جنگ سے متعلق دیگر معاملات کا جائزہ لیں تو اندازہ ہوگا کہ اسلامی جنگیں انسانیت کے لیے امن کی بحالی ہی کی کوششوں کا ایک حصہ تھیں، ان سے انسانوں کو زحمت نہیں بلکہ رحمت ہی میسر آئی ہے۔

پانچواں باب

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جلوہ گری سے پہلے دنیا کے حالات

تاریخ کے اوراق اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی آمد سے قبل دنیا میں امن وامان کا لفظ محض ایک لفظ کی حیثیت سے رہ گیا تھا، اس کا حقیقی تصور دنیا سے ختم ہو چکا تھا۔ آمد رسول سے قبل دنیا کے جو حالات تھے ان کا مطالعہ کریں تو اس بات کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔ اجتماعی زندگی اور صالح معاشرت کے لیے دنیا کی اقوام کے پاس اولاً تو اصول وضوابط ہی نہیں تھے اور اگر کسی قوم نے کچھ اصول بنائے بھی تھے تو ان میں بھید بھاؤ زیادہ تھا۔ اہل قوت وطاقت کے لیے الگ اصول تھے اور کمزوروں کے لیے الگ اصول تھے۔ سب سے زیادہ ظلم کی شکار عورت تھی کہ اسے دنیا میں پیدا ہونے کے لائق ہی نہیں سمجھا جاتا تھا اور اگر کسی سماج میں بچی کی پیدائش معیوب نہیں تھی تب بھی ان پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے جاتے تھے۔

جنگ وجدال اور قتل وقتال کا بازار ہر طرف گرم رہتا تھا اور ایک بار جہاں جنگ کی آگ بھڑک گئی تو پھر سرد ہونے کا نام نہیں لیتی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے ہزاروں ہزار کو تہِ تیغ کرنے میں کسی کو ذرہ برابر بھی جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ہر طرف ظلم وزیادتی کا دور دورہ تھا۔ جبر وتشدد اور وحشت وبربریت نے چاروں طرف ڈیرے ڈال رکھے تھے۔

ان معاملات میں سب سے بری حالت عرب کی تھی، جاہلیت اور نفس پرستی کی وجہ سے ان کی اخلاقی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ شراب نوشی، عورتوں کا برہنہ ہوکر ناچنا، بچیوں کو زندہ

دفن کر دینا، لا تعداد بیویاں رکھنا، والد کے انتقال کے بعد دیگر چیزوں کے ساتھ ساتھ اپنی ماؤں کو بھی آپس میں بانٹ لینا اور اپنی بیویاں بنا کر رکھنا یا پھر کسی کے ہاتھوں بیچ دینا عام رواج تھا۔ بعض قبیلوں کا پیشہ ہی چوری، لوٹ مار اور قتل و غارت گری تھا۔ بے حیائی اس حد تک عام تھی کہ حج کے موقع پر ہزاروں لوگ جمع ہوتے لیکن قریش کے سوا سب مرد اور عورتیں برہنہ طواف کرتے۔ یتیموں کا مال کھانا اور غریبوں کو ستانا عام تھا۔ معاشی زندگی میں سود کا نظام رائج تھا۔ عورتوں اور بچوں تک کو گروی رکھ دیا جاتا۔ اپنی زبان دانی پر فخر کا حال یہ تھا کہ وہ ہر غیر عرب کو عجم (گونگا) کہا کرتے تھے۔

دنیا کی مختلف قوموں کے حالات

بعثتِ رسول سے پہلے روم اور ایران دو سوپر پاور (Super Power) ممالک تھے۔ سوپر پاور ہونے کی حیثیت سے یہ دونوں ممالک انسانوں کی فلاح وارتقا کی فکر کو پس پشت ڈال کر کمزور ممالک کو غلامی کے شکنجے میں کسنے کی کوشش میں ہمہ وقت مصروف تھے۔ عوام کے خون پسینے کی کمائی سے حکمراں اپنے عشرت کدے سجاتے تھے اور عوام پر جانوروں سے بدتر سلوک کرتے تھے۔

رومیوں کے اعلیٰ طبقات نے زمینوں پر قبضہ جما کر غلاموں کی کثیر تعداد کو کھیتی باڑی پر لگا رکھا تھا، جن پر وہ وحشیانہ سلوک کرتے تھے۔ رومی معاشرہ وحشت، درندگی اور بربریت کی علامت بن چکا تھا۔ حاکم اور محکوم کے دو طبقے وجود میں آ چکے تھے۔ ایک طبقہ اُمرا کا تھا جس کا مقصد عوام پر حکومت کرنا تھا اور دوسرا عوام کا محکوم طبقہ تھا جو نسل در نسل حکمراں طبقے کی خدمت بجا لا رہا تھا۔

چوتھی صدی عیسوی تک نصرانی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات سے بہت دور ہو

چکے تھے۔ یونانی خرافات سے لے کر رومی بت پرستی تک ہر برائی کو عیسائی دنیا نے اپنے گلے سے لگا رکھا تھا۔ عیسائی مذہب محض چند بے جان عقائد و مراسم تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔

براعظم ایشیا، یورپ اور افریقہ میں بسنے والے یہودی دنیا کی دیگر تمام اقوام سے اس لحاظ سے ممتاز تھے کہ ان کے پاس آسمانی دین کا بہت زیادہ علم تھا لیکن یہ یہودی دیگر وجوہات کی بنا پر مذہب و سیاست اور تہذیب و تمدن میں وہ مقام نہیں رکھتے تھے کہ دوسروں پر زیادہ اثر انداز ہو سکیں۔ دولت کی ہوس، غرور، تکبر، ہوس پرستی، نسبی تکبر اور قومی غرور کی وجہ سے ان کے اندر مخصوص ذہنیت پیدا ہو گئی تھی جو انھیں عوامی سطح پر آنے سے روکتی تھی۔ راہِ حق سے لوگوں کو منع کرنا ان کی فطرتِ ثانیہ تھی۔

یہودیوں اور عیسائیوں کی باہمی دشمنی چھٹی صدی عیسوی کے اخیر تک بامِ عروج پر تھی۔ ایک دوسرے کو ذلیل و رسوا کرنے، ایک دوسرے کا خون بہانے اور غلبہ پانے کے بعد ایک دوسرے کے ساتھ غیر انسانی سلوک میں انھیں بالکل عار محسوس نہیں ہوتی تھی۔

یہود (بنی اسرائیل) کے حالات

حضرت یعقوب علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے صاحبزادے یہودا کی اولاد ہی دراصل یہود ہیں، لیکن اب یہود بولا جاتا ہے تو اس سے مراد بنی اسرائیل کے تمام بارہ قبیلے ہوتے ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دورِ نبوت ہی میں یہودی بت پرستی اور بے دینی میں ملوث ہو گئے تھے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے بُخت نصر کو ان پر مسلط فرمایا، اس نے ان کو ختم کرنا اور طرح طرح کی ایذائیں دینا شروع کر دیا۔ اس کے بعد سے یہ مسلسل قید و بند، جلا وطنی، غلامی اور مظلومی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔ جب قسطنطین اول نے عیسائی مذہب اختیار کیا اس کے بعد سے ان کی حالت بد سے بدتر ہو گئی۔ دنیا کے کسی بھی ملک

میں نام کو بھی ان کی سلطنت باقی نہ رہ گئی تھی اور انھیں بحیثیت قوم کہیں تسلیم نہیں کیا جاتا تھا، کسی بھی ملک میں انھیں آزاد شہریوں کی طرح زندہ رہنے کا حق حاصل نہیں تھا ''مَلْعُوْنِیْنَ اَیْنَمَا ثُقِفُوْا'' کے مطابق دنیا میں ہر جگہ وہ ذلت و رسوائی کی زندگی گزار رہے تھے، دینی ابتری کا یہ عالم تھا کہ کئی فرقوں میں بٹ چکے تھے۔

حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے عہد پاک سے لے کر حضرت عیسیٰ روح اللہ علیہ السلام کے دورِ نبوت تک جتنے انبیاے کرام اور رسولانِ عظام تشریف لائے یہ ان سب کی تکذیب اور ان کی ایذا رسانی میں ہمیشہ مصروف رہے۔ انھوں نے اللہ کی نازل کردہ کتابوں کا نہ صرف انکار کیا بلکہ ان میں تبدیلی اور تحریف کے جرم عظیم کے مرتکب ہوئے۔ ان کے درمیان رہنمائی کے لیے حقیقتاً اللہ کی کوئی کتاب تو نہ رہ گئی تھی اس لیے وہ اپنے اَحبار (دینی پیشواؤں) کی من گڑھت خبروں اور ان کے خود ساختہ فتووں ہی پر اعتبار کرتے تھے۔ وہ جو حرام کہتے اسے حرام سمجھتے اور جسے حلال بتاتے اسے حلال سمجھتے۔ مُردار خوری، سودی لین دین اور دیگر محرماتِ الٰہیہ کا علانیہ ارتکاب کرتے۔ اسے قرآنِ مقدس نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ○ (سورۂ نساء، آیت:۱۶۱)

ترجمہ: اور (ان پر لعنت کی) اس لیے کہ وہ سود لیتے حالاں کہ وہ اس سے منع کیے گئے تھے اور لوگوں کا مال ناحق کھا جاتے اور ان میں جو کافر ہوئے ہم نے ان کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ (کنزالایمان)

ان کے انھی تمام اعمالِ قبیحہ کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے انھیں ذلت وخواری کے

دردناک عذاب میں مبتلا فرما دیا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس قوم کی ہدایت کے لیے پے در پے انبیا ورسل بھیجے تھے لیکن بنی اسرائیل نے نہ کبھی ان کی تعظیم کی نہ ہی ان کی امداد وتعاون کیا بلکہ کئی انبیاے کرام مثلاً حضرت زکریا، حضرت یحییٰ، حضرت شعیا وغیرہم علیہم السلام کو ناحق قتل بھی کیا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کی اس بدترین تاریخ کو یوں بیان فرماتا ہے:

وَضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ وَالۡمَسۡكَنَةُ وَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ كَانُوۡا يَكۡفُرُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقۡتُلُوۡنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيۡرِ الۡحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوۡا وَّكَانُوۡا يَعۡتَدُوۡنَ ۝ (سورۂ بقرہ، آیت:۶۱)

ترجمہ: اور ان پر مقرر کر دی گئی خواری اور ناداری اور خدا کے غضب میں لوٹے۔ یہ بدلہ تھا اس کا کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے اور انبیا کو ناحق شہید کرتے۔ یہ بدلہ تھا ان کی نافرمانیوں اور حد سے بڑھنے کا۔ (کنز الایمان)

نصاریٰ (عیسائیوں) کے حالات

حضرتِ عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام نے بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں کے سامنے رُشد وہدایت کی تعلیم کے لیے اپنے بارہ شاگرد (حواری) منتخب فرمائے تھے۔ آپ نے کماحقہٗ انھیں علم وحکمت سے نوازا، لیکن آپ کے آسمان پر تشریف لے جانے کے بعد ان کے درمیان سخت اختلافات پیدا ہو گئے جس سے کئی فرقے پھوٹ گئے۔ اس فرقہ بندی میں بولص نام کے یہودی نے خاص کر اہم رول ادا کیا، یہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے حواریوں کو تکلیفیں دیتا تھا، لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب آسمان پر اٹھا لیے گئے تو یہ عیسائی بن کر گمراہ کرنے میں مصروف ہو گیا جس کی وجہ سے حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکار کئی فرقوں میں منقسم ہو گئے اور ہر فرقے نے آپ کے تعلق سے الگ الگ عقیدہ بنا لیا۔

حضرت صدر الا فاضل علیہ الرحمہ سورۂ نساء، آیت: ۱۷۱ کے تحت لکھتے ہیں:

نسطوری آپ کو خدا کا بیٹا کہتے تھے، مرقوسی کہتے کہ وہ تین میں کے تیسرے ہیں اور اس کلمہ کی توجیہات میں بھی اختلاف تھا۔ بعض تین اُقنوم مانتے تھے اور کہتے تھے کہ باپ، بیٹا، روح القدس۔ باپ سے ذات، بیٹے سے عیسیٰ، روح القدس سے ان میں حلول کرنے والی حیات مراد لیتے تھے۔ تو ان کے نزدیک الٰہ تین تھے اور اس تین کو ایک بتاتے تھے، "تَوْحِيد فِي التَّثْلِيث" اور "تَثْلِيث فِي التَّوْحِيد" کے چکر میں گرفتار تھے۔ بعض کہتے تھے کہ عیسیٰ ناسوتیت اور الوہیت کے جامع ہیں، ماں کی طرف سے ان میں ناسوتیت آئی اور باپ کی طرف سے الوہیت آئی۔ العیاذ باللہ تعالیٰ!

قرآن مقدس ان کی ان بدعقیدگیوں کو بیان کر کے یوں مذمت فرماتا ہے:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ۔

(سورۂ مائدہ، آیت: ۷۲)

ترجمہ: بے شک کافر ہیں وہ جو کہتے ہیں کہ اللہ وہی مسیح مریم کا بیٹا ہے۔

ایک مقام پر فرمایا:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ۔ (سورۂ مائدہ، آیت: ۷۳)

ترجمہ: بے شک کافر ہیں وہ جو کہتے ہیں اللہ تین خداؤں میں کا تیسرا ہے۔

ان تمام بدعقیدگیوں کے ساتھ ساتھ کفارہ کا مسئلہ عیسائیت کی جڑوں کو کھوکھلی کر رہا تھا، اس کی وجہ سے اعمالِ صالحہ سے بے رغبتی پیدا ہوگئی تھی، حضرتِ عیسیٰ کے نجات دہندہ ہونے کے عقیدہ کی آڑ میں ہر فرقہ اپنی نفسانی خواہشات کی مکمل طور پر پیروی کرتا تھا۔ اخلاق کا پورے معاشرے میں کہیں نام ونشان بھی نہ تھا، ہر کوئی خودساختہ عقائد واحکام کے ذریعے

اپنی خواہشات کی تکمیل میں آزاد تھا۔ ان میں سے بعض کا یہ خیال تھا کہ حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام کے صدقے سرے سے انھیں عذاب میں گرفتار ہی نہیں کیا جائے گا اور بعض لوگ یہودیوں کی طرح یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ صرف چند دنوں کے لیے وہ عذاب میں گرفتار ہوں گے، اس کے بعد انھیں ہمیشہ کے لیے جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔

مجوسیوں کے حالات

یافث بن نوح علیہ السلام کی اولاد میں ایک شخص پیدا ہوا جس کے کان پیدائشی طور پر بہت چھوٹے اور بال بہت لمبے تھے، اس وجہ سے اس کا نام میخ گوش رکھا گیا جو عربی میں لفظ مجوس سے متعارف ہوا، اس مذہب کا اصل بانی یہی ہے۔ اس نے اپنے آپ کو اوتار (آسمانی پیغمبر) کہنا شروع کیا اور لوگوں کو بتایا کہ آگ مظہرِ الٰہی ہے۔ لوگوں سے آگ منگوایا کرتا جس سے وہ لوگوں میں آگ والا نبی مشہور ہوا۔ اس نے لوگوں کو بتایا کہ آگ ہی روشنی کی خالق ہے اور اندھیرا ظلمت کا خالق ہے، اس طرح آگ اور اندھیرا یہ دونوں اس دین کے خالق کی حیثیت قرار پائے۔ آگ کو لوگ طاقت اور نیکی کا سرچشمہ اور ظلمت کو بدی کا خالق سمجھنے لگے۔ جب آگ کے شعلے بلند ہوتے تو لوگ یہ اعتقاد کرتے کہ خالق جاگ رہا ہے اور انگاروں کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے کہ خالق سو رہا ہے۔ رات دن آتش کدے میں لکڑیاں جلائی جاتیں، دن میں خوشبودار لکڑیاں اور رات میں صندل سے ابتدا کرتے اور پھر عام لکڑیاں جلاتے۔

مجوس بابل کا رہنے والا تھا پھر یہ مذہب ایران میں آیا، پہلے تو اسے عوامی مذہب کی حیثیت حاصل رہی بعد میں ایرانی بادشاہ گستاشپ نے اسے قانونی حیثیت دے کر حکومت کا

مذہب بنا دیا۔ اس بادشاہ کا ایک بڑا وزیر زرتشت تھا، اس نے اس مذہب کے پیغمبر ہونے کا دعویٰ کیا اور ایک بہت بڑا آتش کدہ بنوایا جس کی پوجا سارے لوگوں سے کرواتا تھا۔ عبادت کے لیے بدھ کا دن مقرر تھا۔ لوگ اس کے حکم سے اس آتش کدے کے آگے سجدے کرتے اور اس کے سامنے کھڑے ہو کر ہاتھ باندھے دعائیں کرتے۔

اس نے ایک مذہبی کتاب بھی بنائی جس کا نام آرتھا رکھا۔ پہلے سے جو مجوسی مذہب چلا آ رہا تھا اس میں کچھ اضافے کیے اور کچھ پابندیاں بڑھائیں، اسی وجہ سے اسے مجوسی مذہب کے بانی دوم کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ سو سال تک زندہ رہا، اس کے بعد اس مذہب کو خوب تقویت اور شہرت ملتی رہی یہاں تک کہ یہ مذہب روما اور امریکہ تک جا پہنچا۔ اس کا تیسرا بانی ہیراک لیٹسل (Herak Latsel) ہے۔ (ماخوذ از سیرت ضیاء النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

اس مذہب کے پیروکار داڑھی منڈانا مذہب کی پیروی سمجھتے، موچھیں بڑی رکھتے، سر کے بال کانوں تک لمبے کرتے، ننگے سر رہتے اور کمر پر زُنّار لٹکاتے۔

یونانیوں کے حالات

یونان ۱۶۰۰ قبل مسیح میں ایک نیم وحشی ملک تھا۔ یونانی تہذیب وتمدن کے دو بنیادی رجحان فلسفہ اور سائنس تھے جو بعد میں یورپی اقوام کی مادی ترقی کا باعث بنے۔ اس تہذیب میں عورت کو صرف اپنی نفسانی تسکین اور مسرت کا ذریعہ اور آلۂ کار سمجھا جاتا تھا، یونانیوں کے نزدیک عورت کو ''شجرۂ مسموم'' یعنی ایک زہر آلود درخت کہا جاتا تھا۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ عورت شیطان سے زیادہ ناپاک ہوتی ہے اور وہ اسے فطرتاً معیوب، حاسد، بدکردار، آوارہ اور بدگفتار خیال کرتے تھے۔ (ماخوذ از سیرت ضیاء النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

ایرانیوں کے حالات

تہذیب وتمدن کے ابتدائی مراکز میں سے جنوب مغربی ایران کا علاقہ خاص اہمیت کا حامل تھا۔خلیج فارس سے ملا ہوا یہ علاقہ قدیم زمانے میں ''علام'' کے نام سے مشہور تھا۔ ظہورِ اسلام کے وقت ایران اپنے لشکر اور تہذیب کے اعتبار سے سوپر پاور مانا جاتا تھا۔

ظہورِ اسلام سے کچھ پہلے جہالت کی جو آندھی دنیا میں چل رہی تھی، ایران بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا۔اس کی اخلاقی بنیادیں متزلزل ہو چکی تھیں۔فکری اور نظری زوال وانحطاط ایرانیوں کی سوچوں پر غالب تھا۔چھٹی صدی عیسوی میں بہرام ایران کا حکمراں تھا،اس نے اپنی بہن ہی سے ازدواجی تعلق قائم کر رکھا تھا۔

علامہ ابن جریر تحریر فرماتے ہیں:

كَانَتْ لِبَهْرَامَ أُخْتٌ يُقَالُ لَهَا كُرْدِيَةُ مِنْ أَتَمِّ النِّسَآءِ وَأَكْمَلِهِنَّ وَكَانَ تَزَوَّجَهَا۔ (تاریخ الطبری، جلد دوم، ص:۱۷۸)

ترجمہ: بہرام کی ایک بہن تھی جس کا نام کُردِیہ تھا، جو بڑی خوبصورت اور کامل ترین تھی، اس نے اس سے شادی کر لی تھی۔

مزدک بادشاہ کے تعلق سے مروی ہے:

وَكَانَ مَزْدَكُ يَنْهَى النَّاسَ عَنِ الْمُخَالَفَةِ وَالْمُبَاغَضَةِ وَالْقِتَالِ وَلَمَّا كَانَ أَكْثَرُ ذٰلِكَ إِنَّمَا يَقَعُ بِسَبَبِ النِّسَآءِ وَالْأَمْوَالِ أَحَلَّ النِّسَآءَ وَأَبَاحَ الْأَمْوَالَ وَجَعَلَ لِلنَّاسِ شِرْكَةً فِيهِمَا كَاشْتِرَاكِهِمْ فِي الْمَاءِ وَالنَّارِ وَالْكَلَإِ۔ (الملل والنحل، حصہ دوم، ص:۵۴)

ترجمہ: مزدک لوگوں کو آپس میں جھگڑا لڑائی، ایک دوسرے سے بغض رکھنے اور جنگ وجدال سے منع کرتا تھا۔ اس نے دیکھا کہ یہ چیزیں زیادہ تر عورتوں اور اموال کی وجہ سے ہوتی ہیں تو اس نے ساری عورتوں کو سب کے لیے حلال قرار دے دیا اور سب کے اموال کو سب کے لیے مباح قرار دے دیا۔ عورتوں اور اموال میں لوگوں کے لیے ایسے ہی شرکت جاری کردیا جیسے پانی، آگ اور گھاس میں لوگوں کی شرکت ہوتی ہے۔

اس کا نتیجہ کیا نکلا اس کے تعلق سے علامہ طبری تحریر فرماتے ہیں:

حَتّٰی کَانُوْا یَدْخُلُوْنَ عَلَی الرَّجُلِ فِیْ دَارِہٖ فَیَغْلِبُوْنَہٗ عَلٰی مَنْزِلِہٖ وَنِسَآئِہٖ وَاَمْوَالِہٖ لَا یَسْتَطِیْعُ الْاِمْتِنَاعَ مِنْھُمْ۔ (تاریخ الطبری، جلد دوم، ص: ۹۳)

ترجمہ: یہاں تک کہ وہ کسی کے بھی گھر میں گھس جاتے، اس کے مال اور اس کی عورت پر قبضہ کر لیتے اور وہ انھیں روک نہیں سکتا تھا۔

عیاش اور بدمست لوگوں نے مزدک کی تحریک کو خوب پروان چڑھایا اس لیے کہ اس تحریک کو سرکاری سرپرستی بھی حاصل تھی۔

ہندوستانیوں کے حالات

ہندوستان بھی ثقافتی اور تہذیبی سطح پر زوال کا شکار تھا۔ ہندوستان میں ہندومت نے بدھ مت کو اپنے اندر ضم کرلیا اور اپنی جنم بھومی سے بدھ مت کا نام ونشان مٹا گیا۔ بدھ مت پر ہندومت اس حد تک غالب آچکا تھا کہ بدھ کے ملک کی صورتحال بھی قابلِ رشک نہ تھی۔ ان کے پاس نہ کوئی سیاسی نظام تھا اور نہ کوئی علمی روایت۔ یہ لوگ بت پرستی کی طرف مائل تھے۔ ہندوستان ذات پات کی حد بندیوں میں جکڑا ہوا تھا اور غیر انسانی بنیادوں پر انسانوں کو چار طبقات میں تقسیم کردیا گیا تھا۔

برہمن کی حاکمیت قائم کرنے کے لیے ہر ناجائز فعل کو جائز قرار دے دیا گیا تھا اور برہمنی سامراج کی گرفت سماج پر اتنی مضبوط تھی کہ برہمنوں کی مرضی کے بغیر حکمران بھی کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے تھے۔ جنسی خواہشات اور شہوانی جذبات کو ابھارنے والے عناصر جس قدر ہندوستان کی قدیم تہذیب وتمدن میں تھے کسی دوسرے ملک میں نہیں پائے جاتے تھے۔ برہمنی سامراج میں عورت انتہائی کسمپرسی کے دن بسر کر رہی تھی۔ مرنے والے شوہر کے ساتھ اسے بھی جل مرنا ہوتا یا ساری عمر بیوگی کی زندگی بسر کرتی اور اسے ساری زندگی طعنے سن سن کر گزارنی ہوتی۔ جہالت اور توہم پرستی نے ذہن انسانی کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔

بدھ مذہب کے ختم ہونے کے بعد ہندوستانی کئی فرقوں میں بٹ گئے اور ملک بھر میں سیکڑوں دیوتاؤں کی پرستش ہونے لگی۔ کوئی بجلی اور پانی کو پوجتا، کوئی درخت، سانپ، بندر، گائے وغیرہ کی پرستش کرتا، کوئی اینٹوں اور پتھروں کو اپنا خدا مانتا۔ اس ملک میں انسانیت چار طبقوں میں منقسم تھی، برہمن، چھتری، ویش اور شودر۔ شودروں کے ساتھ نہایت ہی غیر انسانی سلوک برتا جاتا، کسی شودر کو برہمن کے گھاٹ سے پانی پینے کا حق حاصل نہیں تھا، شراب، جوا اور بدکاری کو مذہب کا لباس پہنا دیا گیا تھا۔ (ماخوذ از سیرت ضیاء النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم)

رومیوں کے حالات

رومی سلطنت اپنے زمانے کی دوسری سپر پاور تھی۔ یہ اپنے وقت میں دنیا کی سب سے بڑی حکومت تھی جو بحیرۂ روم کے چاروں طرف تین براعظموں پر پھیلی ہوئی تھی۔ رومی ایک جاندار اور شاندار تہذیب کے وارث تھے۔ صنعت وحرفت میں بھی رومی اپنی مثال آپ تھے اور صحیح معنوں میں ایک سپر پاور تھے۔ رومی تہذیب یونانی کلچر سے متاثر تھی۔ رومیوں نے مقامی تہذیبوں کے ملاپ سے ایک نئے تمدن کی بنیاد رکھی مگر اخلاقی اور قومی سطح پر رومی

تہذیب بتدریج زوال کا شکار تھی۔

اہلِ عرب کے حالات

عرب کی حالت دنیا کے تمام ممالک سے بدترین تھی، اہل حجاز مذہبی اعتبار سے اپنے رشتے کو حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام سے فخریہ منسلک کرتے، ویسے تو حضرت ابرہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے مذہب کی کچھ رسمیں عربوں میں رائج تھیں، یہ اور بات ہے کہ ان رسموں کی شکلیں مسخ ہو چکی تھیں اور ان کے انداز تبدیل ہو گئے تھے۔ مثلاً ملتِ ابراہیمی کی طرح یہ لوگ بھی حج کرتے لیکن ننگے ہو کر، ان کی طرح یہ لوگ بھی قربانی دیتے۔ مہمان نوازی اور وعدہ وفا کرنے میں بھی اپنی مثال آپ تھے۔ ان کے علاوہ کچھ اور اچھائیاں بھی عربوں میں تھیں، لیکن اگر ان میں موجود بُرائیوں پر نظر کی جائے تو اچھائیاں بالکل ہی معدوم نظر آتی ہیں۔

بدکاری، زنا کاری اور دوسرے قبیح افعال پر نادم ہونے کے بجائے فخر کیا کرتے تھے اور اشعار کے ذریعے انھیں مشہور کرتے۔ شراب نوشی اور دیگر نشیلی چیزیں ان میں عام تھیں، انھیں کوئی عیب کی نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا۔ باندیاں اور لونڈیاں رقص و سرود کے لیے پالی جاتی تھیں، ان سے زنا کا کاروبار چلتا تھا اور آمدنی ان کے مالک لے لیتے تھے۔ عورتیں اور بچے اپنے والدین اور دیگر رشتے داروں کی وراثت سے قطعاً محروم تھے، صرف بالغ مردوں ہی کو وارث سمجھا جاتا تھا۔

اگر کسی کا شوہر مر جاتا تو اس پر اس کا کوئی بھی قریبی رشتے دار حتّٰی کہ خود اس کا سوتیلا بیٹا حق جما کر اپنی زوجیت میں شامل کر لیتا اور اس میں عورت کی رضامندی کو ہرگز ملحوظ نہ رکھا جاتا۔ بے پردگی اور جسم کی نمائش سارے معاشرے میں عام تھی، بڑی ہی بے حیائی کے

ساتھ عورتیں اپنے جسم کی نمائش کرتیں۔ شریف خاندانوں کا حال یہ تھا کہ اپنی لڑکیوں کو زندہ زمین میں دفن کر دیتے یا گہرے کنوؤں میں ڈھکیل کر ہلاک کر دیتے، اس پر فخر بھی کیا جاتا اور اسے شرافت بھی سمجھا جاتا تھا۔ جوا بازی محبوب مشغلہ تھا اور جگہ جگہ جوا خانے موجود تھے۔ توہم پرستی اور خبیث روحوں کا اعتقاد عام تھا۔

کئی خیالی دیوتا اور دیویاں بنا لی گئی تھیں، ان کی عجیب عجیب صورتیں اور شکلیں متعین کی جاتیں اور انھی کے مطابق بُت بنائے جاتے۔ ہر قبیلے کا تقریباً اپنا اپنا الگ بُت تھا، تقریباً سارا عرب بُت پرستی کا شکار تھا، بتوں کو سجدہ کیا جاتا، ان سے منّتیں مانی جاتیں، ان کے لیے اونٹ، گائے بکری وغیرہ کی قربانیاں پیش کی جاتیں۔ ہُبل، وُد، سُواع، یغوث، یعوق، نسر، لات، منات، عُزیٰ، دوار، اساف، نائلہ، عبعب اور ان جیسے سیکڑوں بُتوں کو اہلِ عرب اپنا خُدا مانتے تھے۔

معمولی معمولی باتوں پر جنگیں چھڑ جاتیں اور برسوں تک ایک دوسرے کا خون بہایا جاتا۔ ایک بار جنگ چھڑ گئی تو کئی نسلوں تک ان کا اثر باقی رہتا۔ حسب ونسب پر بہت فخر کیا جاتا، ہر قبیلہ دوسرے قبیلے کو حقیر و ذلیل سمجھتا اور ایک دوسرے کو رسوا کرنے کی کوشش میں لگا رہتا۔ خیبر میں آباد یہود و نصاریٰ اگر چہ اپنے آپ کو اہل کتاب کہتے تھے لیکن ان کی حالت دیگر عربوں سے زیادہ مختلف نہ تھی۔ (ماخوذ از سیرت ضیاء النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

یہ دنیا کی مشہور قوموں کے حالات تھے، ان کے علاوہ درجنوں اقوام اور تہذیبیں دنیا میں موجود تھیں جن میں بے راہ روی اور جبر و ظلم کو قانونی حیثیت حاصل تھی۔ ایسے حالات میں دنیا کو کفر و ضلالت اور ظلم و جبر کی گھٹا ٹوپ تاریکی سے باہر نکالنے کے لیے، امن و امان کا ماحول دنیا میں قائم کرنے کے لیے اور ساری کائنات کو اعضائے یک دیگر بنانے کے لیے

رؤوف ورحیم خدا نے اپنے رؤف ورحیم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔ ؎

جہاں تاریک تھا، ظلمت کدہ تھا، سخت کالا تھا

کوئی پردے سے کیا نکلا کہ گھر گھر میں اجالا تھا

آپ نے وہ عظیم انقلاب برپا کیا کہ جس کے نورانی اثرات سے ساری دنیا، خصوصًا عرب سے بُرائی اور بدعملی کا دورا پنے انجام کو پہنچا اور گمراہی اور بے دینی کا سدباب ہوگیا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کا ذکر اس طرح فرمایا:

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۟ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰۗئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ (سورۂ اعراف، آیت:۷-۱۵۷)

ترجمہ: وہ جو غلامی کریں گے اس رسول بے پڑھے غیب کی خبریں دینے والے کی جسے لکھا ہوا پائیں گے اپنے پاس توریت اور انجیل میں وہ انھیں بھلائی کا حکم دے گا اور بُرائی سے منع فرمائے گا اور ستھری چیزیں ان کے لیے حلال فرمائے گا اور گندی چیزیں ان پر حرام کرے گا اور ان پر سے وہ بوجھ اور گلے کے پھندے جو ان پر تھے اتارے گا، تو وہ جو اس پر ایمان لائیں اور اس کی تعظیم کریں اور اسے مدد دیں اور اس نور کی پیروی کریں جو اس کے ساتھ اُترا وہی بامراد ہوئے۔ (کنزالایمان)

چھٹا باب

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ساری مخلوقات کے لیے امن کے ضامن

آقائے کونین محمد عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی دنیا میں جلوہ گری ایسے ماحول میں ہوئی تھی جب اس دنیا میں امن اور سکون صرف لفظ کی حیثیت سے باقی رہ گئے تھے، ان کی معنویت بالکل ختم ہوگئی تھی۔ زمانے کے حالات اس بات کا تقاضا کررہے تھے کہ کوئی آئے جو ان کے درد کا مداوا بنے، ان کے دلوں کو دلاسا دے، کمزوروں کا پرسانِ حال ہو، مظلوموں کو حقوق دلانے والا ہو اور ظلم و جبر کے سائے میں زندگی کے شب و روز گزارنے والوں کے لیے امن کا علم بردار ہو۔ وقت اور حالات کے اس تقاضے کو پورا کرنے کے لیے جس ذات کی جلوہ گری ہوئی وہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے۔

قرآنِ مقدس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ساری کائنات کے لیے رحمۃٌ للعالمین قرار دیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ ○ (سورۂ انبیاء، آیت: ۱۰۷)

ترجمہ: اور ہم نے تمھیں نہ بھیجا مگر رحمت سارے جہان کے لیے۔ (کنزالایمان)

اسی رحمت کا نتیجہ تھا کہ ۲۳ سالہ قلیل مدت میں اس شمع رسالت کے گرداگرد پروانوں کا ہجوم لگ گیا اور رنگ ونسل کی زنجیروں کو توڑ کر لوگ ان کے اردگرد جمع ہو گئے۔ قرآن مقدس نے ارشاد فرمایا:

فَبِمَا رَحۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنۡتَ لَهُمۡ وَلَوۡ كُنۡتَ فَظًّا غَلِيۡظَ الۡقَلۡبِ لَانۡفَضُّوۡا

مِنۡ حَوۡلِكَ ۠ فَاعۡفُ عَنۡهُمۡ وَاسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ وَشَاوِرۡهُمۡ فِي الۡاَمۡرِ ۚ فَاِذَا عَزَمۡتَ فَتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ ۔ (سورۂ آل عمران، آیت:۱۵۹)

ترجمہ: تو کیسی کچھ اللہ کی مہربانی ہے کہ اے محبوب تم ان کے لیے نرم دل ہوئے اور اگر تند مزاج سخت دل ہوتے تو وہ ضرور تمھاری گرد سے پریشان ہو جاتے۔ تو تم انھیں معاف فرماؤ اور ان کی شفاعت کرو اور کاموں میں ان سے مشورہ لو اور جو کسی بات کا ارادہ پکا کر لو تو اللہ پر بھروسہ کرو۔ (کنز الایمان)

ان آیتوں سے پتہ چلا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سراپا رحمت تھے۔ سزا دینا تو دور، سرزنش اور ڈانٹ پھٹکار اور طعن و تشنیع کا لفظ بھی نہ کہنا بلکہ لطف و کرم اور محبت و شفقت سے پیش آنا محض رحمتِ الٰہی کی جلوہ نمائی ہی تو تھی جس سے اس نے اپنے محبوب کو متصف فرمایا تھا۔ اگر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا حوصلہ اتنا وسیع، رحمت اتنی عام اور عفو و حلم اتنا بے پایاں نہ ہوتا تو حق کے متلاشیوں کا اتنا جمگھٹا کیسے ہوتا، لوگوں سے قصور ہو جاتا تو کچھ شرم کے مارے اور کچھ خوف سے دور بھاگ جاتے، پھر کرم بالائے کرم یہ کہ حق تعالیٰ نے نہایت عجیب وغریب پیرائے میں ان کی سفارش کی۔ اپنے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو فرمایا کہ ان سے جو غلطی ہو گئی ہے اسے خود بھی معاف کر دیجیے اور میری جناب میں بھی شفاعت کیجیے کہ میں بھی ان سے راضی ہو جاؤں۔ سبحان اللہ! کیا شان ہے صحابۂ کرام کی اور کتنا بلند مقام ہے کہ ان کے نبی مکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا اور کیا کہنے مولائے کریم کی رحمت کے جو اس نے اپنے محبوب اور اس کے ذریعے اپنی سب مخلوق پر کی۔ (ضیاء القرآن)

خالق کائنات کی نظر میں رحمت کی اس قدر اہمیت ہے کہ اس نے اس صفت سے متصف ہونے اور ظلم و زیادتی سے باز رہنے کی بارہا ترغیب دلائی ہے۔ اسی طرح باہمی

ہمدردی اور مہربانی کرنے والوں کو بے پناہ بشارتوں سے نوزا ہے۔

چند مثالیں ملاحظہ کرتے چلیں:

اسلام میں کوئی زبردستی نہیں ہے

تاریخ یہی رہی ہے کہ جب بھی کسی قوم نے غلبہ پایا ہے تو اپنے اصول وضوابط اور اپنے رسوم ورواج منوانے کے لیے لوگوں پر زبردستی کیا ہے۔ جس نے طوعاً یا کرہاً مانا ہے اسے جان کی امان ملی مگر اس کی پوری زندگی بلکہ اس کی کئی کئی نسلوں کی زندگی جابرانہ اصول وضوابط کی اقتدا میں تباہ وبرباد ہوگئی۔ صرف مذہب اسلام ہے جس کے اصول میں یہ ہے:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۔ (سورۂ بقرہ، آیت:۲۵۶)

ترجمہ: کچھ زبردستی نہیں دین میں، بے شک خوب جدا ہوگئی ہے نیک راہ گمراہی سے۔

اسلام کی پوری تاریخ میں تلوار کے زور پر کبھی تبلیغ نہیں کی گئی۔ ابتداے اسلام سے اب تک اسلام میں داخل ہونے والوں کے لیے سبب یہی بنا کہ انھوں نے اسلام کے محاسن کو سمجھا، پھر یہ پایا کہ اس سے بہتر کوئی دین ہو ہی نہیں سکتا۔

تبلیغ اسلام میں حکمت اور موعظت حسنہ

سید عالم داعیِ برحق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو جہاں تبلیغ احکام کی تعلیم دی گئی وہاں یہ اصول بھی اسلام کی تبلیغ کے لیے بنا دیا گیا:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۔ (سورۂ نحل، آیت:۱۲۵)

ترجمہ: اپنے رب کی راہ کی طرف بلاؤ پکی تدبیر اور اچھی نصیحت سے اور ان سے اس طریقے پر بحث کرو جو سب سے بہتر ہو۔ (کنز الایمان)

پکی تدبیر سے وہ دلیلِ محکم مراد ہے جو حق کو واضح اور شبہات کو زائل کر دے اور اچھی نصیحت سے ترغیبات وترہیبات مراد ہیں۔ بہتر طریق سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی آیات اور دلائل سے بلائیں۔

معبودانِ باطلہ کو بھی برا بھلا کہنے سے ممانعت

قوی دلائل و براہین سے یہ بات بالکل ثابت ہو چکی تھی کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اس کے باوجود دنیا میں ہزاروں لوگ تھے جو معبودانِ باطلہ کی پرستش میں لگے ہوئے تھے۔ تبلیغ کے ضوابط میں سے ایک ضابطہ یہ بھی تھا:

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللهِ فَيَسُبُّوا اللهَ عَدْوًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ۔ (سورۂ انعام، آیت: ۱۰۸)

ترجمہ: اور انھیں گالی نہ دو جن کو وہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں کہ وہ اللہ کی شان میں بے ادبی کریں گے زیادتی اور جہالت سے۔ (کنز الایمان)

اس لیے کہ انسان جس سے عقیدت رکھتا ہے بھلے وہ حق پر نہ ہو پھر بھی اس کی برائی برداشت نہیں کر پاتا ہے۔ نتیجے کے طور پر اشتعال انگیزی ہوتی ہے اور امن وسکون غارت ہو جاتا ہے۔ اسی لیے مسلمانوں کو منع کیا گیا کہ کفار کے معبودان باطلہ کو برا بھلا کہیں۔

مسلمان وہی ہے جو امن وسلامتی کا علمبردار ہے

یہی وجہ ہے کہ اسلام کے بنیادی اصول میں سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے امن اور سلامتی کو شامل فرمایا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِہٖ وَيَدِہٖ۔

(صحیح البخاری، حصہ اول، ص:۱۱)

ترجمہ: مسلم وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان سلامت رہیں۔

مومن کون ہے؟

اسی طرح احادیثِ پاک میں مومن کی جو تعریف کی گئی ہے ایک حدیث میں اس کے الفاظ یہ ہیں:

اَلْمُؤْمِنُ مَنْ اٰمِنَهُ النَّاسُ عَلٰى اَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ۔

(سنن ابن ماجہ، حصہ دوم، ص:۱۲۹۸)

ترجمہ: مومن وہ ہے جس سے لوگ اپنے اموال اور اپنی جانوں کو محفوظ جانیں۔

پتہ چلا کہ مومن کبھی کسی کی جان یا مال ناحق لے ہی نہیں سکتا ہے۔ اس حدیث سے یہ نتیجہ بھی آسانی کے ساتھ نکالا جا سکتا ہے کہ جو شخص کسی کا ناحق قتل کرے، کسی کو نقصان پہنچائے، کسی کا مال ہڑپ لے یا اس سے لوگ اپنی جان یا اپنے مال کو محفوظ نہ سمجھیں تو وہ درحقیقت مومنانہ صفات پر ہے ہی نہیں۔

زمین والوں پر رحم کرو

کہتے ہیں: کر بھلا تو ہو بھلا۔ یہی مفہوم حدیث پاک کے ان الفاظ سے ادا ہوتا ہے: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آقائے کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اِرْحَمْ مَنْ فِي الْاَرْضِ يَرْحَمْكَ مَنْ فِي السَّمَاءِ۔

(مستدرک للحاکم، حصہ چہارم، ص:۲۷۷)

اسی کی ترجمانی ایک شاعر نے ان الفاظ میں کی ہے ؎

کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر   خدا مہرباں ہوگا عرش بریں پر

پتہ چلا کہ اللہ کی مخلوقات کے ساتھ نرمی اور مہربانی کرنا رحمتِ الٰہی کو متوجہ کرنے والا عمل ہے۔ اسی مضمون کی ایک روایت صحیح البخاری میں بھی ہے۔ حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہے کہ آقائے رؤف ورحیم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اِنَّمَا یَرْحَمُ اللّٰہُ مِنْ عِبَادِہِ الرُّحَمَاءَ۔ (حصہ دوم، ص:۷۹)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے رحم کرنے والوں پر مہربانی فرماتا ہے۔

پتہ چلا کہ اگر رحمتِ خداوندی کو اپنی طرف متوجہ کرنا ہے تو اللہ کی مخلوقات کے ساتھ نرمی اور مہربانی کا سلوک کرنا شروع کر دینا چاہیے۔

شقی کے دل میں رحم وشفقت نہیں ہوسکتی

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

سَمِعْتُ اَبَا الْقَاسِمِ الصَّادِقَ الْمَصْدُوْقَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ صَاحِبَ ھٰذِہِ الْحُجْرَۃِ یَقُوْلُ: لَا تُنْزَعُ الرَّحْمَۃُ اِلَّا مِنْ شَقِیٍّ۔

(سنن ابی داؤد، حصہ چہارم، ص:۲۸۶)

ترجمہ: میں نے سچے اور تصدیق کیے ہوئے، اس حجرۂ مقدسہ والے ابو القاسم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ صرف بد بخت کے دل سے رحم اٹھایا جاتا ہے۔

جب دل سے رحم کا مادہ اٹھالیا جاتا ہے تو پھر اس میں تنگ دلی بھر جاتی ہے، وہ شخص تنگ نظر ہوجاتا ہے اور اس کی طبیعت سخت ہوجاتی ہے جس کے نتیجے میں اس سے ظلم کا صدور ہوتا ہے۔

اسلام کی تعلیمِ رحمت تو یہ ہے کہ ایک شخص اپنے بھائی کی مصیبت کو اپنی مصیبت

سمجھے اور اس کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھے۔ جس کے اندر یہ صفت پیدا ہو گئی اللہ اس کے لیے کافی ہو گیا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آقاے دو جہاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: وَاللهُ فِي عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِي عَوْنِ أَخِيهِ۔

(صحیح مسلم، حصہ چہارم، ص: ۲۰۷۴)

ترجمہ: جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں رہتا ہے، اللہ بھی اس کی مدد فرماتا ہے۔

ناحق قتل و غارت اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے

زمین پر شر انگیزی، فتنہ، فساد، کسی کا ناحق قتل اور غارت گری اسلام کی نظر میں ہر حال میں مذموم ہے۔ قرآنی آیات میں جگہ جگہ ان باتوں کی مذمت کی گئی ہے۔ آئندہ صفحات میں ان آیات کی تفصیلات آپ ملاحظہ کریں گے، یہاں ایک آیت ذکر کی جا رہی ہے جس سے یہ بات واضح ہو جائے گی:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا۔ (سورۂ مائدہ، آیت: ۳۲)

ترجمہ: جس نے کوئی جان قتل کی بغیر جان کے بدلے یا زمین میں فساد کے تو گویا اس نے سب لوگوں کو قتل کیا۔ (کنز الایمان)

اس آیت سے پتہ چلا کہ اسلام میں ناحق قتل کی کوئی گنجائش نہیں ہے بلکہ کسی ایک انسان کے ناحق قتل کو قرآن نے ساری انسانیت کے قتل کے مترادف قرار دیا ہے۔

وہ رحمتِ الٰہی کا مستحق نہیں ہو سکتا

اس کے برعکس جو شخص مخلوقِ خدا پر رحم نہیں کرتا ہے وہ رحمتِ الٰہی کا مستحق نہیں ہو

سکتا ہے۔حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت امام حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو بوسہ دیا، اس وقت آپ کے پاس حضرت اقرع بن حابس تمیمی بیٹھے ہوئے تھے، آپ نے کہا: میرے دس (۱۰) بیٹے ہیں مگر میں نے ان میں سے کسی کو کبھی بوسہ نہیں دیا۔ یہ سن کر نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کی طرف دیکھا اور فرمایا: جو دوسروں پر رحم نہیں کرتا ہے اس پر بھی رحم نہیں کیا جاتا ہے۔ (صحیح البخاری، حصہ ہشتم، ص:۷)

بنی آدم اعضاے یک دیگرند

در اصل یہ عنوان حضرت شیخ سعدی شیرازی کے ایک شعر کا مصرع ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ انسان ایک دوسرے کے اعضا کی طرح ہیں۔ یہ پیغام حدیث پاک میں ان الفاظ میں دیا گیا۔حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مَثَلُ الْمُؤْمِنِينَ فِي تَوَادِّهِمْ، وَتَرَاحُمِهِمْ، وَتَعَاطُفِهِمْ مَثَلُ الْجَسَدِ إِذَا اشْتَكَى مِنْهُ عُضْوٌ تَدَاعَى لَهُ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهَرِ وَالْحُمَّى۔

(صحیح مسلم، حصہ چہارم، ص:۱۹۹۹)

ترجمہ: باہمی محبت، آپس میں رحم اور ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارگی کے معاملے میں مومنین کی مثال جسم کے اعضا کی طرح ہے کہ اگر کسی ایک عضو کو بھی کوئی تکلیف پہنچے تو جسم کے سارے اعضا تکلیف اور بخار جیسا محسوس کرتے ہیں۔

حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں ؎

بنی آدم اعضاے یک دیگرند　　　که در آفرینش ز یک جوہر اند

چو عضوے بدرد آورد روزگار　　دگر عضوہا را نماند قرار

ترجمہ: اولادِ آدم ایک دوسرے کے اعضا کی طرح ہیں کہ ان کی پیدائش ایک ہی جوہر سے ہوئی ہے۔ جب زمانہ کسی ایک عضو کو تکلیف پہنچاتا ہے تو دوسرے اعضا کو بھی قرار نہیں رہ جاتا ہے۔

احسان جتانے کی بھی ممانعت

اگر کسی نے کسی کی مدد کردی ہے تو اس کے لیے اسلام نے یہ روا نہیں رکھا ہے کہ وہ اس پر احسان جتائے۔ بلکہ قرآنِ مقدس میں فرمایا گیا کہ اگر کسی نے کسی کو صدقہ دیا اور پھر احسان جتادیا تو اس کا صدقہ ضائع ہو جاتا ہے۔ فرمانِ قرآن دیکھیں:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى۔

(سورۂ بقرہ، آیت: ۲۶۴)

ترجمہ: اے ایمان والو! اپنے صدقے باطل نہ کردو احسان رکھ کر اور ایذا دے کر۔

ان آیتوں اور روایتوں سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ آقائے کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جو دین لے کر آئے وہ ساری انسانیت کے لیے امن وامان اور رحمت وشفقت کا داعی ہے۔ اس دین میں قساوتِ قلب کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور نہ ہی کسی پر ظلم وزیادتی برداشت کی جاسکتی ہے۔

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کا رحیمانہ پہلو

جہاں آپ نے امن وامان کا پیغام دیا اور ظلم وزیادتی سے پاک دنیا کی تشکیل فرمائی وہیں آپ خود بھی اس قدر رحیم وکریم تھے کہ رہتی دنیا تک اس کی مثال نہیں مل سکتی ہے۔ چھوٹا ہو یا بڑا، اپنا ہو یا بے گانہ ہر کوئی آپ کے رحیمانہ کردار سے مستفید ہوا اور ہر کسی کو

آپ کی رحمت وشفقت کا حصہ ملا۔

اپنوں کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحمت

اپنوں کے ساتھ رحمت اور مہربانی دراصل انسانی فطرت ہے اور آپس میں مہربانی اور رحم دلی تقریباً ہر انسان میں پائی جاتی ہے۔لیکن اپنوں کی طرف سے اگر کچھ اونچ نیچ ہو جائے تو اس پر صبر کے پیمانے کا لبریز ہونا اور غضب کا اظہار کرنا بھی انسانی فطرت ہے۔ سرورِ کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس قدر رحیم وکریم بنا کر مبعوث فرمایا تھا کہ اپنوں کی طرف سے ایسے معاملات ہوئے جو خاطر اقدس پر گراں معلوم ہوں یا ان کی وجہ سے کسی قسم کا نقصان ہوا تب بھی آپ نے عفو ودرگزر فرمائی۔

اس کی عظیم مثال جنگ اُحد کا واقعہ ہے کہ جن صحابہ کو سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پہاڑ کے اوپر مقرر فرمایا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو نیچے اتر کر مت آنا۔ پھر جب کفار پیٹھ دکھا کر بھاگے تو جشن کا ماحول چھا گیا اور اسی میں شریک ہونے کے لیے بھی وہ صحابہ پہاڑ سے نیچے اتر آئے۔نتیجہ یہ ہوا کہ کفار پہاڑ کے پیچھے سے گھوم کر واپس لوٹ آئے اور پیچھے سے حملہ کر دیا جس کی وجہ سے مسلمانوں کا کافی جانی ومالی نقصان ہوا۔

ایسے میں اگر کوئی دنیوی حکمراں ہوتا تو سارے نقصانات کا ذمے دار انھی لوگوں کو ٹھہراتا جنھیں پہاڑ سے اترنے کے لیے منع کیا گیا تھا اور پھر انھیں سزا کا سزاوار بھی ٹھہراتا بلکہ عبرتناک سزا کا حکم صادر کرتا۔

مگر حضور سید عالم رحمتِ دو جہاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جو حکم دیا جا رہا ہے وہ قابلِ غور ہے:

فَبِمَا رَحۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنۡتَ لَهُمۡ ۚ وَلَوۡ كُنۡتَ فَظًّا غَلِيۡظَ الۡقَلۡبِ

لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۠ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ○

(سورۂ آلِ عمران، آیت:۱۵۹)

ترجمہ: تو کیسی کچھ اللہ کی مہربانی ہے کہ اے محبوب! تم ان کے لیے نرم دل ہوئے اور اگر تند مزاج سخت دل ہوتے تو وہ ضرور تمھاری گرد سے پریشان ہوجاتے۔ تو تم انھیں معاف فرماؤ اور ان کی شفاعت کرو اور کاموں میں ان سے مشورہ لو اور جو کسی بات کا ارادہ پکا کرلو تو اللہ پر بھروسہ کرو بے شک توکل والے اللہ کو پیارے ہیں۔ (کنزالایمان)

اس آیۂ مقدسہ میں جہاں سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نرمی اور ملاطفت کا بیان ہے کہ آپ کے گرداگرد پروانوں کا جو ہجوم لگا ہوا ہے وہ اسی لیے ہے کہ آپ نرم دل اور شیریں لسان ہیں۔ اگر آپ شاہانہ کروفر کا مظاہرہ کرتے اور شاہانِ زمانہ کی طرح بالا دستی کے جلوے دکھاتے تو اردگرد جھرمٹ بنانے والوں کا یہ ہجوم نہ ہوتا، اسی کے ساتھ ساتھ قابلِ غور بات یہ ہے کہ جن حضرات نے رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پہاڑ سے اترنے سے منع فرمانے کو تنزیہی سمجھا تھا اور فتح خیال کرتے ہوئے پہاڑ سے نیچے اتر آئے تھے ان کے لیے حضورِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو تین باتوں کا حکم فرمایا گیا۔ (۱) انھیں معاف کر دو۔ (۲) ان کے لیے اللہ کی بارگاہ میں بھی معافی کی التجا کرو۔ (۳) انھیں اپنے ساتھ شریک مشاورت بھی کرو۔

مشورہ انسان اسی سے کرتا ہے جو اُس کا بہت قریبی اور قابلِ اعتماد ہو۔ اس آیت میں مشورے میں شریک کرنے کا حکم دے کر گویا یہ فرمایا جارہا ہے کہ انھیں آپ سے جو قرب پہلے حاصل تھا اس میں خلل نہ آنے پائے بلکہ ہنوز انھیں اسی طرح قریبی بنا کر رکھو۔ عفو

ودرگزر اور رحم وکرم کی ایسی مثال کہیں میسر نہیں آسکتی ہے اس لیے کہ دنیا والوں کا دستور یہ ہے کہ اگر غلطی معاف بھی کر دیتے ہیں تب بھی پہلے جیسا مقام نہیں دے پاتے۔

دشمنوں کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رحم وکرم کا سلوک

پیغمبرِ امن صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنوں کے ساتھ رحمت وشفقت کی تعلیم بھی دی ہے اور خود اس پر عمل بھی کر کے بتایا ہے۔اسی کے ساتھ ساتھ جب ہم آپ کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو جس خاص بات کا انکشاف ہوتا ہے وہ یہ کہ آپ نے کبھی بھی اپنے کسی بڑے سے بڑے دشمن سے بھی ذاتی انتقام نہیں لیا۔ نبوت کے اعلان کے بعد آپ کے مخالفوں نے آپ اور آپ کے ساتھیوں کے ساتھ جو ظالمانہ سلوک کیا تھا وہ تاریخ کے صفحات میں درج ہے۔ظلم وستم کی کون سی قسم ہے جو آپ اور آپ کے ساتھیوں کے ساتھ نہ اختیار کی گئی ہو۔خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کی سازش رچی گئی اور آپ کو اپنے محبوب شہر مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ منتقل ہونا پڑا۔

دشمنوں پر غلبہ اور فتح پانے کے بعد سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ رحم وکرم کا جو برتاؤ اور سلوک کیا ان کی تفصیلات پیچھے گزر چکی ہیں۔موقع کی مناسبت سے اجمالاً پھر دیکھتے چلیں:

☆ تاریخ اس واقعے کو کبھی فراموش نہیں کرسکتی جو طائف میں پیش آیا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم طائف تشریف لے گئے تو وہاں کے لوگوں نے نہایت بدخلقی کا مظاہرہ کیا۔لڑکوں کو آپ کے پیچھے ستانے کی غرض سے لگا دیا،آپ پر پتھروں کی بارش کی گئی،جس سے آپ کے پاؤں لہولہان ہو گئے،لیکن آپ نے طائف والوں کے حق میں دعائے ہلاکت نہیں کی۔عذاب کا فرشتہ حکمِ والا کا منتظر تھا،آپ ایک اشارہ کرتے

تو انھیں دو پہاڑوں کے بیچ میں دبا کر ختم کر دیا جاتا لیکن آپ نے تحمل فرمایا۔ آپ کو امید تھی کہ آج یہ لوگ خدا کے رسول کو نہیں پہچان رہے ہیں لیکن کل ان کی اولاد ایمان لائے گی۔

☆ مدینے جانے سے پہلے آپ کی خواہش تھی کہ کعبے میں داخل ہولیں لیکن کعبے کا دروازہ آپ کے لیے نہیں کھولا گیا اور کنجی بردار نے سختی سے آپ کے لیے کعبے کا دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا۔ فتحِ مکہ کے موقع پر کعبے کی کنجی آپ نے اسی شخص کو عطا فرمائی جس نے کعبے کا دروازہ آپ کے لیے بند رکھا۔ آپ نے کنجی اس کے حوالے کرتے ہوئے فرمایا کہ جو شخص کنجی اس سے چھینے گا ظالم ہوگا۔

☆ مکے میں آپ فاتحانہ شان کے ساتھ داخل ہوتے ہیں، آپ کے وہ دشمن آپ کے سامنے تھے، جو آپ کے خون کے پیاسے رہے ہیں، جنھوں نے طرح طرح کی اذیتیں آپ کو پہنچائی تھیں، تین سال تک شعب ابی طالب میں آپ کو اور آپ کے اہل خاندان کو قید کر رکھا تھا، معاشی اور معاشرتی بائیکاٹ کی سختیاں جھیلنے پر آپ کو مجبور کر دیا تھا۔ آج وہ سارے دشمن مغلوب ہو کر سامنے کھڑے تھے، وہ خائف تھے کہ نہ جانے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا۔ آپ نے کوئی خوں ریزی نہیں کی بلکہ سب کو امان دیا، سب کو پناہ دیا اور سب کو معاف کر دیا۔

☆ وحشی نے آپ کے چچا حضرتِ حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شہید کیا تھا۔ وہ یہ سوچ کر مکے سے بھاگ گئے کہ وہ بخشے نہیں جاسکتے۔ انھیں جب آپ کے حسنِ سلوک کی اطلاع ملی تو واپس آ کر انھوں نے بھی آپ کے دامنِ رحمت میں پناہ لے لی۔

☆ ہندہ نے آپ کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سینہ چاک کر کے ان کے دل کو

نکال کر چبایا تھا۔ فتحِ مکہ کے موقع پر نقاب پوش آپ کے پاس آئیں کہ آپ پہچان نہ سکیں اور انھیں امان حاصل ہو جائے۔ آپ نے انھیں پہچان لیا، معاف کر دیا اور اُس دلخراش واقعے کا ذکر تک نہ کیا۔

☆ صفوان بن اُمیہ قریش کے رؤسا میں سے تھے اور اسلام کے شدید ترین دشمنوں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ یہی ہیں جنھوں نے عمیر بن وہب کو نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قتل پر مامور کیا تھا اور ایسا کرنے پر انھوں نے ایک بڑے انعام کا وعدہ کیا تھا۔ مکہ فتح ہوا تو بھاگ کر جدہ چلے گئے اور وہاں سے سمندر کے راستے سے یمن جانے کا ارادہ کر رہے تھے۔ عمیر بن وہب نے سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ صفوان بن امیہ اپنے قبیلے کے رئیس ہیں، ڈر سے بھاگ گئے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اس کو امان ہے۔ انھوں نے کہا کہ امان کی کوئی نشانی مرحمت فرمائیں جسے دیکھ کر انھیں اعتبار آ جائے۔ آپ نے اپنا عمامہ عنایت فرمایا۔ جب وہ عمامہ لے کر صفوان کے پاس پہنچے تو صفوان نے کہا کہ مجھے وہاں جانے میں اپنی جان کا خوف ہے۔ عمیر نے کہا صفوان! تم ابھی محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حلم وعفو کو نہیں جانتے۔ صفوان عمیر کے ساتھ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور کہا کہ عمیر کہتے ہیں کہ آپ نے مجھے امان دی ہے۔ آپ نے فرمایا: سچ ہے۔ صفوان نے کہا کہ مجھے دو مہینے کی مہلت دیں، آپ نے فرمایا کہ تمھیں چار مہینے کی مہلت ہے۔ اس کے بعد صفوان بخوشی دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔

☆ عکرمہ دشمنِ اسلام ابوجہل کے بیٹے تھے۔ یہ بھی اپنے باپ ہی کی طرح سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سخت ترین دشمن تھے۔ فتحِ مکہ کے موقع پر بھاگ کر یمن

چلے گئے۔ ان کی بیوی نے اسلام قبول کر لیا تھا، وہ یمن گئیں اور عکرمہ کو اطمینان دلایا۔ عکرمہ اسلام اختیار کر لیتے ہیں اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جب عکرمہ کو دیکھا تو فرطِ مسرت سے کھڑے ہو گئے اور تیزی سے عکرمہ کی طرف بڑھے۔

☆ عرب کے قبیلوں میں سے کوئی قبیلہ اگر آخر تک اسلام کا مخالف رہا تو وہ بنی حنیفہ کا قبیلہ تھا۔ ثمامہ بن اثال اس قبیلے کے رؤسا میں سے تھے، اتفاق سے مسلمانوں کے ہاتھ گرفتار ہوئے۔ نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حکم سے انھیں مسجد کے ستون سے باندھ دیا گیا۔ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے تو پوچھا کہ ثمامہ تمھارا کیا حال ہے؟ انھوں نے کہا: اگر آپ مجھے قتل کرتے ہو تو ایسے شخص کو قتل کرو گے جو اپنی قوم کا سردار ہے اور میرا خون رائیگاں نہ جائے گا۔ اگر احسان کرو گے تو یہ احسان ایک شکر گزار شخص پر ہوگا۔ اگر مال درکار ہے تو کہو کیا چاہتے ہو، میں دوں گا۔ آقائے کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم انھیں اسی حالت میں چھوڑ کر چلے گئے۔ اگلے دن پھر یہی سوال جواب ہوا، اس کے اگلے دن پھر یہی سوال جواب ہوا۔ آقائے کون ومکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: ثمامہ کو کھول دو۔ ثمامہ کے لیے یہ لطف وعنایت خلافِ توقع تھی۔ قید سے رہا ہو کر انھوں نے قریب کے ایک باغ میں جا کر غسل کیا اور مسجد میں واپس آ کر اسلام قبول کر لیا۔

عبد اللہ بن ابی منافقوں کا سردار تھا، مصلحتاً وہ اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتا تھا، لیکن دل سے وہ رسولِ گرامی وقار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور اسلام کا دشمن تھا، اس کے ساتھیوں کی روِش بھی منافقانہ تھی۔ اس شخص نے جب بھی موقع ملا اسلام اور اہلیانِ

اسلام کو نقصان پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اور نہ ہی نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اذیت پہنچانے میں اس نے کوئی کمی کی۔ جنگِ اُحد میں عین لڑائی کے نازک موقع پر اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر الگ ہوگیا، پیغمبرِ امن صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پھر بھی درگزر فرمایا۔ منافقوں کا یہ سردار جب مرا تو اس احسان کے بدلے میں کہ اس نے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنا کرتا دیا تھا، آپ نے اسے اپنا کرتا پہنا کر دفن کیا۔

نبیِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے جس گوشے پر بھی نظر دوڑائیں اس سے رحم وکرم اور امن وسکون کا ہی پیغام ملے گا۔ سرکارِ ابد قرار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی پوری زندگی کائنات کو امن وسکون کا گہوارہ بنانے کی کوشش ہی میں صرف ہوئی۔

ساتواں باب

پیغمبرِ امن صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سارے انسانی افراد کے لیے امن وسکون کی راہیں ہموار فرمائی ہیں

آپ نے گزشتہ صفحات میں ملاحظہ کیا کہ جب دنیا آقاے رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعلیمات سے نا آشنا تھی اُس وقت عام طور پر لوگ انسانی اقدار سے ناواقف تھے، کسی کو کسی کی عزت وآبرو کی فکر نہ تھی، انسانی زندگی اور حیوانی زندگی میں کوئی خاص فرق نہیں رہ گیا تھا، خاص کر یتیموں، بچیوں، عورتوں، مسکینوں، معذوروں، بوڑھوں اور کمزوروں کو مشق ستم بنایا جاتا تھا۔ نہ معاشرے میں ان کے کوئی حقوق متعین تھے اور نہ ہی کوئی انھیں ان کے حقوق دلانے والا تھا لیکن حضور سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہر طرح کے انسانوں کے لیے حقوق متعین فرمائے، انھیں ان کے حقوق دلانے کے لیے بے انتہا جدوجہد بھی فرمائی اور پوری دنیا کو انسانی اقدار اور انسانی حقوق کی اہمیت سے واقف فرمایا۔

اگلے صفحات میں انسانی افراد کے حقوق ترتیب وار ذکر کیے جا رہے ہیں تا کہ پیغمبرِ امن صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کی ہمہ گیر فکر اور آپ کے عالمگیر عادلانہ نظام سے صحیح طور پر واقفیت ہو سکے۔

پیغمبر امن صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زَوجَین کو پر امن زندگی عطا کی

حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے میاں بیوی کے جو باہمی حقوق مقرر فرمائے ہیں وہ دونوں کے لیے حق وانصاف پر مبنی ہیں۔ اگر زوجین ان حقوق کا لحاظ کریں تو ان کی ازدواجی زندگی اس قدر پُرسکون گزرے گی کہ پریشان کن مسائل پیدا ہی نہ ہوں گے اور اگر ہو بھی جائیں تو بہ آسانی حل ہو جائیں گے۔ خود قرآنِ مقدس نے زوجین کو ایک دوسرے کے لیے باعثِ سکون قرار دیا ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْٓا اِلَیْہَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ○

(سورۂ روم، آیت:۲۱)

ترجمہ: اور اس کی نشانیوں سے ہے کہ تمھارے لیے تمھاری ہی جنس سے جوڑے بنائے کہ ان سے آرام پاؤ اور تمھارے آپس میں محبّت اور رحمت رکھی۔ (کنزالایمان)

سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی آمد سے قبل سارے حقوق پر شوہروں کا جابرانہ قبضہ تھا، بیویوں کے لیے کچھ حقوق نہیں تھے۔ آپ نے دونوں کے لیے ایک دوسرے پر فرائض بھی رکھے اور دونوں کے لیے حقوق بھی متعین فرمادیے تاکہ دونوں ایک دوسرے کی قدر و عزت کا لحاظ رکھتے ہوئے حقوق کی ادائیگی کے پابند رہیں اور دونوں میں سے کوئی بھی اپنے آپ کو حقوق سے آزاد محسوس نہ کر سکے۔

مردوں اور عورتوں کے حقوق و فرائض برابر برابر ہیں

فرمانِ قرآن ہے:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ۔

(سورۂ بقرہ، آیت:۲۲۸)

ترجمہ: اور عورتوں کا بھی حق ایسا ہی ہے جیسا ان پر ہے شرع کے موافق اور مردوں کو ان پر فضیلت ہے۔ (کنزالایمان)

یعنی جس طرح عورتوں پر شوہروں کے حقوق کی ادائیگی واجب ہے اسی طرح شوہروں پر عورتوں کے حقوق کی رعایت بھی لازم ہے۔ البتہ مردوں کو عورتوں پر یک گونہ فضیلت حاصل ہے۔ یہ فضیلت بھی کیسے ہے اس کی صراحت قرآن نے فرمادی ہے:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ۔ (سورۂ نساء، آیت:۳۴)

ترجمہ: مرد افسر ہیں عورتوں پر اس لیے کہ اللہ نے ان میں ایک کو دوسرے پر فضیلت دی اور اس لیے کہ مردوں نے ان پر اپنے مال خرچ کیے۔ (کنزالایمان)

چوں کہ مردوں کو طاقت اور عقل علی العموم عورتوں کے مقابلے میں زیادہ دی گئی، اس لیے خاندان کا افسر اور حاکم مردوں کو بنایا گیا نیز مالی ذمے داریاں بھی مردوں کے سروں پر ہی رکھی گئیں۔ لہٰذا مردوں کی جزوی برتری فطری برتری کی بنیاد پر ہے لیکن یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ انھیں آزاد نہیں رکھا گیا ہے بلکہ ان کی گردنوں کو اہم ترین مالی ذمے داریوں کی ادائیگی سے بوجھل کر دیا گیا ہے۔

اگلے حصے کے مطالعے سے واضح ہو جائے گا کہ آزاد کوئی نہیں ہے۔ پہلے **عورتوں کے ذمے مردوں کے کیا حقوق ہیں**، یہ ذکر کیا جائے گا پھر **مردوں کے ذمے عورتوں کے کیا حقوق ہیں**، اسے بیان کیا جائے گا۔

عورتوں کے ذمے مردوں کے حقوق:

امن کی بحالی کے لیے سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہر طبقۂ انسانیت کے لیے حقوق بھی متعین فرمائے اور سب کی ذمے داریاں بھی تقسیم کی ہیں۔ عورتوں پر شوہروں کے حقوق متعین کیے گئے اور انھیں اس کا پابند کیا گیا کہ وہ اپنی ذمے داری نبھائیں۔ اگر ان کے شوہر ان سے خوش ہوں گے تو گھر جنت نشاں بن جائے گا۔

سیدِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عورت پر شوہر کی اطاعت واجب قرار دیا

شوہر کے حقوق میں سے ہے کہ عورت شوہر کی اطاعت کرے۔ حدیث پاک میں اس کے تعلق سے بڑی تاکید آئی ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ

تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: لَوْ اَنَّ رَجُلًا اَمَرَ امْرَاَتَهٗ اَنْ تَنْقُلَ مِنْ جَبَلٍ اَحْمَرَ اِلٰی جَبَلٍ اَسْوَدَ، وَمِنْ جَبَلٍ اَسْوَدَ اِلٰی جَبَلٍ اَحْمَرَ، لَکَانَ نَوْلُهَا اَنْ تَفْعَلَ۔

(سنن ابن ماجہ، حصہ اول، ص: ۵۹۵)

ترجمہ: اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو حکم دے کہ وہ سرخ پہاڑ کو سیاہ کر دے اور سیاہ پہاڑ کو سرخ کر دے تو اس پر واجب ہوگا کہ وہ کرے۔

یعنی اگر شوہر کسی مشکل کام کا حکم دے تب بھی عورت کو چاہیے کہ اسے کرنے کی کوشش کرے۔ اگر خواتین اس فرمان پر عمل پیرا ہو جائیں تو عام طور پر چھوٹی چھوٹی باتوں پر گھروں میں ہونے والے جھگڑے بالکل ختم ہو جائیں گے اور گھر امن وسکون کا گہوارہ ہو جائے گا۔

پیغمبرِ رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شوہر کو راضی کرنے پر جنت کی ضمانت لی

کسی عورت نے اپنے شوہر کی خدمت اور اس کی رضا جوئی کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا اور شوہر کی رضا جوئی میں ہی ہمہ تن لگ گئی تو اس کے لیے جنت کا وعدہ ہے۔ حضرت اُمِ سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَيُّمَا امْرَأَةٍ مَاتَتْ، وَزَوْجُهَا عَنْهَا رَاضٍ، دَخَلَتِ الْجَنَّةَ۔

(سنن ابن ماجہ، حصہ اول، ص: ۵۹۵)

ترجمہ: جس عورت کا انتقال اس حال میں ہوا کہ اس کا شوہر اس سے راضی تھا وہ جنت میں داخل ہوگی۔

اس حدیثِ پاک سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ شوہر کی فرماں برداری کرنے اور اس کی برتری تسلیم کرنے میں نہ صرف خاندان پرسکون رہتا ہے بلکہ بیوی کو اس کا اُخروی

فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے کہ وہ جنت کی مستحق ہو جاتی ہے۔

اطاعت گزار بیوی کو آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نفع بخش قرار دیا

حضرت ابو اُمامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آقائے نعمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اللہ کے خوف کے بعد جس چیز سے مومن کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچتا ہے وہ نیک بیوی ہے کہ اگر وہ اسے حکم کرے تو اس کی بات مانے، اگر وہ اس کی طرف دیکھے تو دیکھ کر خوش ہو جائے، اگر اس کو قسم دلائے تو وہ پوری کر دکھائے اور اگر وہ اس سے دور ہو تو اپنے نفس اور اس کے مال میں اس کی خیر خواہی کرے۔ (سنن ابن ماجہ، حصہ اول، ص:۵۹۶)

اس حدیث میں فرمایا گیا کہ جس کو چار خوبیوں والی بیوی مل گئی اسے دنیا کی سب سے نفع بخش چیز مل گئی۔ وہ چار صفات یہ ہیں:

(۱) شوہر جس جائز بات کا بھی حکم دے وہ اس حکم کی پیروی کرے۔

(۲) شوہر کے سامنے بناو سنگار کے ساتھ رہے اور اس کے سامنے اس انداز سے آئے کہ اسے دیکھ کر شوہر کا دل خوش ہو جائے۔

(۳) اگر شوہر نے کسی بات کی قسم دلا دی تو وہ بات پوری کر دکھائے۔

(۴) شوہر کہیں دوسری جگہ ہو تو اپنی عفت و پاک دامنی کی بھی حفاظت کرے اور شوہر کے مال و متاع کی بھی حفاظت کرے۔

جس کے اندر یہ صفات موجود ہوں گی وہ کامیاب بیوی کہلائے گی۔

پیغمبرِ امن صلّی اللہ علیہ وسلّم نے مذکورہ چار اوصاف بیان فرما کر خاندانوں کے چین وسکون باقی رہنے کے لیے عظیم قانون عطا فرما دیا، ہر مسلمان خاتون کی ذمے داری ہے کہ اگر

وہ اپنے کنبے کو پرسکون دیکھنا چاہتی ہے تو اپنا محاسبہ کرکے اپنے آپ کو مذکورہ چار اوصاف کا حامل بنائے، اس سے نہ صرف خاندان کا فائدہ ہے بلکہ خود اس کے بہترین خاتون ہونے اور نیک و پاکباز ہونے کی کیا علامت ہے۔

اگر کسی کو سجدہ کرنا جائز ہوتا تو عورت کو حکم ہوتا کہ شوہر کو سجدہ کرے

سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے شوہروں کے مختلف حقوق بیان فرمائے ہیں نیز ان کے مقام و مرتبے کا بھی ذکر فرمایا ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: لَوْ اَمَرْتُ اَحَدًا اَنْ يَّسْجُدَ لِاَحَدٍ، لَاَمَرْتُ الْمَرْاَةَ اَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِهَا۔ (سنن ابن ماجہ، حصہ اول، ص: ۵۹۵)

ترجمہ: اگر میں کسی شخص کو کسی شخص کا سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کا سجدہ کرے۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایک خاتون کے لیے اپنے شوہر کو راضی رکھنا کس حد تک ضروری ہے۔ نیز یہ بھی کہ خاندان کا امن و امان اسی میں ہے کہ عمومی معاملات میں بیوی شوہر کی بات سنے اور اسے خود سے بلند و برتر تسلیم کرے ورنہ خاندان کا امن اسی طرح برباد ہو سکتا ہے جس طرح افسر کا حکم نہ ماننے سے کسی بھی ملک کی بربادی ہو سکتی ہے۔

عورت جب تک شوہر کا حق ادا نہ کرے اس نے اللہ کا حق بھی ادا نہیں کیا

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ سے مروی ہے کہ سرکارِ ابد قرار صلی للہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لَا تُؤَدِّي الْمَرْأَةُ حَقَّ رَبِّهَا حَتّٰى تُؤَدِّيَ حَقَّ زَوْجِهَا، وَلَوْ سَأَلَهَا نَفْسَهَا وَهِيَ عَلٰى قَتَبٍ لَمْ تَمْنَعْهُ۔ (سنن ابن ماجہ، حصہ اول، ص: ۵۹۵)

ترجمہ: جب تک عورت اپنے شوہر کا حق ادا نہیں کر دیتی اس سے رب کا حق بھی ادا نہیں ہوگا۔ اگر اس نے اسے بلایا اور وہ سفر کے لیے کجاوے میں بیٹھ چکی ہے تب بھی اس کے لیے ضروری ہے کہ اسے منع نہ کرے۔

اس حدیث پاک میں اس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ عورت چاہے کتنے ہی ضروری کام میں مصروف ہو، شوہر نے اسے صحبت کے لیے بلایا تو اسے انکار نہیں کرنا چاہیے، کیوں کہ اس سے آپسی امن وسکون متاثر ہوسکتا ہے۔

آقائے کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مرد کا حق قرار دیا کہ عورت اسے صحبت سے نہ روکے

ہمبستری انسان کی فطری ضرورت ہے اور نکاح میں ایک اہم مطلوب یہ بھی ہے کہ اسی کے ذریعے نسلِ انسانی کی افزائش ہوتی ہے۔ نکاح کے ذریعے مرد کو اپنی بیوی سے اور عورت کو اپنے شوہر سے جسمانی استفادے کے حقوق حاصل ہو جاتے ہیں، اگر کسی کے دل میں مجامعت کی خواہش ہو اور اسے منع کیا جائے تو وہ متعدد مفاسد کا باعث بن سکتا ہے۔ اسی لیے آقائے نعمت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے سختی سے منع فرمایا اور خاص مرد کا عورت پر حق قرار دیا کہ وہ جب بھی اس سے لطف اندوز ہونا چاہے عورت اسے منع نہ کرے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اِذَا دَعَا الرَّجُلَ اِمْرَاَتَهٗ اِلٰی فِرَاشِهٖ فَاَبَتْ فَبَاتَ غَضْبَانَ عَلَيْهَا لَعَنَتْهَا الْمَلَائِكَةُ حَتّٰى تُصْبِحَ۔ (صحیح البخاری، حصہ چہارم، ص:۱۱۶)

ترجمہ: جب کوئی مرد اپنی عورت کو اپنے بستر پر بلاتا ہے اور وہ انکار کر دیتی ہے تو صبح تک فرشتے اس پر لعنت بھیجتے رہتے ہیں۔

مردوں کے ذمے عورتوں کے حقوق

جس طرح عورتوں پر مردوں کے حقوق ہیں اسی طرح مردوں پر عورتوں کے بھی حقوق ہیں۔ پیغمبرِ امن صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے عورتوں کے ساتھ کوئی بھید بھاؤ نہیں کیا ہے بلکہ انھیں بھرپور حقوق دلائے ہیں۔ ایک طرف مردوں کو عورتوں پر برتری عطا فرمائی تو دوسری طرف مردوں کو عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور ان کے اخراجات کا بار اٹھانے کا پابند بھی بنایا ہے۔

احادیث مبارکہ میں اس تعلق سے بڑی وضاحتیں آئی ہیں اور مردوں کو متعدد فرامین میں حکم دیا گیا کہ عورتوں کے حقوق کی ادائیگی کے معاملے میں احتیاط سے کام لیں۔ خود سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ازوج مطہرات کے ساتھ حسنِ معاشرت کی بہترین مثالیں قائم فرمائی ہیں۔

بیوی کے نان ونفقے کا خرچ شوہر کے ذمے ہے

آقائے رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بیوی کا نان ونفقہ اس کے شوہر کے ذمے کیا ہے۔شوہر کے تعلق سے قرآن مقدس نے فرمایا:

عَلَی الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَی الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ۔ (سورۂ بقرہ، آیت:۲۳۶)

ترجمہ: مقدور والے پر اس کے لائق اور تنگدست پر اس کے لائق۔ (کنزالایمان)

غور کریں! کس قدر عدل وانصاف پر مبنی حکم ہے اگر شوہر خوش حال ہے تو اس پر لازم ہے کہ اپنی سخاوت کا مظاہرہ کرے اور ضروریات کے ساتھ ساتھ حتی الامکان بیوی کی خواہشات کا بھی احترام کرے اور اگر تنگ دست ہے تو ضروریات کی تکمیل بہرِ حال لازم ہے۔

بیویوں کا حق مہر ادا کرنا شوہر پر واجب ہے

شوہر پر عورت کا حق مہر ادا کرنا واجب قرار دیا گیا ہے۔ فرمانِ قرآن ہے:

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓـًٔا مَّرِیْٓـًٔا ○ (سورۂ نساء، آیت: ۴)

ترجمہ: اور عورتوں کو ان کے مہر خوشی سے دو، پھر اگر وہ اپنے دل کی خوشی سے مہر میں سے تمھیں کچھ دے دیں تو اسے کھاؤ رچتا پچتا۔ (کنز الایمان)

پہلے عورتوں کے مہر ان کے اولیا لے لیا کرتے تھے اور عورتوں کو مہر کا کچھ بھی حصہ نہیں دیا جاتا تھا۔ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ظلم سے بھی عورت کو نجات دلائی۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ مَہر کی مستحق عورتیں ہی ہیں نہ کہ ان کے اولیا۔ اگر اولیا نے مَہر وصول کر لیا ہو تو بھی انھیں لازم ہے کہ وہ مہر عورت کے حوالے کر دیں کہ وہی اس کی مستحق ہے۔

عورت کے ساتھ حسنِ معاشرت کا حکم ہوا

قرآن مقدس میں فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْـًٔا وَّیَجْعَلَ اللّٰهُ فِیْهِ خَیْرًا كَثِیْرًا ○ (سورۂ نساء، آیت: ۱۹)

ترجمہ: اور ان سے اچھا برتاو کرو، پھر اگر وہ تمھیں پسند نہ آئیں تو قریب ہے کہ کوئی چیز تمھیں ناپسند ہو اور اللہ اس میں بہت بھلائی رکھے۔ (کنز الایمان)

اس آیۂ مقدسہ میں حکم ہوا کہ مرد کی ذمے داری ہے کہ عورت کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے، نیز اگر عورت میں شکل وصورت یا اخلاق وکردار کی کچھ کمی ہو تو مرد کو چاہیے کہ صبر کرے اور اس سے جدا ہونے کی جدو جہد نہ کرے بلکہ یہ یقین رکھے کہ اللہ تعالیٰ دنیا وآخرت میں ضرور اس صبر کا بہترین صلہ عطا فرمائے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے بطن سے جو اولاد ہو وہ اس کے لیے دنیا وآخرت کی بہتری لے کر آئے۔

آقائے نعمت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بنیادی ضرورتیں فراہم کرنا بیوی کا حق قرار دیا

حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے نبیِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سوال کیا: بیوی کا شوہر پر کیا حق ہے؟ آپ نے فرمایا:

اَنْ يُّطْعِمَهَا اِذَا طَعِمَ، وَاَنْ يَّكْسُوَهَا اِذَا اكْتَسٰى، وَلَا يَضْرِبِ الْوَجْهَ، وَلَا يُقَبِّحْ، وَلَا يَهْجُرْ اِلَّا فِي الْبَيْتِ۔ (سنن ابن ماجہ، حصہ اول، ص: ۵۹۳)

ترجمہ: اسے اپنے ساتھ کھانا کھلائے، اسے کپڑے پہنائے، اس کے چہرے پر نہ مارے، اس کی صورت نہ بگاڑے اور اسے نہ چھوڑے مگر گھر کے اندر۔

معلوم ہوا کہ یہ ناجائز ہے کہ کوئی شوہر اپنی بیوی کے چہرے پر مارے بلکہ اس کے چہرے کی برائی بھی نہیں کرسکتا۔ اگر کبھی کسی معقول وجہ سے ناراض ہو جائے تو یہ چاہیے کہ گھر کے اندر رہتے ہوئے، اپنی بیوی کے قریب رہتے ہوئے اظہارِ ناراضگی کرے، اگر ضرورت محسوس ہو تو خوابگاہ میں چہرہ پھیر کر سوسکتا ہے لیکن ناراضگی کی وجہ سے اسے دوسرے گھر میں منتقل کرنا ہرگز درست نہیں ہے۔

آقائے نعمت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے سب سے بہتر انسان اس کو کہا جو بیوی کے ساتھ بہتر ہو

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اَكْمَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ اِيْمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا، وَخَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِنِسَائِهِمْ۔ (سنن الترمذی، حصہ سوم، ص: ۴۵۸)

ترجمہ: سب سے کامل ایمان والا مومن وہ ہے جو سب سے اچھے اخلاق والا ہے اور تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنی عورتوں کے لیے سب سے بہتر ہو۔

نبیِ اکرم نورِ مجسم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نہ صرف یہ کہ عام لوگوں کو یہ حکم فرمایا بلکہ

آپ نے خود اس کا پیکر بن کر دکھایا۔ اس کی چند مثالیں آگے ذکر کی جائیں گی۔

آپ اپنے تعلق سے خود فرماتے ہیں:

وَاَنَا خَيْرُكُمْ لِاَهْلِي۔ (سنن ابن ماجہ، حصہ اول، ص: ۶۳۶)

ترجمہ: میں اپنے اہلِ خانہ کے لیے تم میں سب سے بہتر ہوں۔

پیغمبر امن صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عورتوں کو مارنے سے منع فرمایا

ایک بار ولید بن عقبہ کی بیوی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے شکایت کرنے آئیں کہ ولید مجھ کو بہت مارتے ہیں۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ولید سے جا کر بتا دینا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مجھ کو اپنی پناہ میں لے لیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر آئیں اور کہنے لگیں کہ ولید نے اب تو مجھے اور مارا ہے۔

یہ سن کر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کپڑے کا ایک ٹکڑا کاٹ کر بطورِ نشانی عطا فرمایا۔ اس خاتون نے جا کر دکھایا تو اس نے اس کو اور بھی مارا پھر وہ شکایت لے کر حاضر ہوئیں اور بولیں کہ ولید نے اب مجھے پہلے سے بھی زیادہ مارا۔ یہ سن کر نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ولید کے لیے دعاے ہلاکت فرمائی۔ (کنز العمال، حصہ: ۱۳، ص: ۷۰۳)

کچھ مرد اسی میں اپنی مردانگی سمجھتے ہیں کہ عورت پر ہر وقت غضب اور جلال کا اظہار کرتے رہیں اور ان کی عورت ان کے سامنے ہمیشہ سہمی رہے۔ ان کے لیے مندرجہ ذیل فرمانِ رسول ہدایت و رہنمائی کا عظیم معیار ہے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ ابد قرار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اِنَّ الْمَرْاَةَ كَالضِّلَعِ اِنْ ذَهَبْتَ تُقِيْمُهَا كَسَرْتَهَا وَاِنْ تَرَكْتَهَا

اسْتَمْتَعْتَ بِهَا عَلٰى عِوَجٍ۔ (سنن الترمذی، حصہ سوم، ص: ۴۸۵)

ترجمہ: عورت پسلی کی طرح ہے کہ اگر تم اسے بالکل سیدھی کرنا چاہو تو ٹوٹ جائے گی اور اگر چھوڑ دو تو اس کی کجی کے ساتھ اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہو۔

آقائے کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا یہ عالمی پیغام آبِ زر سے لکھے جانے کا مستحق ہے، عورتوں کی انتہائی حساس فطرت سے معلمِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم نے واقف فرمایا ہے کہ اگر ان کی ہر خامی دور کرنے کی کوشش کرو گے تو نتیجہ یہ نکل سکتا ہے کہ وہ تمھاری ماتحتی ہی سے نکل جائیں اور اگر ان کی خامیوں کو درگزر کر کے، ان کی خوبیوں سے استفادہ کرو گے تو وہ تمھارے کام بھی آئیں گی اور تمھارے لیے سکون کا سامان بھی فراہم کریں گی۔ آج عام طور پر عورتوں کی اس فطرت کو فراموش کر دیا جاتا ہے، جس کے نتائج پوری دنیا کے سامنے ہیں۔

پیغمبرِ امن صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی ازواج کے ساتھ

پیغمبرِ امن صلّی اللہ علیہ وسلّم کثرتِ اعمال و مصروفیات نیز کثرتِ ازواج کے باوجود ازواجِ مطہرات کے حقوق کی ادیگی کے لیے وقت نکالتے، ان کی دل جوئی فرماتے، ان کی رضامندی کا خیال فرماتے، گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹا کر ان کی امداد فرماتے اور کبھی انھیں تنہائی کا احساس ہونے نہ دیتے۔ آپ کی حیات کا یہ گوشہ ہر مرد کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ آگے چند نمونے پیش کیے جا رہے ہیں:

نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ازواجِ مطہرات کی دلجوئی فرماتے

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں:

سَابَقَنِي النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَبَقْتُهُ۔

(سنن ابن ماجہ، حصہ اول، ص: ۶۳۶)

ترجمہ: نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے مقابلہ کیا تو میں آپ سے جیت گئی۔

حسنِ معاشرت کا ہی یہ حصہ ہے کہ شوہر اپنی بیوی کی دلجوئی اور اسے خوش کرنے کا خیال رکھے۔ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی ازواجِ مطہرات کی دلجوئی فرمایا کرتے تھے۔ آپ سب سے بڑے انسان ہونے کے باوجود اس کو ضروری سمجھا کرتے کہ بیویوں کے لیے وقت نکالا جائے۔

حضرت عائشہ کا دل بہلانے کے لیے ان کی سہیلیوں کو بھیجتے

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کم عمری میں نکاح فرمایا تھا۔ ان کے ساتھ کھیلنے کے لیے ان کی سہیلیوں کو بھیجا کرتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا خود بیان فرماتی ہیں:

كُنْتُ اَلْعَبُ بِالْبَنَاتِ وَاَنَا عِنْدَ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَكَانَ يُسَرِّبُ اِلَيَّ صَوَاحِبَاتِيْ يُلَاعِبْنَنِيْ۔ (سنن ابن ماجہ، حصہ اول، ص: ۷۶۳)

ترجمہ: میں نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زوجیت میں تھی، اُس وقت میں لڑکیوں کے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کھیلنے کے لیے میرے پاس میری سہیلیوں کو بھیج دیا کرتے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ شوہروں کی ذمے داری ہے کہ کبھی کبھی بیویوں کو ان کے محرم رشتے داروں، پسندیدہ خواتین اور سہلیوں سے ملاتے رہیں۔ عورت کو عمومًا گھر کی چہار دیواری میں رہنا ہوتا ہے، کبھی کبھار سہیلیوں اور رشتے داروں سے ملے گی تو اس کا دل بہلے گا اور اس کے شوہر کی عزت بھی اس کے دل میں بڑھے گی۔

حضرت عائشہ کو حبشی بچوں کا کھیل دکھاتے

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں:

كَانَ الْحَبَشُ يَلْعَبُوْنَ بِحِرَابِهِمْ، فَسَتَرَنِيْ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَنَا اَنْظُرُ، فَمَا زِلْتُ اَنْظُرُ حَتّٰى كُنْتُ اَنَا اَنْصَرِفُ۔ (ایضاً، ص:۲۸)

ترجمہ: حبشی بچے اپنے بھالوں سے کھیلا کرتے تھے، نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میرے لیے آڑ کر لیتے اور میں ان کا کھیل دیکھا کرتی، میں مسلسل دیکھا کرتی جب تک کہ میں خود ہی نہ ہٹ جاؤں۔

یعنی نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یہ نہیں فرماتے کہ اب بس کرو بلکہ جب تک حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ان کا کھیل دیکھتیں تب تک آپ ان کے لیے پردہ کیے ہوتے تھے۔ شوہروں کے لیے اس میں درس ہے کہ شرعی حدود میں رہ کر بیویوں کی خوشی کے لیے انھیں بھی چھوٹی بڑی مشقتیں برداشت کرنی چاہیے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلا کہ کوئی کتنے ہی بڑے عہدے کا مالک ہو، کتنا ہی بڑا مال دار ہو، اس کا بڑا عہدہ، اس کی مال داری اپنی بیوی کی دل جوئی کے لیے رکاوٹ نہیں بننی چاہیے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کاموں میں ازواجِ مطہرات کا ہاتھ بٹاتے

مردوں میں عموماً حاکمانہ مزاج ہوتا ہے اور ان کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ بیوی ان کے اشاروں پر سبھی کام کر دیا کرے۔ اگر انھیں کبھی گھر کا کوئی کام کرنا پڑے تو دل پر بڑا ناگوار گزرتا ہے۔ اس تعلق سے نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا کردار و اخلاق دیکھیں۔

حضرت اسود بن یزید کہتے ہیں کہ میں نے سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے پوچھا کہ نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب گھر میں ہوتے تو کیا کیا کرتے تھے؟ آپ نے فرمایا:

كَانَ يَكُوْنُ فِيْ مَهْنَةِ اَهْلِهٖ فَاِذَا حَضَرَتِ الصَّلٰوةُ قَامَ فَصَلّٰى۔

(سنن الترمذی، حصہ چہارم، ص:۲۳۵)

ترجمہ: نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹاتے تھے، پھر جب نماز کا وقت ہوجاتا تھا تو آپ نماز ادا فرماتے۔

یعنی حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم گھر کے کاموں میں ازواجِ مطہرات کا ہاتھ بٹاتے تھے، صاف صفائی، سلائی اور کھانے کی تیاری میں مدد فرمایا کرتے۔

گھر کے کاموں میں ہاتھ نہ بٹا کر فخر کرنے والے، تحکمانہ مزاج رکھنے والے، بیویوں کو باندیاں سمجھنے والے اور انھیں ساری گھریلو ذمے داریوں میں تنہا چھوڑنے والے غور کریں کہ دنیا کے سب سے بڑے اور برتر انسان ہونے کے باوجود حضور رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح اپنی ازواجِ مطہرات کے کاموں میں ہاتھ بٹا کر یہ درس عطا فرما رہے ہیں کہ گھر کے سکون کے متلاشیوں کو گھریلو کاموں میں حصہ لینا ہوگا، اس کے بغیر گھر اور خاندان میں امن وسکون کا ماحول نہیں پیدا ہوسکتا ہے۔

پیغمبرِ امن صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے والدین کو بلند مقام عطا فرمایا

آج پوری دنیا میں والدین کے حقوق کے تعلق سے سخت غفلتوں اور کوتاہیوں کا ماحول ہے، والدین کی عظمت اور ان کے اونچے مقام کو ہر طرف فراموش کیا جا رہا ہے، والدین کے احسانات کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہ گئی ہے۔

اس خصوص میں پیغمبرِ امن صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ارشادات کا جائزہ لیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ والدین کی عظمت کو جتنا آپ نے اجاگر فرمایا ہے، والدین کے حقوق سے جتنا آپ نے روشناس کرایا ہے، اتنا آج تک کسی نے نہیں کیا ہے۔

آپ نے والدین کے حقوق بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان حقوق کی ادائیگی کی بھی سخت تاکیدیں فرمائی ہیں، ان کے حقوق کی ادائیگی کے دنیوی اور اخروی فوائد بھی بیان فرمائے ہیں اور ان کی حق تلفی کے دنیوی اور اخروی نقصانات بڑی تفصیل کے ساتھ امت کے حوالے فرمائے ہیں۔ اس کتاب میں طوالت کے خوف سے فقط چند اہم حقوق ذکر کیے جا رہے ہیں۔

بوڑھے والدین کو اُف تک نہیں کہا جا سکتا ہے

بڑھاپے کو قرآن مقدس نے ''ارذل العمر'' یعنی ''ناقص عمر'' کہا ہے، اس عمر میں اگر کوئی دیکھ ریکھ کرنے والا مل گیا تو اچھی بات ہے ورنہ زندگی دوبھر ہو جاتی ہے۔ آج کی مطلب پرست دنیا میں اولاد خاص کر بڑھاپے میں والدین کو اپنے ساتھ رکھ کر ان کی خدمت کرنے کا ذہن نہیں رکھتی ہے، ان کے سخت اور کڑوے جملے برداشت کرنا تو بہت دور کی بات ہے، کوئی ان کے میٹھے اور کمزور بول سننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ لیکن پیغمبرِ امن صلّی اللہ علیہ وسلّم نے یہ تعلیم عطا فرمائی ہے کہ جب والدین بوڑھے ہو جائیں اور ان سے کوئی ایسی بات سرزد ہو جو تمھیں ناگوار گزرے تب بھی ان سے اُف تک نہ کہو۔ فرمانِ قرآن ہے:

إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِندَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُل لَّهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُل لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا ○ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُل رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا ○ (سورۂ بنی اسرائیل، آیت: ۲۳، ۲۴)

ترجمہ: اگر تیرے سامنے ان میں ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان سے ہُوں نہ کہنا اور انھیں نہ جھڑکنا اور ان سے تعظیم کی بات کہنا۔ اور ان کے لیے عاجزی کا بازو بچھا نرم دلی سے اور عرض کر کہ اے میرے رب! تو ان دونوں پر رحم کر جیسا کہ ان دونوں نے

مجھے چھٹپن میں پالا۔(کنزالایمان)

والدین کا حق ماننا ضروری ہے

والدین کو بچپن میں اولاد کی پرورش میں پیش آنے والی بعض تکلیفات کا ذکر کر کے یہ احساس دلایا گیا کہ والدین ہر حال میں حسنِ سلوک اور شکریے کے مستحق ہیں:

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ ۖ إِلَيَّ الْمَصِيرُ ○ (سورۂ لقمان، آیت: ۱۴)

ترجمہ: اور ہم نے آدمی کو اس کے ماں باپ کے بارے میں تاکید فرمائی، اس کی ماں نے اسے پیٹ میں رکھا کمزوری پر کمزوری جھیلتی ہوئی اور اس کا دودھ چھوٹنا دو برس میں ہے، یہ کہ حق مان میرا اور اپنے ماں باپ کا، آخر مجھی تک آنا ہے۔(کنزالایمان)

ایک مقام پر فرمایا:

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا ۖ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا ۖ وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا ۔ (سورۂ احقاف، آیت: ۱۵)

ترجمہ: اور ہم نے آدمی کو حکم کیا کہ اپنے ماں باپ سے بھلائی کرے۔ اس کی ماں نے اسے پیٹ میں رکھا تکلیف سے اور جنی اس کو تکلیف سے اور اسے اٹھائے پھرنا اور اس کا دودھ چھڑانا تیس مہینے میں ہے۔(کنزالایمان)

اولاد کو یہ درس دیا جا رہا ہے کہ انھیں اپنا ماضی کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے، انھیں یہ کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ والدین نے ان کی خاطر بے انتہا تکلیفیں برداشت کی ہیں، ان کے لیے بڑے صبر آزما حالات سے گزرے ہیں۔ جس اولاد کے اندر یہ احساس جاگ جائے گا وہ کبھی اپنے والدین کو اپنے گھر سے جدا کر کے Old Houses کے حوالے نہیں کرے

گی۔پیغمبرِ امن صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیمات پر دنیا عمل پیرا ہو جائے تو دنیا بھر سے Old Houses کی ضرورت ختم ہو جائے گی۔

ماں باپ کی خدمت نہ کرنے والے سخت محروم ہیں

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ برحق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اس شخص کی ناک خاک آلود ہو، اسی طرح آپ نے تین مرتبہ فرمایا۔ عرض کی گئی: یارسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیک وسلم! کس کے تعلق سے آپ ایسا فرما رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا: مَنْ اَدْرَكَ وَالِدَيْهِ عِنْدَ الْكِبَرِ، اَحَدَهُمَا اَوْ كِلَيْهِمَا، ثُمَّ لَمْ يَدْخُلِ الْجَنَّةَ۔ (صحیح مسلم، حصہ چہارم، ص:۱۹۷۸)

ترجمہ: جس نے اپنے والدین میں سے ایک کو یا دونوں کو پایا اور جنت میں داخل نہ ہوسکا۔

(یعنی والدین اس کے سامنے باحیات تھے اور اس نے ان کی خدمت کر کے اور ان کے حقوق ادا کر کے اپنے آپ کو جنت کا مستحق نہ بنایا تو وہ شخص سخت محروم ہے۔)

کافر والدین بھی حسنِ سلوک کے مستحق ہیں

حضرت اسما بنت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتی ہیں:

قَدِمَتْ عَلَيَّ اُمِّي وَهِيَ مُشْرِكَةٌ فِي عَهْدِ قُرَيْشٍ اِذْ عَاهَدَهُمْ فَاسْتَفْتَيْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقُلْتُ: يَارَسُوْلَ اللهِ، قَدِمَتْ عَلَيَّ اُمِّي وَهِيَ رَاغِبَةٌ، اَفَاَصِلُ اُمِّي؟ قَالَ: نَعَمْ، صِلِي اُمَّكِ۔

(صحیح مسلم، حصہ دوم، ص:۶۹۶)

ترجمہ: نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب قریش کے دور میں ان سے عہد لے

رہے تھے اس وقت میری والدہ میرے پاس آئیں، میں نے رسولِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میری والدہ میرے پاس آئی ہیں اور وہ ایمان پر نہیں ہیں تو کیا میں ان کے ساتھ حسنِ سلوک کروں؟ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں اپنی والدہ کے ساتھ حسنِ سلوک کرو۔

دوسروں کے والدین کو گالی دینا، اپنے والدین کو گالی دینا ہے

گالی کا ماحول آج عام ہو چکا ہے اور مسلم معاشرے میں بھی بہت سے لوگ ایسے ہیں جو بلا جھجک ایک دوسرے کو گالی دیتے ہیں اور اسے معیوب تک نہیں سمجھتے۔ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس سے سختی سے منع فرمایا ہے کیوں کہ اس سے لڑائی جھگڑے کی نوبت آئے گی اور امن وسکون متاثر ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ آقائے رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: یہ کبیرہ گناہ ہے کہ کوئی شخص اپنے والدین کو گالی دے۔ پوچھا گیا کہ کیا کوئی شخص اپنے والدین کو بھی گالی دے سکتا ہے؟ فرمایا:

يَسُبُّ الرَّجُلُ اَبَا الرَّجُلِ، فَيَسُبُّ اَبَاهُ، وَيَسُبُّ اُمَّهٗ فَيَسُبُّ اُمَّهٗ۔

(صحیح البخاری، حصہ ہشتم، ص:۳)

ترجمہ: وہ شخص کسی شخص کے باپ کو گالی دے گا تو وہ اِس کے باپ کو گالی دے گا اور وہ شخص کسی کی ماں کو گالی دے گا وہ اِس کی ماں کو گالی دے گا۔

اس حدیث میں یہ پیغام دیا جا رہا ہے کہ دوسرے کے ماں باپ کو گالی دینا، در اصل اپنے والدین کو گالے دینے کے برابر ہے۔ اس لیے ہر شخص پر لازم ہے کہ دوسروں کے والدین کو برا بھلا نہ کہے۔

والد کی ناراضی دراصل اللہ کی ناراضی ہے

کوئی شخص اپنے والد کے ساتھ بھلائی کرے اور والد کا دل خوش ہو جائے تو اس سے اللہ تبارک وتعالیٰ راضی ہوتا ہے اور اگر کسی نے والد کے ساتھ برا سلوک کیا جس سے والد ناراض ہو گئے تو اس کی وجہ سے اسے اللہ کی ناراضی حاصل ہوگی۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

رِضَى الرَّبِّ فِي رِضَى الْوَالِدِ وَسَخَطُ الرَّبِّ فِي سَخَطِ الْوَالِدِ۔

(سنن الترمذی، حصہ چہارم، ص:۳۱۰)

ترجمہ: اللہ کی رضا والد کی رضا میں اور اللہ کی ناراضی والد کی ناراضی میں ہے۔

آج کہیں کہیں اگر احترام وعزت کی بات ہوتی بھی ہے تو وہ فقط والدہ کے سلسلے میں ہوتی ہے، عام طور پر ماں کی تعظیم کرنے والے اور ماں کے حقوق کی رعایت کرنے والے باپ کے حقوق کی ادائیگی کے سلسلے میں یہ سوچ نہیں رکھتے۔ پیغمبرِ امن صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے اس بے مثل پیغام کے ذریعے یہ واضح فرما دیا کہ والد کے حقوق ادا کرنا اور والد کو خوش کرنا اتنا ہی ضروری ہے جس قدر والدہ کا حق ادا کرنا اور اسے خوش کرنا ضروری ہے۔

بعض بچے والد سے خاص اس لیے ناراض ہو جاتے ہیں اور برا بھلا بولتے ہیں کہ انھوں نے دوسری شادی کی ہوتی ہے۔ اس پیغام سے انھیں یہ درس لے لینا چاہیے کہ والد کی رضا وخوشی کا خیال ہمہ وقت ضروری ہے۔ اولاد کے ذمے اللہ نے یہ کام نہیں رکھا ہے کہ والد کے حقوق کی ادائیگی کے مستحق ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کرے بلکہ اولاد پر یہ فرض فرمایا ہے کہ والد کو ہمہ وقت خوش رکھے۔

والدین جنت اور جہنم دونوں میں جانے کا سبب ہو سکتے ہیں

حضرت ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے آقاے نعمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سوال کیا: بیٹے پر والدین کا کیا حق ہے؟ آپ نے فرمایا: **هُمَا جَنَّتُكَ وَنَارُكَ**۔ وہ تمھارے لیے جنت میں جانے کا بھی ذریعہ ہیں اور جہنم میں جانے کا بھی۔

(سنن ابن ماجہ، حصہ دوم، ص: ۱۲۰۸)

آج عام طور پر والدین کی خدمت کو بہت بڑا بوجھ سمجھا جاتا ہے، ایسے خراب ماحول کے لیے پیغمبرِ امن صلّی اللہ علیہ وسلّم کے فرامین کسی اکسیر سے کم نہیں ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی بھی سچا امتی کبھی اپنے والدین کو اپنے اوپر بوجھ نہیں سمجھے گا بلکہ ان کی خدمت واطاعت کو اپنی دنیا وآخرت میں کامیابی کی ضمانت سمجھے گا۔

جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے

حضرت معاویہ بن جاہمہ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں:

اِنَّ جَاهِمَةَ جَاءَ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللهِ، اَرَدْتُ اَنْ اَغْزُوَ وَقَدْ جِئْتُ اَسْتَشِيْرُكَ، فَقَالَ: هَلْ لَكَ مِنْ اُمٍّ؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: فَالْزَمْهَا، فَاِنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ رِجْلَيْهَا۔ (سنن النسائی، حصہ ششم، ص: ۱۱)

ترجمہ: میرے والد (جاہمہ) نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کی: یارسول اللہ! میں جہاد میں جانا چاہتا ہوں، آپ سے اس تعلق سے مشورہ کرنے آیا ہوں۔ آپ نے فرمایا: کیا تمھاری والدہ باحیات ہیں؟ انھوں نے کہا: ہاں۔ آپ نے فرمایا: ان کی خدمت کرو اس لیے کہ جنت ان کے قدموں کے نیچے ہے۔

خواتین کے حقوق پر کام کرنے والی ساری تنظیموں کے نظریے اس عظیم ارشاد کے

آگے ہیچ ہیں، رحمتِ عالم صلّی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف عورت کو عزت کا مقام عطا فرمایا بلکہ اس کی خدمت واطاعت کو جنت میں داخلے کا ذریعہ بنادیا۔ نیز یہ بھی پتہ چلا کہ والدین کی خدمت نفل جہاد سے افضل ہے۔

پیغمبرِ امن صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور رضاعی والدہ

حضرت ابوالطفیل رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مقام جعرّانہ میں گوشت تقسیم فرمارہے تھے کہ ایک خاتون تشریف لائیں اور نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قریب پہنچ گئیں۔ آپ نے اپنی چادرِ مبارک بچھا دی اور وہ اس پر بیٹھ گئیں۔ میں نے کہا: یہ خاتون کون ہیں؟ لوگوں نے جواب دیا کہ یہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی رضاعی ماں ہیں۔ (سنن ابی داؤد، حصہ چہارم، ص: ۳۳۷)

پیغمبرِ امن صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا یہ عمل ثابت کرتا ہے کہ آپ جس طرح حقیقی ماں کو تعظیم وتکریم کا مستحق سمجھتے ہیں، بالکل اسی طرح رضاعی والدہ کو بھی اعزاز واکرام کا حق دار مانتے ہیں۔

نبیوں کے سردار ہو کر بھی آپ نے اپنی رضاعی والدہ کو اعزاز سے نوازا اور تمام انسانوں کو یہ پیغام دے دیا کہ والدہ چاہے حقیقی ہو یا رضاعی ایک نبی کے لیے بھی تعظیم کی مستحق ہے۔

آقائے رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بچوں کو حقوق سے نوازا

بعثتِ نبوی سے قبل جہاں والدین کو کوئی خاص مقام ومرتبہ نہیں ملتا تھا وہیں اولاد بھی حقوق سے محروم رہا کرتی تھی۔ سارے حقوق اپنی جگہ، انھیں جینے کے حق سے بھی محروم کیا جاتا تھا۔ مفلسی کے مارے کسی انسان کے یہاں اگر بچہ پیدا ہو جاتا تو وہ اس خوف سے بچے کو

قتل کر دیتا تھا کہ اس کے کھلانے پلانے کا انتظام کہاں سے کرے گا۔ خاص کر بیٹیوں کو وہ اپنے لیے باعثِ عار سمجھتے تھے، اس لیے بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیا کرتے تھے۔ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہر پیدا ہونے والے بچے کو معاشرے میں ایک فرد کا مقام دیا خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی اور ان کے لیے حقوق متعین فرمائے۔ پہلے اولاد کے حقوق ذکر کیے جا رہے ہیں، پھر بیٹیوں کے حقوق علیحدہ ذکر کیے جائیں گے۔

جنین کی وجہ سے حاملہ ماں کے سارے اخراجات باپ کے ذمے ہیں

اگر کسی نے اپنی بیوی کو طلاق دے دیا لیکن وہ حاملہ ہے تو جب تک بچے کی ولادت نہ ہو جائے تب تک ماں کے پورے اخراجات باپ کے ذمے ہیں۔

قرآن مقدس میں ارشاد ہوا:

وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ۔

(سورۂ طلاق، آیت:٦)

ترجمہ: اور اگر حمل والیاں ہوں تو انھیں نان ونفقہ دو یہاں تک کہ ان کے بچّہ پیدا ہو۔

بلاشبہہ یہ نبیِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت بھری تعلیم ہی کا نتیجہ ہے کہ جنین یعنی جو ابھی حمل میں ہو، کا دنیا میں آنے سے پیشتر خیال فرمایا جا رہا ہے، اس کے صدقے میں اس کی ماں کے اخراجات کی ذمے داری اس کے باپ پر ڈالی جا رہی ہے۔

ہر پیدا ہونے والا بچہ جینے کا حق رکھتا ہے

وہ زمانہ جس میں بچوں کو مفلسی کے خوف سے قتل کر دیا جاتا تھا، ایسے میں آقائے رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قرآنی آیات سے ان کی ذہن سازی فرمائی کہ دنیا میں آنے والے ہر جاندار کی روزی اللہ تبارک وتعالیٰ کے ذمۂ کرم پر ہے۔ اس لیے اس اندیشے سے کہ

اس کے کھانے پینے کا انتظام نہیں ہو پائے گا، اسے ہرگز قتل نہ کیا جائے۔ فرمانِ قرآن ہے:

وَمَا مِنۡ دَآبَّةٍ فِى الۡاَرۡضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزۡقُهَا ۔ (سورۂ ہود، آیت:٦)

ترجمہ: اور زمین پر چلنے والا کوئی ایسا نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمّۂ کرم پر نہ ہو۔

ایک مقام پر فرمایا:

وَلَا تَقۡتُلُوۡۤا اَوۡلَادَكُمۡ خَشۡيَةَ اِمۡلَاقٍ‌ؕ نَحۡنُ نَرۡزُقُهُمۡ وَاِيَّاكُمۡ‌ؕ اِنَّ قَتۡلَهُمۡ كَانَ خِطۡاً كَبِيۡرًا ۝ (سورۂ اسرا، آیت:۳۱)

ترجمہ: اور اپنی اولاد کو قتل نہ کرو مفلسی کے ڈر سے، ہم تمھیں بھی اور انھیں بھی روزی دیں گے، بے شک ان کا قتل بڑی خطا ہے۔ (کنزالایمان)

مفلسی کے خوف سے اولاد کا قتل سب سے بڑا گناہ

حضرت عبداللہ سے مروی ہے، کہتے ہیں:

میں نے نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے پوچھا: کون سا گناہ سب سے بڑا ہے؟ آپ نے فرمایا: اللہ کا شریک ٹھہرانا جب کہ اس نے تجھے پیدا کیا ہے۔ میں نے کہا: یقیناً وہ بڑا گناہ ہے۔ میں نے کہا: پھر کون سا گناہ؟ فرمایا: اپنی اولاد کو اس خوف سے قتل کر دینا کہ اس کے لیے کھانے کا انتظام کرنا ہوگا۔ میں نے کہا: پھر کون سا؟ فرمایا: پڑوسی کی بیوی سے زنا کرنا۔ (صحیح البخاری، حصہ ششم، ص:۱۸)

رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ واضح فرمادیا کہ شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ اولاد کا قتل ہے۔ جنین کو رحمِ مادر میں قتل کرنے والے، جان پڑنے کے بعد ضرورۃً اور بلا ضرورت Abortion کرنے اور کرانے والوں کو پیغمبرِ امن صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عظیم پیغام کی روشنی میں اپنے کرتوتوں کا محاسبہ کر کے آئندہ کے لیے اپنی روش بدل لینی چاہیے۔

بچے بھی وراثت کے حقدار ہیں

پہلے وراثت کی تقسیم کے لیے کوئی قاعدہ اور ضابطہ نہیں تھا، جو کمزور ہوتا وراثت سے محروم ہو جاتا اور جو بالا دست ہوتا وہ ترکے پر قبضہ جما لیتا۔ اگر لڑکوں کو کبھی مالِ وراثت مل بھی جاتا تو لڑکیاں محروم کر دی جاتیں۔ سرورِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قرآنی حکم کے مطابق سب کے حصے متعین فرمائے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ * لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ۔ (سورۂ نساء، آیت:۱۱)

ترجمہ: اللہ تمھیں حکم دیتا ہے تمھاری اولاد کے بارے میں، بیٹے کا حصہ دو بیٹیوں برابر، پھر اگر نری لڑکیاں ہوں اگر چہ دو سے اوپر تو ان کو ترکے کی دو تہائی اور اگر ایک لڑکی تو اس کا آدھا۔ (کنزالایمان)

جمہوری اقدار کی بات کرنے والے کئی ممالک آج تک اولاد کو صحیح حقوق نہ دلا سکے، خاص کر لڑکیوں کے حوالے سے ان کی نام نہاد زبانِ عدل خاموش ہے لیکن قربان جایئے پیغمبرِ امن صلی اللہ علیہ وسلم پر کہ آپ نہ صرف لڑکوں کو وراثت کا حق دار ٹھہرا رہے ہیں بلکہ لڑکیوں کو بھی ان کی ضرورت کے مطابق لڑکوں کے حق کا نصف دلا رہے ہیں۔

تربیت، پرورش اور کھلانا پلانا باپ پر اولاد کا حق

جب تک بچے بالغ اور خود کفیل نہ ہو جائیں تب تک ان کی پرورش کرنا اور ان کے لیے کھانے پینے کا انتظام کرنا، ان کی تعلیم و تربیت کا مناسب اہتمام کرنا، سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے باپ کی ذمے داریوں میں شامل فرمایا ہے۔ اس میں خاص خوبی یہ ہے کہ

بظاہر یہ دنیوی کام لگتے ہیں لیکن آقائے رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انھیں عبادت اور کارِ ثواب قرار دیا ہے۔ حکمِ قرآن ہے:

لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ؕ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰىهَا ۔ (سورۂ طلاق، آیت:۷)

ترجمہ: مقدور والا اپنے مقدور کے قابل نفقہ دے اور جس پر اس کا رزق تنگ کیا گیا وہ اس میں سے نفقہ دے جو اسے اللہ نے دیا، اللہ کسی جان پر بوجھ نہیں رکھتا مگر اسی قابل جتنا اسے دیا ہے۔ (کنز الایمان)

حضرت ابو مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اِذَا اَنْفَقَ الرَّجُلُ عَلٰى اَهْلِهٖ يَحْتَسِبُهَا فَهُوَ لَهٗ صَدَقَةٌ ۔

(صحیح البخاری، حصہ اول، ص:۲۰)

ترجمہ: جب کوئی شخص ثواب کی نیت سے اپنے گھر والوں پر خرچ کرتا ہے تو اس پر اسے صدقے کا ثواب ملتا ہے۔

محسنِ انسانیت نبیِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ رحمت بھری فکر ہے کہ اہلِ خانہ اور اولاد پر خرچ کرنے کو نیکیوں کے حصول کا عظیم ذریعہ بنا دیا ہے۔ ایک باپ اپنی اولاد کے اخراجات کی فکر کرے تو یہ نہ سوچے کہ ٹینشن پال رہا ہے اور نہ ہی یہ سوچے کہ دنیا کے کام کر رہا ہے بلکہ اگر وہ اپنی نیت سدھار لے تو اولاد کی فکر اپنی دین داری کی فکر ہے اور بالواسطہ دین داری کا کام ہے۔

تعلیم وتربیت والدین کی بنیادی ذمے داری

بچوں کی زندگی کامیاب بنانے کے لیے انھیں علم وادب کے زیور سے آراستہ کرنا

بے حد ضروری ہے۔ اس لیے آقائے کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے والدین کی ذمے داری قرار دی ہے کہ اولاد کی تعلیم وتربیت کا انتظام کریں۔

حضرت ابورافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے سرکارِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمتِ عالیہ میں عرض کی: جس طرح بچوں پر ہمارا حق ہے کیا ہم پر بھی بچوں کا حق ہے؟ آپ نے فرمایا:

نَعَمْ، حَقُّ الْوَلَدِ عَلَى الْوَالِدِ اَنْ یُّعَلِّمَهُ الْكِتَابَةَ وَالسِّبَاحَةَ وَالرَّمْيَ، وَاَنْ یُّؤَدِّبَهٗ طَیِّبًا۔ (شعب الایمان للبیہقی، حصہ یازدہم، ص:۱۳۶)

ترجمہ: ہاں، باپ پر بیٹے کا حق یہ ہے کہ اسے لکھنا پڑھنا، تیراکی اور تیر اندازی سکھائے اور اس کی عمدہ تربیت کرے۔

اس دور میں ان فنون کی ضرورت زیادہ تھی اس لیے ان علوم وفنون کی تعلیم کی ذمے داری باپ کے سپرد کی گئی۔ تبدیلیِ زمانہ کے اعتبار سے تقاضے بدلتے ہیں، ہر زمانے کے اعتبار سے جو علوم وفنون شرعاً فرض، واجب یا مباح ہیں اور ان کی ضرورت بچوں کو ان کی زندگی میں پڑنے والی ہے ان کی تعلیم وتربیت کا اہتمام اپنی حیثیت کے مطابق کرنا باپ کی ذمے داری ہے۔

ایک اور حدیث حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ معلم کائنات حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لَاَنْ یُّؤَدِّبَ الرَّجُلُ وَلَدَهٗ خَیْرٌ لَّهٗ مِنْ اَنْ یَّتَصَدَّقَ بِصَاعٍ۔

ترجمہ: انسان کا اپنی اولاد کو ادب سکھانا ایک صاع صدقہ کرنے سے افضل ہے۔

(ترمذی شریف، حصہ:۴، ص:۳۳۷)

اسی طرح حضرت عمرو بن سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی نے اپنے بچے کو کوئی ایسی بخشش نہیں دی جو اچھے ادب سے بڑھ کر ہو۔ (ترمذی شریف، حصہ چہارم، ص: ۳۳۸)

بہت سارے والدین اولاد کے ساتھ بے انتہا لاڈ پیار کرتے ہیں، بہترین کھانے کھلاتے ہیں، عمدہ قسم کے کپڑے پہناتے ہیں لیکن ان کی تعلیم وتربیت کی فکر نہیں کرتے، انھیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان فرامین سے سبق لینا چاہیے کہ ان کے اس لاڈ پیار سے زیادہ اولاد کو ان کی تعلیم وتربیت کی ضرورت ہے اور بلاشبہہ تعلیم وتربیت کا حق دیگر حقوق پر غالب ہے۔ فقط اچھا کھلانے اور پہنانے کی فکر کرنے سے اولاد کے حقوق ادا نہیں ہو جاتے بلکہ ان کی بہترین تعلیم وتربیت کی فکر اور عمدہ انتظامات کرنے ہوں گے۔

بچوں کو دین دار بنانا والدین کی ذمے داری

اولاد اسلام کے احکام پر کاربند ہو اور اسلامی طرزِ زندگی گزارے اس کا خیال رکھنا بھی والدین کی ذمے داری قرار دی گئی۔ اگر والدین نے اس کا خیال نہ کیا تو قیامت کے دن ان سے اس کے بارے میں باقاعدہ باز پرس بھی ہوگی۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ اَلْإِمَامُ رَاعٍ وَّمَسْئُولٌ عَنْ رَّعِيَّتِهِ وَالرَّجُلُ رَاعٍ فِيْ اَهْلِهِ وَهُوَ مَسْئُولٌ عَنْ رَّعِيَّتِهِ وَالْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ فِيْ بَيْتِ زَوْجِهَا وَمَسْئُولَةٌ عَنْ رَعِيَّتِهَا۔ (صحیح البخاری، حصہ دوم، ص: ۵)

ترجمہ: ہر کوئی (کسی نہ کسی کا) ذمے دار ہے اور ہر کسی سے (قیامت کے دن) اس کے ماتحتوں کے تعلق سے سوالات ہوں گے۔ امام ذمے دار ہے اور اس سے اس کے

ماتحتوں کے تعلق سے پوچھا جائے گا، مرد اپنے گھر والوں کا ذمے دار ہے اور اس سے اپنے ماتحتوں کے تعلق سے پوچھا جائے گا، عورت اپنے شوہر کے گھر میں (اپنی اولاد) کی ذمے دار ہے اور اس سے ان کے تعلق سے پوچھا جائے گا۔

اس حدیث پاک میں معاشرے کے ہر فرد کو اپنی اپنی ذمہ داری نبھانے کی تعلیم دی گئی ہے، وجہ یہ ہے کہ معاشرے کا ہر فرد اگر اپنی ذمے داری نبھائے گا تو معاشرہ امن وسکون کا گہوارہ بن جائے گا اور اگر ایک دوسرے کی حق تلفی کی گئی، گناہوں اور بداعمالیوں پر اگر گرفت نہ کی گئی تو معاشرے سے امن وسکون اٹھ جائے گا۔

اولاد میں مساوات کا خیال ہو

سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے والدین کی ذمے داری قرار دی ہے کہ اپنے سبھی بچوں کے ساتھ یکساں معاملہ کریں اور ان کے درمیان انصاف کریں۔

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ان کے والد انھیں سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئے اور عرض کی: میں نے اپنے اس بچے کو ایک غلام دیا ہے۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دریافت کیا: کیا تم نے اپنے ہر بچے کو غلام دیا ہے؟ انھوں نے کہا: نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ ان سے بھی واپس لے لو۔

(صحیح البخاری، حصہ سوم، ص: ۱۵۷)

پتہ چلا کا نوازشات واحسانات میں بھی اولاد کے بیچ برابری کا معاملہ کرنا چاہیے۔ جب نوازشات کا یہ معاملہ ہے تو ضروریات ولوازمات میں برابری کرنا اور عدل وانصاف کا دامن تھامے رکھنا کس قدر ضروری ہے، یہ سمجھا جا سکتا ہے۔

بچیوں کو پیغمبر امن صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نئی زندگی عطا فرمائی

سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی جلوہ گری سے پہلے جن کمزوروں کو مشقِ ستم بنایا جاتا تھا ان میں بچیاں سرِ فہرست تھیں۔ کسی کے یہاں بچی کی پیدائش ہوجاتی تو اس کی کیفیت کیا ہوتی اسے قرآن نے یوں بیان کیا:

وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُمْ بِالْأُنْثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ○ يَتَوَارَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوءِ مَا بُشِّرَ بِهِ ۚ أَيُمْسِكُهُ عَلَىٰ هُونٍ أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ ۗ أَلَا سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ○ (سورۂ نحل، آیت:۵۸)

ترجمہ: اور جب ان میں کسی کو بیٹی ہونے کی خوشخبری دی جاتی ہے تو دن بھر اس کا منہ کالا رہتا ہے اور وہ غصّہ کھاتا ہے۔ لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے اس بشارت کی برائی کے سبب، کیا اسے ذلّت کے ساتھ رکھے گا یا اسے مٹی میں دبادے گا۔ ارے بہت ہی برا حکم لگاتے ہیں۔ (کنزالایمان)

بچیوں کی ولادت کو اس قدر منحوس سمجھا جاتا تھا کہ آدمی اسی میں عافیت محسوس کرتا تھا کہ انھیں زندہ دفن کر دے مگر سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کی ایسی ذہنی تربیت فرمائی اور بچیوں کو ایسا اونچا مقام عطا فرمایا کہ لوگ بچیوں کا باپ ہونے میں اپنی خوش بختی محسوس کرنے لگے تھے لیکن آج حالات پھر بدل رہے ہیں، پوری دنیا میں بڑی خاموشی کے ساتھ یہ جہالت پھر سے زندہ ہو رہی ہے۔ اس کا علاج پیغمبرِ امن صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو اپنا کر ہی ہوسکتا ہے۔

بیٹی پر بیٹے کو ترجیح نہ دی جائے

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ آقائے رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مَنْ كَانَتْ لَهُ أُنْثَىٰ فَلَمْ يَئِدْهَا وَلَمْ يُهِنْهَا وَلَمْ

يُؤْثِرْ وَلَدَهُ عَلَيْهَا اَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ۔ (سنن ابی داؤد، حصہ چہارم، ص: ۳۳۷)

ترجمہ: جس کے پاس بیٹی ہو اور اس نے اسے زندہ در گور نہیں کیا، نہ ہی اسے حقیر جانا اور نہ ہی اپنے بیٹوں کو اس پر ترجیح دی، اللہ اس کو جنت میں داخل فرمائے گا۔

پیغمبرِ امن صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ ہے کہ بیٹیوں کے ساتھ بیٹوں کے برابر حسنِ سلوک کیا جائے، ان کی تربیت و تعلیم میں بیٹوں کی مثل کوششیں کی جائیں اور انھیں کہیں بھی یہ احساس ہونے نہ دیا جائے کہ بیٹے ان سے زیادہ عزیز ہیں۔

بیٹیوں کی پرورش جنت میں داخلے کا ذریعہ

اہلِ عرب جو بیٹیوں کو اپنے لیے زحمت سمجھتے تھے ان کے سامنے نبی رحمت سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بیٹیوں کو عظیم رحمت کی شکل میں پیش فرمایا۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مَنْ عَالَ ثَلَاثَ بَنَاتٍ فَاَدَّبَهُنَّ وَزَوَّجَهُنَّ وَاَحْسَنَ اِلَيْهِنَّ فَلَهُ الْجَنَّةُ۔ (سنن ابی داؤد، حصہ چہارم، ص: ۳۳۸)

ترجمہ: جس نے تین بچیوں کی پرورش کی، انھیں ادب سکھایا، ان کا نکاح کر دیا اور ان کے ساتھ بہتر سلوک کیا تو اس کے لیے جنت ہے۔

پتہ چلا کہ بیٹیاں زحمت نہیں بلکہ سراپا رحمت ہیں۔ جس کے پاس بیٹیاں جس قدر زیادہ ہیں، اس کا نصیب اسی قدر روشن ہے۔ بیٹیوں کو بوجھ سمجھ کر پرورش کرنے والے اپنی سوچ کی اصلاح کر لیں تو یہ پرورش ان کی اخروی کامیابی کی ضامن بن جائے۔

بیٹیوں کو بیٹوں پر فضیلت مل سکتی تھی

بچوں کو سہولیات فراہم کرنے اور ان کے لیے کھانے پینے کا انتظام کرنے کے تعلق

سے مساوات کا خیال رکھنا ضروری قرار دیا گیا ہے، جو انتظام ایک بچے کے لیے کیا جائے وہی سب کے لیے کیا جائے، یہی آقاے رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعلیم ہے۔ البتہ بچیوں کے حقوق کو مؤکد کرنے کے لیے آپ نے فرمایا کہ اولاد میں اگر کسی کو کسی پر ترجیح دی جاتی تو بچیاں ترجیح پانے کی زیادہ مستحق تھیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سَوُّوا بَيْنَ اَوْلَادِكُمْ فِي الْعَطِيَّةِ فَلَوْ كُنْتُ مُفَضِّلًا اَحَدًا لَفَضَّلْتُ النِّسَاءَ۔ (السنن الکبریٰ للبیہقی، حصہ ششم، ص: ۲۹۴)

ترجمہ: لین دین کے معاملے میں اپنے بچوں میں برابری کا خیال کرو۔ اگر کسی کو میں ترجیح دیتا تو بچیوں کو ترجیح دیتا۔

بیٹیاں جہنم سے نجات کا ذریعہ

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے، آپ فرماتی ہیں: ایک خاتون میرے پاس مانگنے آئیں، جن کے ساتھ دو بیٹیاں تھیں، ان کو میرے پاس سے ایک کھجور کے علاوہ کچھ نہیں ملا۔ جب میں نے وہ کھجور انھیں دیا تو انھوں نے اپنی دونوں بیٹیوں کے درمیان اسے تقسیم کر دیا اور اس میں سے خود کچھ بھی نہیں کھایا، پھر وہ چلی گئیں۔ جب آقاے کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تشریف لائے تو میں نے انھیں اس بارے میں بتایا۔ آپ نے فرمایا: مَنِ ابْتُلِيَ مِنْ هٰذِهِ الْبَنَاتِ بِشَيْءٍ كُنَّ لَهُ سِتْرًا مِنَ النَّارِ۔

ترجمہ: جو بچیوں کے ذریعے آزمایا گیا وہ اس کے لیے جہنم سے حجاب ہوں گی۔

(صحیح البخاری، حصہ دوم، ص: ۱۱۰)

پیغمبرِ امن صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ چند دنوں میں عربوں کی

کا یا پلٹ گئی، جو بچیوں کو زندہ درگور کرتے تھے وہ بچیوں کی پرورش میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے اور ان کی دیکھ ریکھ اور بہتر تعلیم وتربیت کو اپنی نجات اور مغفرت کا ذریعہ سمجھنے لگے۔

بچیوں کی ضروریات اور لوازمات کی تکمیل میں جب پریشانیوں کا سامنا ہوتا ہے تو والدین اپنی قسمت کو کوسنے لگتے ہیں نیز بچیوں کو برا کہنے لگ جاتے ہیں، انھیں پیغمبرِ امن صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو اپنانے کی اشد ضرورت ہے۔

پیغمبرِ امن صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہنوں کے حقوق محفوظ کیے

نبی آخر الزماں سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بھائیوں پر بہنوں کے حقوق مقرر فرمائے اور جو شخص اپنی بہنوں کے ساتھ حسنِ سلوک کرے اس کے لیے اجر وثواب کی بشارت عطا فرمائی ہے۔ بلکہ وہ حدیث پاک جس میں آقائے کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے والدین کی وفات کے بعد ان کے ساتھ حسنِ سلوک کا طریقہ یہ بتایا کہ وہ رشتے داریاں قائم رکھی جائیں جو والدین کے ذریعے ہی قائم ہوسکتی ہیں، ان میں سب سے پہلے بہنوں کا مقام آتا ہے۔

بہن کے ساتھ حسنِ سلوک صدقے سے افضل ہے

حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اپنی باندی کو آزاد کرنے کے تعلق سے پوچھا تو آپ نے فرمایا:

اَرَاَیْتِ جَارِیَتَكِ الَّتِی کُنْتِ اسْتَاْمَرْتِنِی فِی عِتْقِهَا اَعْطِیْهَا اُخْتَكِ وَصِلِی بِهَا رَحِمَهَا تَرْعٰی عَلَیْهَا فَاِنَّهٗ خَیْرٌ لَكِ۔ (مؤطا مالک، حصہ دوم، ص: ۱۴۵)

ترجمہ: تم نے جس باندی کے تعلق سے مجھ سے آزاد کرنے کی اجازت مانگی تھی اسے اپنی بہن کے حوالے کر دو اور اس طرح ان کے ساتھ صلہ رحمی کرو، وہ باندی ان کی

خدمت کرے گی یہ تمھارے لیے زیادہ بہتر ہے۔

جس معاملے میں بھی رشتے داروں کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم ہے اس میں بہن زیادہ مستحق ہے، اس لیے کہ وہ سب سے زیادہ قریبی ہوتی ہے۔ خصوصًا والدین کے انتقال کے بعد ان کے ساتھ حسنِ سلوک کا زیادہ خیال رکھنا چاہیے۔

بہن کی پرورش بیٹی کی پرورش کے برابر ہے

بیٹیوں کی پرورش اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک پر جنت کا وعدہ فرمایا گیا ہے۔ اسی طرح بہنوں کی پرورش اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک بھی جنت میں لے جانے والا عمل ہے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لَا يَكُوْنُ لِاَحَدٍ ثَلَاثُ بَنَاتٍ، اَوْ ثَلَاثُ اَخَوَاتٍ، اَوْ ابْنَتَانِ، اَوْ اُخْتَانِ، فَيَتَّقِي اللهَ فِيْهِنَّ وَيُحْسِنُ اِلَيْهِنَّ اِلَّا دَخَلَ الْجَنَّةَ۔

(مسند احمد، حصہ: ۱۷، ص: ۴۷۶)

ترجمہ: جس کی تین بیٹیاں یا تین بہنیں ہوں یا دو بیٹیاں یا دو بہنیں ہوں، وہ ان کے معاملے میں اللہ سے ڈرے اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرے تو جنت میں داخل ہوگا۔

کبھی بعض بہنوں کی دیکھ بھال کی ذمے داری والدین کے انتقال یا شوہروں کے طلاق کے بعد بھائیوں پر آجاتی ہے تو وہ سخت بوجھ محسوس کرتے ہیں اور ذمے داری قبول کرنے سے کتراتے ہیں، انھیں پیغمبرِ امن صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے پیشِ نظر اپنی اصلاح کی ضرورت ہے۔

وفات کے بعد بھی بہن حسنِ سلوک کی مستحق ہے

کسی کی بہن کا انتقال ہو جائے اور اس کے ذمے قرض ہو یا اس کی کوئی عبادت قضا

ہوگئی ہوتو اس کو ادا کرنا بعدِ وفات اس کے ساتھ حسنِ سلوک ہے۔ اسی طرح اس کی اولاد کی خبر گیری کرنا اور ان کی کفالت کرنا بھی بہن کے ساتھ حسنِ سلوک ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں:

جَاءَتِ امْرَأَةٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ: يَا رَسُوْلَ اللهِ اِنَّ اُخْتِيْ مَاتَتْ وَعَلَيْهَا صِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ، قَالَ: اَرَاَيْتِ لَوْ كَانَ عَلٰى اُخْتِكِ دَيْنٌ، اَكُنْتِ تَقْضِيْنَهٗ؟ قَالَتْ: بَلٰى، قَالَ: فَحَقُّ اللهِ اَحَقُّ۔

(سنن ابن ماجہ، حصہ اول، ص: ۵۵۹)

ترجمہ: ایک خاتون نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں آئیں اور عرض کیں: یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیک وسلم! میری بہن کا انتقال ہوگیا ہے اور اس کے ذمے مسلسل دو مہینوں کے روزے باقی تھے۔ (تو کیا میں کچھ کرسکتی ہوں؟) نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: اس بارے میں تمھارا کیا خیال ہے کہ اگر تمھاری بہن کے ذمے قرض باقی ہوتا تو کیا تم اس قرض کو ادا کرتی؟ انھوں نے کہا: ہاں۔ آپ نے فرمایا: تو اللہ کا حق ادا کیا جائے یہ زیادہ ضروری ہے۔

جب بہن کی چھوٹی ہوئی عبادت کی فکر کرنی چاہیے تو پھر اس کی چھوڑی ہوئی اولاد کی فکر کرنی کس قدر ضروری ہے، اس کا بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنی رضاعی بہن کے ساتھ حسنِ سلوک

نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حقیقی بھائی بہن نہ تھے بلکہ جو بھی تھے رضاعی بھائی بہن تھے۔ حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی بیٹی شیما بنت حارث بھی اپنی والدہ کے ساتھ بچپن میں نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت کیا کرتی تھیں۔

جنگ اوطاس میں جو قیدی گرفتار ہوئے تھے ان میں سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی رضاعی بہن شیما بنت حارث بھی تھیں۔ انھوں نے مسلمان فوج سے کہا: میں تمھارے نبی کی بہن ہوں۔ مسلمان ان کو شناخت کے لیے حضور رحمتِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں لائے تو انھوں نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کہا: میں آپ کی رضاعی بہن ہوں۔ آپ نے پوچھا: اس کی کیا علامت ہے؟ انھوں نے کہا: آپ کو یاد ہوگا کہ بچپن میں میں نے ایک مرتبہ آپ کو اپنی پیٹھ پر اٹھایا تھا تو آپ نے میری پیٹھ پر دانت سے کاٹ لیا تھا۔ نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انھیں پہچان لیا، اپنی چادرِ مبارک زمین پر بچھا کر ان کو بٹھایا اور ان کی تعظیم کی۔ پھر آپ نے ان سے کہا: اگر چاہو تو میرے پاس ہی رہ جاؤ، یہاں تم کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی اور اگر چاہو تو میری طرف سے کچھ تحفے قبول کرلو اور اپنے گھر واپس چلی جاؤ۔ انھوں نے کہا: میں گھر واپس جانا چاہتی ہوں۔ نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انھیں کچھ اونٹ اور بکریاں دیں اور فرمایا کہ تم جاسکتی ہو۔

(سیرت ابن ہشام، حصہ دوم، ص:۴۵۸)

حقیقی بہن تو حقیقی بہن ہے، اس کا حق تو بہت اونچا ہے، نبیِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کردار سے یہ سبق دے دیا کہ رضاعی بہن کے حقوق بھی فراموش نہیں کیے جاسکتے نیز رضاعی بہن بھی حقیقی بہن کی طرح اکرام واعزاز اور ادائیگیِ حقوق کی مستحق ہے۔

بہنوں کی دیکھ ریکھ کے لیے بیوہ سے شادی کی

نبیِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے چشمۂ فیض سے سیراب ہونے والے صحابۂ کرام پر سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعلیمات کا اثر کس قدر ہوتا تھا اس واقعے میں ملاحظہ کریں۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں:

میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک غزوے میں تھا، میرا اونٹ تھک کر سست ہو گیا، اتنے میں میرے پاس نبیِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تشریف لائے اور فرمایا: جابر! میں نے عرض کی: حضور حاضر ہوں۔ فرمایا: کیا بات ہوئی؟ میں نے کہا: میرا اونٹ تھک کر سست ہو گیا ہے، چلتا ہی نہیں، اس لیے میں پیچھے رہ گیا ہوں۔ آپ اپنی سواری سے اترے، میرے اونٹ کو ایک ٹیڑھے منہ کی لکڑی سے ہانکنے لگے اور فرمایا کہ اب سوار ہو جا۔ میں سوار ہو گیا، اب تو اس قدر تیزی سے چلنے لگا کہ مجھے اسے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے برابر پہنچنے سے روکنا پڑ جاتا تھا۔

آقاے رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: جابر تو نے شادی کر لی؟ میں نے عرض کی جی ہاں۔ دریافت فرمایا: کسی کنواری لڑکی سے کی ہے یا بیوہ سے؟ میں نے عرض کی: میں نے تو ایک بیوہ سے کر لی ہے۔ فرمایا: کسی کنواری لڑکی سے کیوں نہ کی کہ تم اس کے ساتھ کھیلتے اور وہ بھی تمھارے ساتھ کھیلتی۔ میں نے عرض کی: میری کئی بہنیں ہیں، اس لیے میں نے یہی پسند کیا کہ ایسی عورت سے شادی کروں، جو انھیں جمع رکھے، ان کے بالوں میں کنگھا کرے اور ان کی نگرانی کرے۔ آقاے رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: اب تم خیر و عافیت کے ساتھ گھر پہنچ کر خوب مزے اڑانا۔

اس کے بعد فرمایا: کیا تم اپنا اونٹ بیچو گے؟ میں نے کہا: جی ہاں۔ آپ نے ایک اوقیہ چاندی میں خرید لیا۔ آپ مجھ سے پہلے ہی مدینے پہنچ گئے تھے اور میں دوسرے دن صبح کو پہنچا۔ پھر جب میں مسجد آیا تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مسجد کے دروازے پر ملے۔ آپ نے دریافت فرمایا: کیا ابھی آئے ہو؟ میں نے عرض کی: جی ہاں۔ فرمایا: پھر اپنا اونٹ چھوڑ دو اور مسجد میں جا کے دو رکعت نماز پڑھو۔ میں نے اندر جا کر نماز پڑھی۔ آپ نے حضرت

بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا کہ میرے لیے ایک اوقیہ چاندی تول دیں۔ انھوں نے ایک اوقیہ چاندی جھکتی ہوئی تول دی۔ میں پیٹھ موڑ کر چلا تو آپ نے فرمایا: جابر کو ذرا بلاؤ۔ میں نے سوچا کہ شاید اب میرا اونٹ پھر مجھے واپس کریں گے، حالانکہ اس سے زیادہ ناگوار میرے لیے کوئی چیز نہیں تھی۔ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ اپنا اونٹ لے جاؤ اور اس کی قیمت بھی تمھاری ہے۔ (صحیح البخاری، حصہ سوم، ص: ٦٢)

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کنوارے تھے لیکن انھوں نے اپنی بہنوں کے واسطے باکرہ سے شادی نہ کرتے ہوئے بیوہ سے شادی کی تاکہ وہ عورت ان کی بہنوں کی صحیح طور پر دیکھ ریکھ کر سکے۔ غالباً اسی لیے سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انھیں اونٹ کی قیمت بھی دے دی اور اونٹ بھی ہبہ فرما دیا۔

پیغمبر امن صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھائیوں کے حقوق متعین فرمائے

جس طرح بھائی پر بہن کے حقوق ہیں اسی طرح بہن پر بھی بھائی کے حقوق ہیں نیز ایک بھائی کے دوسرے بھائی پر بھی اسی طرح حقوق ہیں۔ یہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہی کی ذات ہے جنھوں نے ہر چھوٹے بڑے کو اس کا حق دلایا اور سب کے حقوق محفوظ فرما کر دنیا میں امن قائم فرمایا۔

سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھائیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم فرمایا

حضرت ابورمثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں: میں نبیِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس گیا تو میں نے آپ کو فرماتے ہوئے سنا:

بَرَّ اُمَّكَ وَاَبَاكَ وَاُخْتَكَ وَاَخَاكَ ثُمَّ اَدْنَاكَ اَدْنَاكَ۔

(مستدرک حاکم، حصہ چہارم، ص: ١٦٧)

ترجمہ: اپنی والدہ کے ساتھ، والد کے ساتھ، بہن کے ساتھ، بھائی کے ساتھ اور قریبی رشتے داروں کے ساتھ حسنِ سلوک کرو۔

معلوم ہوا کہ نبیِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تعلیم ہے کہ دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ بھائی بھی حسنِ سلوک کا مستحق ہے۔آج کے زمانے میں جہاں عمومی رشتوں کا پاس ولحاظ ختم ہورہا ہے وہیں بھائیوں کے حقوق بھی تلف کئے جارہے ہیں۔حقوق ادا کرنا تو دور کی بات ہے، ایک دوسرے کا جینا دوبھر کردیا جاتا ہے۔ایسے ماحول میں امن کی بحالی کے لیے نظام مصطفیٰ کو اپنانے کی ضرورت ہے۔

چھوٹا بھائی بڑے کی تعظیم کرے، بڑا بھائی چھوٹے پر مہربانی کرے

نبیِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہ تعلیم فرمائی کہ چھوٹا بھائی بڑے بھائی کی تعظیم کرے اور بڑا بھائی چھوٹے بھائی پر مہربانی کرے۔ جو اس ضابطے کی خلاف ورزی کرتا ہے اس کے تعلق سے آپ نے فرمایا کہ وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا وَيُوَقِّرْ كَبِيْرَنَا۔

(سنن الترمذی، حصہ چہارم، ص: ۳۲۲)

ترجمہ: جو چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور بڑوں کی تعظیم نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں۔

فی زمانناد دونوں ہی چیزوں کا فقدان ہے، نہ چھوٹے بڑوں کی تعظیم کررہے ہیں اور نہ ہی بڑے چھوٹوں پر شفقت۔قطع رحمی کا خطرناک ماحول پروان چڑھ رہا ہے جس کی بنیاد پر آپس میں فتنہ وفساد کا بازار گرم ہوجاتا ہے۔کوئی بھی بھائی اپنے بھائی کی جانب سے پرامن رہنا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ پہلے وہ خود پرامن ہوجائے اور پرامن ہونے کا طریقہ وہی

ہے جو امن دہندہ رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے۔

بھائی سے ملاقات باعثِ برکت ہے

حضرت ابورزین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

يَا اَبَا رَزِينٍ هَلْ شَعَرْتَ اَنَّ الرَّجُلَ اِذَا خَرَجَ مِنْ بَيْتِهٖ زَائِرًا اَخَاهُ شَيَّعَهٗ سَبْعُوْنَ اَلْفَ مَلَكٍ كُلُّهُمْ يُصَلُّوْنَ عَلَيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ: رَبَّنَا اِنَّهٗ وَصَلَ فِيْكَ فَصِلْهُ؟ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تُعْمِلَ جَسَدَكَ فِيْ ذٰلِكَ فَافْعَلْ۔

(شعب الایمان للبیہقی، حصہ:۱۱، ص:۳۲۹)

ترجمہ: جب کوئی شخص اپنے بھائی سے ملاقات کرنے کے لیے اپنے گھر سے نکلتا ہے تو ستر ہزار فرشتے اسے گھیر لیتے ہیں، سب کے سب اس کے لیے دعاے رحمت کرتے ہیں اور کہتے ہیں: اے اللہ اس نے تیری رضا کے لیے رشتہ جوڑا ہے تو تو اس کے ساتھ اچھا معاملہ فرما۔ اگر تم اپنے جسم کو اس کام میں مشغول کر سکتے ہو تو کر لو۔

جب بھائی سے ملاقات کے اتنے فائدے ہیں تو پھر بھائی کے ساتھ احسان اور بھلائی کرنے کے کس قدر فائدے ہوں گے؟ بھائیوں کی مخالفت وعداوت میں زندگی گزارنے والوں کو رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے رہنمائی لے کر اپنی اصلاح کرنے کی ضرورت ہے۔

اپنے بھائی کی مدد کرنے والے اللہ کی امداد پاتے ہیں

اگر کسی کا بھائی تنگدست اور مفلوک الحال ہو تو اسے چاہیے کہ اپنے بھائی کی مدد کرے۔ یہ مدد کرنا خود اسے بھی دنیا اور آخرت میں کام آ سکتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ سید کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: وَاللّٰهُ فِي عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِي عَوْنِ اَخِيْهِ۔

(صحیح مسلم، حصہ چہارم، ص: ۲۰۷۴)

ترجمہ: جو کوئی شخص اپنے بھائی کی مدد کرتا ہے اللہ اس کی مدد کرتا ہے۔

بھائی کی مدد کرنا کس قدر عظیم رتبہ رکھتا ہے! اگر کوئی امدادِ ربانی چاہتا ہو تو وہ اپنے بھائی کی مدد میں لگ جائے اور اپنے بھائی کی مشکل آسان کرے، اللہ تعالیٰ اس کی امداد فرما کر اس کی بڑی سے بڑی مشکل آسان فرمائے گا۔

بھائی کا قرض ادا کرنا قیامت کے دن کام آئے گا

کسی کا بھائی قرض دار ہے اور اس کے ادا کرنے کی طاقت نہیں ہے تو اسے چاہیے کہ اپنے بھائی کا قرض ادا کردے۔ یہ عمل قیامت کے دن اسے اپنی گردن کو آگ سے رہائی دلانے میں کام آئے گا۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَيْسَ مِنْ عَبْدٍ مُسْلِمٍ يَقْضِي عَنْ اَخِيْهِ دَيْنَهٗ اِلَّا فَكَّ اللّٰهُ رِهَانَهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ (شرح السنۃ للبغوی، حصہ ہشتم، ص: ۲۱۴)

ترجمہ: جو کوئی مسلمان بندہ اپنے بھائی کا قرض ادا کرے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی گردن آزاد فرمائے گا۔

حضور رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم تو بھائی کا قرض ادا کرنے کا حکم فرما رہے ہیں اور آج حالات ایسے پیدا ہو گئے ہیں کہ کوئی بھائی کو قرض دینے کو بھی تیار نہیں ہے۔ خاص کر اہلِ

اسلام کو اس حوالے سے اپنی اصلاح کی سخت ضرورت ہے۔

بھائی بھائی میں تفریق کرنے والے پر لعنت

دو بھائیوں کو باہم غلط فہمی میں مبتلا کر کے دست و گریباں کر دینا بعض لوگ پسند کرتے ہیں، کبھی کبھی کسی دنیوی غرض کے لیے یہ فعل انجام دیتے ہیں۔ انھیں سمجھ لینا چاہیے کہ بھائی بھائی کو آپس میں لڑانا رحمتِ خداوندی سے دور کرنے والا کام ہے۔

حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

لَعَنَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ فَرَّقَ بَيْنَ الْوَالِدَةِ وَوَلَدِهَا وَبَيْنَ الْاَخِ وَبَيْنَ اَخِيْهِ۔ (سنن ابن ماجہ، حصہ دوم، ص:۷۵۶)

ترجمہ: جو شخص ماں، بیٹے کے درمیان یا بھائی بھائی کے درمیان جدائی پیدا کرے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس پر لعنت فرمائی ہے۔

جو لوگ چغل خوری اور فتنوں کے ذریعے اس طرح کے کام کرتے ہیں، انھیں اس سخت وعید سے سبق لینا چاہیے ورنہ پوری زندگی لعنت سے بھرپور ہوگی۔

تفریق کرانے والے جدائی کرا دیتے ہیں اور جدا ہونے والے جدائی پر قائم رہتے ہیں حالاں کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ یہ قطع رحمی ہے، اس کے حوالے سے پیغمبرِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے ضابطہ عطا فرمایا ہے:

اَفْضَلُ الْفَضَائِلِ اَنْ تَصِلَ مَنْ قَطَعَكَ، وَتُعْطِيَ مَنْ مَّنَعَكَ، وَتَصْفَحَ عَمَّنْ شَتَمَكَ۔ (مسند احمد، حصہ: ۲۴، ص: ۳۸۳)

ترجمہ: سب سے بڑھ کر فضیلت والا کام یہ ہے کہ جو تم سے رشتہ توڑے اس سے تم رشتہ جوڑو، جو تمھیں دینے سے منع کر دے اس کو دو اور جس نے تمھیں برا بھلا کہا اس سے

درگزر کردو۔

بھائی کے لیے جگہ میں وسعت کرنا اس کا حق ہے

حضرت واثلہ بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

دَخَلَ رَجُلٌ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَھُوَ فِی الْمَسْجِدِ قَاعِدٌ فَتَزَحْزَحَ لَہٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ الرَّجُلُ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنَّ فِی الْمَکَانِ سَعَۃً فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: اِنَّ لِلْمُسْلِمِ لَحَقًّا اِذَا رَاٰہُ اَخُوْہُ اَنْ یَتَزَحْزَحَ لَہٗ۔ (شعب الایمان، حصہ:۱۱،ص:۲۷۳)

ترجمہ: نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مسجد میں جلوہ فرما تھے کہ ایک شخص داخل ہوئے۔ آپ نے سرک کر انھیں جگہ دی۔ انھوں نے عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم! جگہ میں وسعت تو تھی۔ آپ نے فرمایا: مسلمان کا حق ہے کہ جب اس کا بھائی اس کو دیکھے تو سرک کر اس کے لیے جگہ بنائے۔

کیسا عظیم پیغامِ رحمت ہے کہ بھائی کے ساتھ حسنِ سلوک کا جذبہ اتنی شدت سے ہو کہ بلا ضرورت بھی اس کا بھرپور خیال رکھا جائے۔ پھر جہاں کسی بھائی کو مدد کی ضرورت ہو وہاں اس کا خیال کرنا تو اشد ضروری ہوگا۔

ضرورت سے زائد چیز بھائی کو دینی چاہیے

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ بعض حضرات کے پاس فاضل زمینیں تھیں، انھوں نے آپس میں کہا کہ ہم چوتھائی یا تہائی یا نصف کے بدلے یہ زمین اجرت پر دے دیتے ہیں۔ تو پیغمبرِ امن صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ کَانَتْ لَہٗ اَرْضٌ، فَلْیَزْرَعْھَا اَوْ لِیَمْنَحْھَا اَخَاہُ، فَاِنْ اَبٰی،

فَلْيُمْسِكْ اَرْضَهٗ۔ (صحیح البخاری، حصہ سوم، ص:۱۶۶)

ترجمہ: جس کے پاس زمین ہو تو اسے چاہیے کہ اس میں کھیتی کرے یا پھر اپنے بھائی کو وہ زمین دے دے۔ اب اگر وہ لینے سے انکار کرتا ہے تو اسے اپنے پاس رکھے۔

حضور رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی پیغام ہے کہ بھائی کی خبر گیری کرتے رہنا چاہیے، اس کی ضرورتوں کا بھرپور خیال رکھنا چاہیے اور اس کے مانگنے سے پہلے اپنی طرف سے پیش کر دینا چاہیے۔

تین دن سے زیادہ قطعِ کلام درست نہیں

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ آقائے نعمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لَا تَبَاغَضُوْا وَلَا تَحَاسَدُوْا وَلَا تَدَابَرُوْا وَ كُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا، وَلَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ اَنْ يَهْجُرَ اَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثَةِ اَيَّامٍ۔

(صحیح البخاری، حصہ ہشتم، ص:۱۹)

ترجمہ: آپس میں ایک دوسرے سے بغض، حسد اور قطع تعلق مت کرو بلکہ اے خدا کے بندو! باہم بھائی چارگی کے ساتھ رہو۔ کسی مسلمان کے لیے اپنے بھائی کو تین دنوں سے زیادہ چھوڑے رکھنا جائز نہیں ہے۔

جو لوگ معمولی معمولی باتوں پر سالوں تک کے لیے قطع تعلق کر لیتے ہیں، اپنے آپ کا محاسبہ کریں اور اپنے عمل کی خرابی کا اندازہ لگائیں۔ اگر کبھی کسی وجہ سے باہم اختلاف ہو جائے تو اختلاف جلد ختم کر کے ملاپ کی فکر کرنی چاہیے۔

جو کوئی اختلاف کو ختم کرنے میں پیش قدمی کرے گا اس کو پیغمبرِ امن صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سب سے بہتر قرار دیا ہے۔

حضرت ابوایوب انصاری سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لَا يَحِلُّ لِرَجُلٍ اَنْ يَهْجُرَ اَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثِ لَيَالٍ، يَلْتَقِيَانِ: فَيُعْرِضُ هٰذَا وَيُعْرِضُ هٰذَا، وَخَيْرُهُمَا الَّذِيْ يَبْدَأُ بِالسَّلَامِ۔ (ایضًا، ص:۲۱)

ترجمہ: کسی شخص کے لیے اپنے بھائی کو تین دنوں سے زیادہ چھوڑے رکھنا جائز نہیں ہے کہ دونوں ملیں تو اِدھر اُدھر منہ پھیر لیں۔ ان دونوں میں بہتر وہ ہے جو پہلے سلام کرے۔

پیغمبر امن صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عورتوں کو عزت کا تاج عطا فرمایا

سرورِ کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی جلوہ گری سے پہلے عورتوں کا بہت برا حال تھا، کوئی ان کا پرسان حال نہ تھا۔ تمام حقوق و کرامات سے وہ محروم تھیں۔ زمانۂ جاہلیت میں عورت کو کسی چیز کا مالک بننے کا حق حاصل نہ تھا۔ عورتوں کو کوئی وارثت نہ ملتی تھی، صرف مردوں کو وارث بننے کا حق حاصل تھا، اس پر اُن کی دلیل یہ تھی کہ وہ ہتھیار اُٹھاتے ہیں، قبیلوں کا دفاع کرتے ہیں جب کہ عورت صرف کھاتی، پیتی ہیں اور خاندان والوں کے لیے بوجھ ہوتی ہے۔ ان کے معاشرے میں عورتوں کو محض میراث سے محروم کرنے پر اکتفا نہ کیا گیا تھا بلکہ وہ عورت کو بھی وراثت میں سامان کی طرح بانٹ دیتے تھے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب عورت کا شوہر مرجاتا تو شوہر کے ورثا اس عورت کے حقدار ہوتے، اگر وہ چاہتے تو ان میں سے کوئی اس سے شادی کر لیتا تھا یا جس سے چاہتے اُسی سے اس کی شادی کرا دیتے اور چاہتے تو نہ کراتے۔ اس طرح عورت کے سسرال والے اُس کے میکے والوں سے زیادہ اس پر حق رکھتے تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ؕ وَلَا

تَعۡضُلُوۡهُنَّ لِتَذۡهَبُوۡا بِبَعۡضِ مَاۤ اٰتَيۡتُمُوۡهُنَّ اِلَّاۤ اَنۡ يَّاۡتِيۡنَ بِفٰحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ‌ۚ وَعَاشِرُوۡهُنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ‌ۚ فَاِنۡ كَرِهۡتُمُوۡهُنَّ فَعَسٰۤى اَنۡ تَكۡرَهُوۡا شَيۡـئًا وَّيَجۡعَلَ اللّٰهُ فِيۡهِ خَيۡرًا كَثِيۡرًا ○ (سورۂ نساء، آیت:۱۹)

ترجمہ: اے ایمان والو! تمھیں حلال نہیں کہ عورتوں کے وارث بن جاؤ زبردستی اور عورتوں کو روکو نہیں اس نیت سے کہ جو مہر اُن کو دیا تھا اس میں سے کچھ لے لو مگر اس صورت میں کہ صریح بے حیائی کا کام کریں اور ان سے اچھا برتاؤ کرو۔ پھر اگر وہ تمھیں پسند نہ آئیں تو قریب ہے کہ کوئی چیز تمھیں ناپسند ہو اور اللہ اس میں بہت بھلائی رکھے۔ (کنز الایمان)

(صحیح البخاری، حصہ ششم، ص:۴۴)

محسنِ انسانیت سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے معاشرے میں عورتوں کے لیے بھی حقوق متعین فرمائے اور انھیں بھی مقام و مرتبہ عطا فرمایا۔

سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دنیا کی چیزوں میں عورت محبوب ہے

دیگر معاشروں نے عورت کو کانٹے کی طرح زندگی کی رہ گزر سے مٹانے کی کوشش کی مگر پیغمبرِ امن صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بعض حالتوں میں اسے مردوں سے زیادہ فوقیت اور عزت واحترام عطا کیا ہے۔ وہ ہستی جو پوری کائنات کے لیے رحمت بن کر تشریف لائی اس نے اس مظلوم طبقے کو یہ مژدۂ جانفزا سنایا: حُبِّبَ اِلَیَّ مِنَ الدُّنۡیَا النِّسَاءُ وَالطِّیۡبُ وَجُعِلَ قُرَّۃُ عَیۡنِیۡ فِی الصَّلٰوۃِ۔ (سنن النسائی، حصہ ہفتم، ص:۶۱)

ترجمہ: مجھے دنیا کی چیزوں میں سے عورتیں اور خوشبو پسند ہے اور میری آنکھوں کی

ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔

عورتوں کو بھی علم اور ادب سکھایا جائے

علم حاصل کرنا ہر مسلمان کے لیے ضروری قرار دیا گیا اور آقاے کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان والدین کو اجر وثواب کا مستحق قرار دیا جو اپنی اولاد، خاص کر بچیوں کے لیے تعلیم وتادیب کا اہتمام کرتے ہیں۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مَنْ عَالَ ثَلَاثَ بَنَاتٍ فَأَدَّبَهُنَّ وَزَوَّجَهُنَّ وَأَحْسَنَ إِلَيْهِنَّ فَلَهُ الْجَنَّةُ۔ (سنن ابی داؤد، حصہ چہارم، ص:۳۳۸)

ترجمہ: جس نے تین بچیوں کی پرورش کی، انھیں ادب سکھایا، ان کا نکاح کر دیا اور ان کے ساتھ بہتر سلوک کیا تو اس کے لیے جنت ہے۔

خیر القرون میں جس طرح علم مردوں میں پھیلا، اسی طرح عورتوں میں بھی عام ہوا۔ صحابہ کے درمیان قرآن وحدیث اور علم طب وغیرہ کا علم رکھنے والی خواتین بڑی تعداد میں ملتی ہیں۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں مسائل کا استنباط اور فتویٰ دینا بڑا ہی مشکل اور نازک کام ہے لیکن پھر بھی اس میدان میں عورتیں پیچھے نہیں تھیں بلکہ بہت سے صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے برابر تھیں، جن میں سے کچھ کے اسما درجِ ذیل ہیں:

(۱) حضرت عائشہ (۲) حضرت ام سلمہ (۳) حضرت ام عطیہ (۴) حضرت صفیہ (۵) حضرت ام حبیبہ (۵) حضرت اسماء بنت ابو بکر (۶) حضرت ام شریک (۷) حضرت فاطمہ بنت قیس وغیرہن رضی اللہ تعالیٰ عنہن۔

عورتوں کے لیے بھی باقاعدہ معاشی حقوق ہیں

آقاے رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے عورت کا نان ونفقہ ہر حالت میں مرد کے

ذمے قرار دیا ہے۔ اگر بیٹی ہے تو باپ کے ذمے، بیوی ہے تو شوہر کے ذمے اور ماں ہے تو بیٹے کے ذمے اس کے اخراجات ہیں۔ بیٹی کی حیثیت سے باپ کو اس کا کفیل بنایا گیا اس تعلق سے حدیث گزر چکی ہے، شوہر کے تعلق سے قرآن مقدس نے فرمایا:

عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ۔ (سورۂ بقرہ، آیت: ۲۳۶)

ترجمہ: مقدور والے پر اس کے لائق اور تنگدست پر اس کے لائق۔ (کنزالایمان)

شوہر پر عورت کا حق مہر ادا کرنا واجب قرار دیا گیا ہے۔ فرمانِ قرآن ہے:

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓــًٔا مَّرِیْٓــًٔا ○ (سورۂ نساء، آیت: ۴)

ترجمہ: اور عورتوں کو ان کے مہر خوشی سے دو، پھر اگر وہ اپنے دل کی خوشی سے مہر میں سے تمھیں کچھ دے دیں تو اسے کھاؤ رچتا پچتا۔ (کنزالایمان)

پہلے عورتوں کے مہر ان کے اولیا لے لیا کرتے تھے اور عورتوں کو مہر کا کچھ حصہ نہیں دیا جاتا تھا۔ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس ظلم سے بھی عورت کو نجات دلائی۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ مَہر کی مستحق عورتیں ہیں نہ کہ ان کے اولیا۔ اگر اولیا نے مَہر وصول کر لیا ہو تو انھیں لازم ہے کہ وہ مہر اس کی مستحق عورت کو پہنچا دیں۔

والدہ کے ساتھ اچھا سلوک کرنا فرض قرار دیا گیا۔ فرمانِ قرآن ہے: وَوَصَّیْنَا الْاِنْسٰنَ بِوَالِدَیْهِ اِحْسٰنًا ؕ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا۔

(سورۂ احقاف، آیت: ۱۵)

ترجمہ: اور ہم نے آدمی کو حکم کیا کہ اپنے ماں باپ سے بھلائی کرے۔ اس کی ماں نے اسے پیٹ میں رکھا تکلیف سے اور جنی اس کو تکلیف سے۔ (کنزالایمان)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص آئے اور سوال کیا: میرے حسنِ سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ آپ نے فرمایا: تمھاری ماں۔ انھوں نے پوچھا: پھر کون؟ آپ نے فرمایا: تمھاری ماں۔ انھوں نے پوچھا: پھر کون؟ آپ نے فرمایا: تمھاری ماں۔ انھوں نے پوچھا: پھر کون؟ آپ نے فرمایا: تمھارے باپ۔ (صحیح البخاری، حصہ ہشتم، ص:۲)

حسنِ سلوک سے مراد یہ ہے کہ ان کی دیکھ ریکھ کرے، ان کے اخراجات کا بار اٹھائے اور انھیں کسی طرح کی تکلیف نہ دے۔

عورتوں کو وراثت میں بھی حصہ دیا گیا، باپ، شوہر، بیٹے وغیرہ کی وراثت سے اسے جو کچھ ملے اسی طرح حق مہر میں اسے جو بھی مال ملے اس کی وہ مکمل طور پر مالک ہوتی ہے کہ اسے جہاں چاہے جس طرح چاہے استعمال کر سکتی ہے۔ اگر اپنی خوشی سے اپنے شوہر کو کچھ حصہ دے تبھی اس کا شوہر اس کو استعمال میں لے سکتا ہے ورنہ اس کا شوہر بھی اس سے زبردستی نہیں لے سکتا ہے۔ یہ سب سرورِ کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دیے ہوئے حقوق ہیں۔

مُطَلَّقَہ عورتوں کے حقوق

سب سے پہلے تو یہ بات ذہن نشیں کر لیں کہ آقاے رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نظر میں مباح کاموں میں سب سے ناپسندیدہ کام طلاق ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

اَبْغَضُ الْمُبَاحِ اِلَى اللهِ الطَّلَاقُ۔ (تفسیر ابن جزی، حصہ دوم، ص:۱۵۲)

ترجمہ: اللہ کے نزدیک مباح کاموں میں سب سے برا کام طلاق ہے۔

لیکن چوں کہ کبھی کسی وجہ سے میاں بیوی میں نباہ کی صورت نہیں رہ جاتی اس لیے طلاق کو اضطراری حالت میں جائز رکھا گیا۔ وہ بھی چھوٹی موٹی باتوں پر طلاق دینا ہرگز

درست نہیں ہے بلکہ اس کے لیے بھی مراحل متعین کیے گئے ہیں۔

فرمانِ قرآن ہے:

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْهِنَّ سَبِیْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیًّا كَبِیْرًا ○ وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَیْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ یُّرِیْدَاۤ اِصْلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَیْنَهُمَا ۔ (سورۂ نساء، آیت: ۳۴،۳۵)

ترجمہ: اور جن عورتوں کی نافرمانی کا تمھیں اندیشہ ہو تو انھیں سمجھاؤ اور ان سے الگ سوؤ اور اُنھیں مارو۔ پھر اگر وہ تمھارے حکم میں آجائیں تو اُن پر زیادتی کی کوئی راہ نہ چاہو۔ بے شک اللہ بلند بڑا ہے اور اگر تم کو میاں بی بی کے جھگڑے کا خوف ہو تو ایک پنچ مرد والوں کی طرف سے بھیجو اور ایک پنچ عورت والوں کی طرف سے، یہ دونوں اگر صلح کرانا چاہیں گے تو اللہ ان میں میل کر دے گا۔ (کنزالایمان)

اگر شوہر کو بیوی کی نافرمانی کا اندیشہ ہے تو اس کے لیے یہ ہدایات ہیں:

(۱) سب سے پہلے اسے سمجھایا بجھایا جائے اور اپنی اصلاح کی تلقین کی جائے۔

(۲) اگر وہ اپنی اصلاح نہ کرے تو اس سے اپنی خوابگاہ الگ کر لی جائے۔

(۳) اب بھی اسے احساس نہ ہو تو مارنے کی اجازت ہے۔

لیکن مارنے کا یہ مطلب نہیں کہ ہڈیاں توڑ دی جائیں بلکہ مارنے میں بھی اصلاح اور ان کے دل میں ڈر پیدا کرنا مقصود ہو۔ اس آیت کے تعلق سے حضرت عکرمہ سے مروی ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اِضْرِبُوْهُنَّ اِذَا عَصَیْنَكُمْ فِی الْمَعْرُوْفِ ضَرْبًا غَیْرَ مُبَرِّحٍ۔ (الدر المنثور فی التفسیر بالماثور، حصہ دوم، ص: ۵۲۲)

ترجمہ: اگر کسی بھلے کام میں تمھاری نافرمانی کریں تو انھیں اس طرح مارنے کی اجازت ہے کہ اس کا اثر نظر نہ آئے۔

حضرت عطا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے سوال کیا کہ "ضَربِ غَیر مُبرِح" کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: مسواک اور اس جیسی کسی چیز سے مارنے کی اجازت ہے۔ (ایضا،ص:۵۲۳)

اگر بات زیادہ بگڑ گئی ہو تو یہ حکم ہے کہ میاں بیوی دونوں کی طرف سے ایک ایک پنچ اکٹھا ہوں اور آپسی بات چیت سے معاملے کو سلجھائیں۔ پھر بھی اگر سلجھنے والی نوبت نہ ہو تو طلاق دینے کی اجازت ہے مگر اسے بھی پابند قانون کیا گیا ہے۔ دورِ جاہلیت میں طلاق کی کوئی حد نہیں تھی، ایک شخص اپنی عورت کو طلاق دیتا، پھر جب عدت ختم ہونے کے قریب ہوتی تو رجعت کر لیتا، اسی طرح اسے لٹکا کر رکھتا، نہ حقِ زوجیت دیتا اور نہ ہی چھوڑ دیتا کہ وہ کسی اور سے نکاح کر لے۔ رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس نظام کو تبدیل فرمایا اور حکمِ قرآن کے مطابق طلاق رجعی کی حد دو مرتبہ تک مقرر فرمائی کہ اگر کسی نے تین مرتبہ طلاق دے دی تو وہ طلاق مغلظہ ہو جائے گی۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ۔ (سورۂ بقرہ، آیت:۲۲۹)

ترجمہ: یہ طلاق (رجعی) دو بار تک ہے، پھر بھلائی کے ساتھ روک لینا ہے یا نکوئی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے۔ (کنزالایمان)

یعنی بات بگڑنے پر اگر طلاق دے بھی دیا تو عدت گزرنے سے پہلے پہلے اگر دل میں اس عورت کو روکنے کا ارادہ پیدا ہو گیا تو بھلائی کے ساتھ روک لے اور اگر چھوڑنا ہی طے کر لیا ہے تو بھلائی کے ساتھ چھوڑ دے۔

کسی عورت کو کسی وجہ سے طلاق دے دی گئی تو اسے بے سہارا نہیں چھوڑا گیا بلکہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کے حقوق کو تحفظ فراہم کیا ہے۔اس کی چند مثالیں ملاحظہ کرتے چلیں:

عدت کے دوران نان ونفقہ اور رہنے سہنے کا انتظام شوہر کے ذمے ہے

کسی عورت کو طلاق دے دی گئی تو اس کے لیے ضروری ہے کہ عدت گزارے۔ دورانِ عدت وہ کسی دوسرے مرد سے نکاح نہیں کرسکتی ہے۔اب اس کے اخراجات کس کے ذمے ہوں گے؟ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دینِ رحمت میں عورت کو عدت کی حالت میں بھی اخراجات کے معاملے میں بے سہارا نہیں چھوڑا گیا ہے بلکہ دورانِ عدت اس کے اخراجات اسے طلاق دینے والے مرد کے ذمے کیے گئے ہیں۔

فرمانِ قرآن ہے:

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۗ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ○

(سورۂ بقرہ، آیت:۲۴۱)

ترجمہ: اور طلاق والیوں کے لیے بھی مناسب طور پر نان ونفقہ ہے، یہ واجب ہے پرہیزگاروں پر۔

اس آیۂ کریمہ میں یہ حکم فرمایا گیا کہ مطلقہ عورت کے لیے یہ انتظام بھی بھلائی کے ساتھ کیا جائے، اپنا فرض سمجھ کر اس کو ادا کیا جائے اور ان پر اس کا احسان جتا کر انھیں ذہنی اذیت نہ پہنچائی جائے۔

اگر صحبت سے پہلے ہی طلاق دے دیا تب بھی آدھا مہر دینا ہوگا

اگر بیوی کے ساتھ خلوت ہو چکی تھی اس کے بعد طلاق دیا تب تو پورا مہر دینا ہوگا اور

اگر خلوت نہیں ہوئی تھی تب بھی اس عورت کو آدھا مہر دینا ہوگا۔ فرمانِ قرآن ہے:

وَاِنۡ طَلَّقۡتُمُوۡهُنَّ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَمَسُّوۡهُنَّ وَقَدۡ فَرَضۡتُمۡ لَهُنَّ فَرِيۡضَةً فَنِصۡفُ مَا فَرَضۡتُمۡ۔ (سورۂ بقرہ، آیت:۲۳۶)

ترجمہ: اور اگر تم نے عورتوں کو بے چھوئے طلاق دے دی اور ان کے لیے کچھ مہر مقرر کر چکے تھے تو جتنا ٹھہرا تھا اس کا آدھا واجب ہے۔ (کنزالایمان)

یہ اس صورت میں ہے جب مہر مقرر کیا گیا تھا اور اگر مہر مقرر نہیں تھا تو تین کپڑوں پر مشتمل ایک جوڑا کپڑا دینا ہوگا۔

اگر طلاق کے وقت عورت حاملہ ہے تو مدتِ حمل کے اخراجات مرد پر ہیں

اگر عورت حاملہ ہے تو جب تک بچے کی ولادت نہیں ہو جاتی اس وقت تک وہ کسی اور سے نکاح نہیں کر سکتی ہے۔ پھر مدتِ حمل میں اس کی حفظانِ صحت کے لیے مقوی غذاؤں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس ضرورت کا خیال فرماتے ہوئے حکم ہوا کہ مدتِ حمل میں مرد نے اگر عورت کو طلاق دے دی ہے تب بھی بچے کی ولادت تک اس عورت کے اخراجات اسی مرد کے ذمے ہیں۔ اُس پر ضروری ہے کہ عورت کے لیے رہائش کا انتظام کرے اور بچے کی ولادت تک اس عورت کی ضروریات کا انتظام کرے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

اَسۡكِنُوۡهُنَّ مِنۡ حَيۡثُ سَكَنۡتُمۡ مِّنۡ وُّجۡدِكُمۡ وَلَا تُضَآرُّوۡهُنَّ لِتُضَيِّقُوۡا عَلَيۡهِنَّ ؕ وَاِنۡ كُنَّ اُولٰتِ حَمۡلٍ فَاَنۡفِقُوۡا عَلَيۡهِنَّ حَتّٰى يَضَعۡنَ حَمۡلَهُنَّ ۚ فَاِنۡ اَرۡضَعۡنَ لَـكُمۡ فَاٰتُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ ۚ وَاۡتَمِرُوۡا بَيۡنَكُمۡ بِمَعۡرُوۡفٍ۔

(سورۂ طلاق، آیت:۶)

ترجمہ: عورتوں کو وہاں رکھو جہاں خود رہتے ہو اپنی طاقت بھر اور انھیں ضرر نہ دو کہ

ان پر تنگی کرو اور اگر حمل والیاں ہوں تو انھیں نان ونفقہ دو یہاں تک کہ ان کے بچّہ پیدا ہو۔ پھر اگر وہ تمھارے لیے بچّے کو دودھ پلائیں تو انھیں اس کی اجرت دو اور آپس میں معقول طور پر مشورہ کرو۔ (کنزالایمان)

اس دوران یہ بھی حکم ہوا کہ انھیں کسی طرح سے تکلیف نہ پہنچائے، نہ احسان جتائے اور نہ ہی کسی اور بات سے ان کی دل آزاری کرے۔ اخراجات سب کے الگ الگ ہوتے ہیں اس لیے حکم ہوا کہ آپسی مشورے سے متعین کرلیں۔

طلاق کے بعد بچے کو دودھ پلائے تو اجرت اور کپڑوں کی حقدار ہوگی

اگر طلاق کے بعد بچے کو دودھ پلا رہی ہے اور باپ مفلس نہیں ہے تو اس سے دودھ پلانے کی اجرت بھی لے سکتی ہے۔ قرآنِ مقدس میں ارشاد ہوا:

وَالْوٰلِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ۔

(سورۂ بقرہ، آیت: ۲۳۳)

ترجمہ: اور مائیں دودھ پلائیں اپنے بچوں کو پورے دو برس اس کے لیے جو دودھ کی مدت پوری کرنی چاہے اور جس کا بچہ ہے اس پر عورتوں کا کھانا پہننا ہے حسب دستور۔

ہاں اگر باپ مفلس ہے یا بچہ اس ماں کے علاوہ کسی اور کا دودھ نہیں پیتا ہے تو اب اس کو اجرت لینا درست نہیں ہے۔

بچے کو اپنی کفالت میں رکھنا چاہے تو اسے اس کا بھی حق حاصل ہے

عموماً باپ کے مقابل ماں کے دل میں بچوں کی محبت زیادہ ہوتی ہے۔ کسی نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور طلاق کے بعد وہ عورت اپنے بچوں کو اپنے ساتھ رکھنا چاہے تو

آقائے کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے عورت کو اس کا بھی حق دیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ ایک عورت نے سرورِ کائنات صلی اللہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا: یا رسول اللہ! یہ میرا بچہ ہے، میرا پیٹ اس کا برتن تھا، میرے پستان اس کے مشکیزے تھے اور میری گود اس کی آرام گاہ تھی، اس کے باپ نے مجھے طلاق دے دی ہے اور اسے مجھ سے چھیننا چاہتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کی زیادہ مستحق تو ہے، جب تک تو نکاح نہ کر لے۔ (سنن ابی داؤد، حصہ دوم، ص: ۲۸۳)

ہاں جب اس عورت نے دوسرے کسی مرد سے نکاح کرنے کا ارادہ کر لیا تو اب ان بچوں کا باپ ان کی کفالت کرے یہ زیادہ بہتر ہے کیوں کہ وہ بچے جس کا خون ہیں وہ غیر کے مقابل میں ان کی دیکھ ریکھ زیادہ بہتر طریقے سے کرسکتا ہے۔

مطلقہ بیٹی کے اخراجات برداشت کرنا سب سے افضل صدقہ

اگر کسی کی بیٹی کو کسی وجہ سے طلاق ہوگئی اور اس کے اخراجات کی ذمے داری دوبارہ اس کے سر پر آگئی تو وہ اسے اپنے سر پر بارِ گراں نہ سمجھے بلکہ پیغمبرِ امن صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس پر خرچ کرنے کو بھی کارِ ثواب قرار دیا ہے۔

حضرت سراقہ بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اَلَا اَدُلُّكُمْ عَلٰى اَفْضَلِ الصَّدَقَةِ؟ اِبْنَتُكَ مَرْدُوْدَةً اِلَيْكَ لَيْسَ لَهَا كَاسِبٌ غَيْرُكَ۔ (سنن ابن ماجہ، حصہ دوم، ص: ۱۲۰۹)

ترجمہ: کیا میں تمھیں سب سے افضل صدقے کے بارے میں نہ بتا دوں؟ تمھاری بیٹی جو تمھارے گھر واپس آجائے اور اس کے لیے تمھارے علاوہ کوئی کمانے والا نہیں ہے۔

اس میں طلاق شدہ اور بیوہ دونوں قسم کی بیٹیاں مراد ہیں کہ اگر کسی کی بیٹی کو طلاق

دے دی گئی یا اس کے شوہر کا انتقال ہو گیا اور باپ پر اس کے اخراجات کی ذمے داری دوبارہ آ گئی تو باپ اس بچی کے لیے جو کچھ خرچ کرے گا عند اللہ اس کے لیے سب سے افضل صدقے کا ثواب لکھا جائے گا۔

حاصل یہ کہ بیٹیاں کسی بھی صورت میں باپ کے لیے زحمت نہیں ہیں بلکہ ہر حال میں رحمت ہی رحمت ہیں۔ یہ تصور دنیا کے سامنے جس ذاتِ گرامی نے پیش کیا وہی پیغمبرِ امن ورحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیواؤں کو معاشرے میں اہم مقام دیا

دورِ جاہلیت میں ویسے تو عورت کو معاشرے میں کوئی مقام حاصل نہیں تھا، خاص کر بیواؤں کے ساتھ بھی بڑا ظالمانہ سلوک کیا جاتا تھا۔ کسی شخص کا انتقال ہو جاتا تو اس کی بیویوں کو اس کے بچے آپس میں بطور وراثت تقسیم کر لیتے۔ بیوہ کو ایک سال تک ایک ایسے حجرے میں رہنا پڑتا تھا جس میں روشنی یا ہوا کا گزر نہیں ہوتا تھا۔ اس حجرے کو چھوڑنے کی اسے اجازت نہیں ہوتی تھی، وہ نہ تو نہا سکتی تھی اور نہ ہی کپڑے بدل سکتی تھی۔ جب وہ ایک سال بعد باہر آتی تھی تو اس پر اونٹ کا پیشاب پھینکا جاتا تھا، جس کا یہ مطلب ہوتا تھا کہ اس عورت نے اپنی عدت پوری کر لی ہے۔

آقائے کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بیواؤں کو بھی معاشرے میں مقام عطا فرمایا اور ان کے بھی حقوق متعین فرمائے۔ ایک سالہ ظالمانہ عدت سے انھیں نجات دلاتے ہوئے پہلے ان کی عدت کے لیے یہ ضابطہ متعین کیا گیا:

بیوہ عورت کی عدت

فرمانِ قرآن ہے:

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ○ (سورۂ بقرہ، آیت: ۲۳۴)

ترجمہ: اور تم میں جو مریں اور بیبیاں چھوڑیں وہ چار مہینے دس دن اپنے آپ کو روکے رہیں، تو جب ان کی عدت پوری ہو جائے تو اے والیو! تم پر مؤاخذہ نہیں اس کام میں جو عورتیں اپنے معاملے میں موافقِ شرع کریں اور اللہ کو تمھارے کاموں کی خبر ہے۔

یہ غیر حاملہ کی عدت ہے۔ حاملہ کی عدت درجِ ذیل آیت میں بیان کی گئی:

وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ۔ (سورۂ طلاق، آیت: ۴)

ترجمہ: اور حمل والیوں کی میعاد یہ ہے کہ وہ اپنا حمل جَن لیں۔ (کنز الایمان)

بس اتنی مدت متعین کی گئی ہے کہ بیوائیں بطور عدت گزاریں اور ان سبھی خرافات کو ختم کر دیا گیا جو دور جاہلیت میں رائج تھا کہ انھیں تاریک کمروں میں بند کر دیا جاتا، نہانے دھونے اور کپڑے بدلنے پر پابندی لگا دی جاتی وغیرہ وغیرہ۔ یہ عدت بھی گزارنے کا جو حکم ہوا اس کے متعدد اغراض و مقاصد ہیں جن میں سے ایک مقصد استبرائے رحم ہے، یعنی عدت کے ایام میں اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ یہ عورت حاملہ نہیں ہے تاکہ دوسرے کسی مرد سے اس کے نکاح کرنے میں کوئی قباحت نہ رہ جائے اور اگر حاملہ ہے تو وضعِ حمل سے یہ فائدہ حاصل ہو جاتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیوہ عورتوں سے نکاح فرمایا

محسنِ انسانیت سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سب سے پہلا نکاح حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا جو کہ دو مرتبہ بیوہ ہو چکی تھیں۔ ان کے علاوہ آپ کی کئی اور

ازواج مطہرات بیوہ تھیں اور بعض مطلقہ بھی تھیں۔ اس طرح سے آپ نے بیوہ اور مطلقہ عورتوں کی معاشرے میں عزت افزائی فرمائی۔

بیواؤں کے لیے میراث میں حصہ متعین کیا گیا

دورِ جاہلیت میں بیواؤں کے لیے وفات یافتہ شوہر کی میراث میں کوئی حصہ نہیں ہوتا تھا۔ اسلام میں ان کے لیے بھی حصہ متعین کیا گیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ ۔ (سورۂ نساء، آیت: ۱۲)

ترجمہ: اور تمھارے ترکے میں عورتوں کا چوتھائی ہے اگر تمھارے اولاد نہ ہو، پھر اگر تمھارے اولاد ہو تو ان کا تمھارے ترکے میں سے آٹھواں۔ (کنزالایمان)

کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ عورتوں کے لیے میراث میں مرد کے مقابل میں نصف حصہ کیوں رکھا گیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عورت کی بہ نسبت مرد کی وراثت زیادہ ہونے کا ایک سبب یہ ہے کہ عورت کا نفقہ مرد کے ذمے ہے، یعنی مرد پر اپنے ذاتی اخراجات کے علاوہ فرض ہے کہ اپنی بیوی اور بچوں کے اخراجات بھی پورے کرے۔ اسی طرح مرد مہر دینے والا ہے اور عورت مہر لینے والی ہے۔

یعنی عورت کو جو کچھ وراثت اور مہر کے طور پر ملتا ہے وہ اس کی بچت ہوتی ہے، جب کہ مرد کی وراثت کا حصہ اس کی اپنی زندگی کے اخراجات اور بیوی بچوں کے اخراجات کے طور پر خرچ ہوتا ہے۔ اس لیے عورتوں کا حصہ میراث میں مردوں کے مقابل نصف ہے۔

بیواؤں کا نکاح کرانے کا حکم ہوا

پہلے دور میں یہ دستور تھا بلکہ بعض اقوام میں آج بھی یہ دستور ہے کہ کسی کے شوہر کا

انتقال ہو گیا اور وہ بیوہ ہو گئی تو اب وہ اسی طرح بیوگی کی عالم میں پوری زندگی گزار دے گی، چاہے بھلے شادی کے کچھ دنوں بعد ہی وہ بیوہ ہو گئی ہو۔ بعض اقوام میں تو یہاں تک رواج تھا کہ جس کے شوہر کا انتقال ہو گیا اور اس کی لاش کو جلایا جا رہا ہو تو عورت بھی اپنے شوہر کی لاش کے اوپر لیٹ جاتی اور اسے بھی زندہ جلا دیا جاتا۔ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین میں بیواؤں کو بھی یہ حق دیا گیا کہ وہ عدت گزارنے کے بعد جس سے چاہیں نکاح کر لیں بلکہ ان کے اولیا کو نکاح کرانے کا حکم دیا گیا۔ قرآن پاک میں ہے:

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ ؕ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ۔ (سورۂ نور، آیت: ۳۲)

ترجمہ: اور نکاح کر دو اپنوں میں ان کا جو بے نکاح ہوں اور اپنے لائق بندوں اور کنیزوں کا۔ اگر وہ فقیر ہوں تو اللہ انھیں غنی کر دے گا اپنے فضل کے سبب۔ (کنزالایمان)

اس آیت میں ایامٰی کا معنٰی ہے جو کوئی بھی نکاح سے فارغ ہو، چاہے مرد ہو یا عورت اور کنواری ہو یا بیوہ یا مطلقہ، سب کا مناسب رشتہ دیکھ کر نکاح کرنے کا حکم ہوا۔

بیوہ عورتوں کی مدد کرنے کی فضیلت

جس عورت کے سر پر شوہر کا سایہ نہ ہو عمومًا اس کے لیے زندگی کے لوازمات اور اخراجات کا انتظام دوبھر ہو جاتا ہے۔ اگر عورت کے پاس سلائی کڑھائی کا ہنر ہے تو اس ہنر کو استعمال کر کے وہ دو وقت کی روٹی کا انتظام کر بھی لیتی ہے لیکن بہت سی خواتین ایسی بھی ہوتی ہیں جنھیں اس کا بھی سہارا نہیں ہوتا۔ ایسے میں ان کا مالی تعاون کرنا اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کے برابر ثواب رکھتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

السَّاعِي عَلَى الْأَرْمَلَةِ وَالْمِسْكِينِ كَالْمُجَاهِدِ فِي سَبِيلِ اللهِ، وَكَالَّذِي يَقُومُ اللَّيْلَ وَيَصُومُ النَّهَارَ۔ (سنن ابن ماجہ، حصہ دوم، ص: ۴۲۴)

ترجمہ: بیواؤں اور مسکینوں کی مدد کے لیے کوشش کرنے والا اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے، رات کو عبادت کرنے والے اور دن کو روزے رکھنے والے کی طرح ہے۔

یعنی جو شخص بیواؤں اور مسکینوں کی مدد کے لیے کوشش میں لگا رہتا ہے اس کے لیے جہاد، قیامِ لیل اور دن کو روزے میں گزارنے کا ثواب لکھا جائے گا۔

پیغمبر امن صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بوڑھوں کو اونچا مقام دیا

آقائے رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے عمر رسیدہ افراد کو خصوصی مقام و مرتبے کا حامل قرار دیا ہے۔ آپ کی آفاقی تعلیمات میں سے یہ بھی ہیں کہ عمر رسیدہ اَفراد کو باعثِ برکت و رحمت اور قابلِ عزت و تکریم سمجھا جائے۔ آپ نے بزرگوں کی عزت و تکریم کی تلقین فرمائی اور بزرگوں کا یہ حق قرار دیا کہ کم عمر اپنے سے بڑی عمر کے لوگوں کا احترام کریں اور ان کے مرتبے کا خیال رکھیں۔

خصوصیت کے ساتھ جب والدین بوڑھے ہو جائیں تو ان کا حد سے زیادہ خیال رکھنا اسلامی تعلیمات میں سے ہے۔ مغربی تہذیب اور پیغمبر امن صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی دی ہوئی تہذیب میں یہ بھی ایک بہت بڑا فرق ہے کہ وہ لوگ بزرگوں کے حق میں اپنا فرض بس اتنا سمجھتے ہیں کہ جب ان کی خدمت کا وقت آتا ہے تو انھیں اولڈ ہاؤس (Old House) پہنچا دیتے ہیں مگر آقائے کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بزرگوں کی خدمت اور ان کا خیال رکھنے کو عبادت قرار دیا ہے۔

بزرگوں کی تعظیم نہ کرنے والا ہم میں سے نہیں

پیغمبرِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تشکیل کردہ سوسائٹی ہر حقدار کو اس کا حق پہنچانے کا مزاج دیتی ہے۔ چھوٹوں پر بڑوں کا حق ہے کہ ان کی خدمت کریں اور ان کی عزت وتکریم کریں۔ اسی طرح بڑوں پر چھوٹوں کا حق ہے کہ ان کے ساتھ مہربانی اور نرمی کا معاملہ کریں۔ اگر کوئی چھوٹا کسی بڑے کی تعظیم وتکریم میں کوتاہی کرتا ہے تو وہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بنائی ہوئی سوسائٹی کے اصول کے خلاف جانے والا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا وَيُوَقِّرْ كَبِيْرَنَا۔

(سنن الترمذی، حصہ چہارم، ص: ۳۲۲)

ترجمہ: جو چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور بڑوں کی تعظیم نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں۔

اس حدیثِ پاک میں ہر بڑے کی تعظیم وتکریم کا حکم ہے، پھر جو جس قدر بڑا ہوگا اسی قدر تعظیم وتکریم کا مستحق ہوگا۔ عمر رسیدہ افراد چوں کہ سوسائٹی میں سب سے بڑے ہوتے ہیں اس لیے وہ اکرام وتوقیر کے سب سے بڑے مستحق ہیں۔

بزرگوں کی تعظیم اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعظیم کا حصہ ہے

عمر رسیدہ حضرات کی تعظیم وتکریم کو سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کس قدر اہم مقام قرار دیا کہ اسے اللہ تبارک وتعالیٰ کی تعظیم وتکریم کا حصہ اور اپنی تعظیم وتکریم کے جیسا قرار دیا۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آقائے کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: إِنَّ مِنْ إِجْلَالِ اللّٰهِ إِكْرَامَ ذِي الشَّيْبَةِ الْمُسْلِمِ۔

(سنن ابی داؤد، حصہ چہارم، ص: ۲۶۱)

ترجمہ: یقیناً عمر رسیدہ مسلمان کی تعظیم کرنا اللہ تبارک وتعالیٰ کی تعظیم کا حصہ ہے۔

اس سے بڑھ کر اور کیا مقام ہوسکتا ہے کہ پیغمبر امن صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے عمر رسیدہ افراد کی تعظیم کو اللہ کی تعظیم کا حصہ قرار دے دیا۔

اسی طرح ایک حدیث میں سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بزرگوں اور معمر افراد کی تعظیم کو اپنی تعظیم کا حصہ بھی قرار دیا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رحمتِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اِنَّ مِنْ اِجْلَالِیْ تَوْقِیْرُ الشَّیْخِ مِنْ اُمَّتِیْ۔ (کنز العمال، حصہ سوم، ص: ۱۷۲)

ترجمہ: میری امت کے عمر رسیدہ افراد کی تعظیم، میری تعظیم کا حصہ ہے۔

عمر رسیدہ افراد کی تعظیم کا صلہ دنیا ہی میں مل جاتا ہے

آخرت میں تو ہر اچھے عمل کا بدلہ ملے گا ہی، بہت سے ایسے اعمال ہوتے ہیں جن کا بدلہ اللہ تبارک وتعالیٰ دنیا ہی میں عطا فرما دیتا ہے۔ انھی اعمال میں سے ایک عمل یہ بھی ہے کہ کوئی شخص عمر رسیدہ افراد کی تعظیم وتوقیر اور ان کی خدمت کرے۔ خصوصیت کے ساتھ والدین کے بڑھاپے میں ان کی خدمت وتعظیم دنیا ہی میں اپنا اثر دکھاتی ہے کہ یہ شخص جب خود بوڑھا ہوتا ہے تو اس کی اولاد بھی اس کی قدر کرتی ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: مَا اَکْرَمَ شَابٌّ شَیْخًا لِسِنِّہٖ اِلَّا قَیَّضَ اللّٰہُ لَہٗ مَنْ یُکْرِمُہٗ عِنْدَ سِنِّہٖ۔ (سنن الترمذی، حصہ چہارم، ص: ۳۷۲)

ترجمہ: جو جوان کسی بوڑھے کی تعظیم اس کی عمر کی وجہ سے کرتا ہے اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے لیے بھی کسی کو مقرر فرما دیتا ہے جو اس کے بڑھاپے میں اس کی تعظیم کرے۔

جو لوگ اپنی جوانی میں بزرگوں کو اولڈ ہاؤس کے حوالے کر دیتے ہیں یا اگر اپنے گھر پر رکھتے بھی ہیں تو ان کی قدر نہیں کرتے وہ اپنے بڑھاپے میں عموماً اپنے بچوں سے ایسا ہی کچھ سلوک دیکھتے ہیں۔

والدین بوڑھے ہو جائیں تو ان سے اُف تک کہنے کی ممانعت ہے

بڑھاپے کو قرآن مقدس نے ''ارذل العمر'' کہا ہے، اس عمر میں اگر کوئی دیکھ ریکھ کرنے والا مل گیا تو اچھی بات ہے ورنہ زندگی دوبھر ہو جاتی ہے۔ جب والدین بوڑھے ہو جائیں اور ان سے کوئی ایسی بات سرزد ہو جو ہمیں ناگوار گزرے تب بھی ان سے اُف تک کہنے کی ممانعت آئی ہے۔ ارشادِ باری ہے:

اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَاۤ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَاۤ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِیْمًا○ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّیٰنِیْ صَغِیْرًا○ (سورۂ بنی اسرائیل، آیت: ۲۳، ۲۴)

ترجمہ: اگر تیرے سامنے ان میں ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان سے ہُوں نہ کہنا اور انھیں نہ جھڑکنا اور ان سے تعظیم کی بات کہنا۔ اور ان کے لیے عاجزی کا بازو بچھا نرم دلی سے اور عرض کر کہ اے میرے رب! تو ان دونوں پر رحم کر جیسا کہ ان دنوں نے مجھے چھٹپن میں پالا۔ (کنز الایمان)

والدین اور بزرگوں کی ناقدری، ان کے ساتھ برا سلوک، انھیں ڈانٹنا ڈپٹنا اور وہ ساری دل آزاریاں جو آج کے زمانے میں عام ہو چکی ہیں ان کی سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ان کی تعلیم کا حصہ تو یہ ہے کہ ان سے کوئی ایسا معاملہ پایا گیا جو ہمیں صحیح نہ لگے تب بھی انھیں اُف تک کہنے کی ممانعت فرمائی گی ہے۔

خود سرورِ کائنات نے عمر رسیدہ حضرات کو عزت دی اور انھیں باعث برکت کہا

آقائے نعمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے عمر رسیدہ افراد کی عظمت کو اجاگر کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کی وجہ سے خیر و برکت کا نزول ہوتا ہے۔

حضرت ابواُمامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں: ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ صحابۂ کرام کی ایک جماعت تھی جن میں سیدنا ابوبکر صدیق، سیدنا عمر فاروق اور سیدنا ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین بھی تھے، اسی دوران آپ کے پاس ایک پیالہ لایا گیا جس میں مشروب تھا، آقائے کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے وہ پیالہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دے دیا۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی: یارسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیک وسلم! آپ اس کے زیادہ مستحق ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اسے لے لو تو حضرت ابوعبیدہ نے وہ پیالہ لے لیا، پھر آپ نے پینے سے پہلے بھی عرض کی: یارسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیک وسلم! آپ اسے قبول فرمالیں۔ نبیِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِشْرَبْ فَاِنَّ الْبَرَكَةَ فِيْ اَكَابِرِنَا، فَمَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا، وَيُجِلَّ كَبِيْرَنَا فَلَيْسَ مِنَّا۔ (المعجم الکبیر للطبرانی، حصہ ہشتم، ص:۲۲۷)

ترجمہ: اسے پی لو اس لیے کہ برکت ہمارے عمر رسیدہ افراد کی وجہ سے ہے۔ تو جس نے چھوٹوں پر رحم نہیں کیا اور بڑوں کی تعظیم نہیں کی وہ ہم میں سے نہیں۔

ایک روایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہے کہ آقائے کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مَهْلًا عَنِ اللهِ مَهْلًا فَاِنَّهٗ لَوْلَا شَبَابٌ خُشَّعٌ وَبَهَائِمُ رُتَّعٌ وَشُيُوْخٌ رُكَّعٌ وَاَطْفَالٌ رُضَّعٌ لَصُبَّ عَلَيْكُمُ الْعَذَابُ صَبًّا۔

(السنن الکبریٰ للبیہقی، حصہ سوم، ص: ۴۸۱)

ترجمہ: اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے مہلت پر مہلت دی جاتی ہے۔ اگر عاجزی اور انکساری کرنے والے جوان، چرنے والے چوپائے، عبادت گزار بوڑھے اور دودھ پیتے بچے نہ ہوتے تو تم پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے۔

پہلی روایت میں یہ بات واضح طور پر ذکر کر دی گئی کہ عمر رسیدہ افراد جس جگہ ہوں گے وہاں برکتوں کا نزول ہوگا۔ اب کوئی شخص چاہے تو اس ذریعۂ برکت کو اپنے گھر میں رکھے اور چاہے تو اسے گھر سے نکال کر کسی اور جگہ پر منتقل کر دے۔ دوسری روایت میں فرمایا گیا کہ جہاں پر عمر رسیدہ افراد ہوں وہاں سے عذاب ٹل جاتا ہے، اگر وہ نہ ہوں تو اللہ کا عذاب نازل ہو سکتا ہے۔

عبادتوں میں آقائے رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عمر رسیدہ افراد کا خیال فرمایا

عمر رسیدہ افراد کے لیے بسا اوقات دیر تک قیام، تیزی سے اٹھنا بیٹھنا، روزہ رکھنا وغیرہ متعدد کام مشکل ہوتے ہیں۔ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے عبادات میں بھی ان کا خیال فرمایا ہے بلکہ ایک صحابیِ رسول نے سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں اس تعلق سے شکایت کی کہ وہ نماز پڑھاتے ہیں تو قیام طویل کر دیتے ہیں، یہ سن کر سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے شدید ناراضی کا اظہار فرمایا۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں:

اِنَّ رَجُلًا قَالَ: وَاللّٰهِ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّي لَاَتَاَخَّرُ عَنْ صَلٰوةِ الْغَدَاةِ مِنْ اَجْلِ فُلَانٍ مِمَّا يُطِيْلُ بِنَا فَمَا رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي مَوْعِظَةٍ اَشَدَّ غَضَبًا مِنْهُ يَوْمَئِذٍ، ثُمَّ قَالَ: اِنَّ مِنْكُمْ مُنَفِّرِيْنَ، فَاَيُّكُمْ مَا

صَلّٰى بِالنَّاسِ فَلْيَتَجَوَّزْ، فَإِنَّ فِيهِمُ الضَّعِيفَ وَالْكَبِيرَ وَذَا الْحَاجَةِ۔

(صحیح البخاری، حصہ اول، ص: ۱۴۲)

ترجمہ: ایک شخص نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی: یا رسول اللہ! میں فجر کی نماز کے لیے تاخیر سے آتا ہوں اس لیے کہ فلاں شخص (جو نماز پڑھاتے ہیں) وہ بڑی لمبی قراءت کرتے ہیں۔ میں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی وعظ میں اس دن سے زیادہ غضب میں نہیں دیکھا۔ پھر آپ نے فرمایا: تم لوگ تو لوگوں کو متنفر کر دو گے۔ تم میں سے جو کوئی نماز پڑھائے تو اسے چاہیے کہ تخفیف کرے اس لیے کہ نمازیوں میں کمزور، عمر رسیدہ اور ضرورت مند لوگ بھی ہوتے ہیں۔

اس روایت میں دیکھیں کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب سنا کہ امام کے طولِ قیام کی وجہ سے کسی عمر رسیدہ شخص کو تکلیف ہو رہی ہے تو آپ نے اظہارِ جلال فرمایا اور تخفیف کا حکم فرمایا۔ اس سے پتہ چلا کہ آپ نے عبادات میں عمر رسیدہ افراد کا خود خیال فرمایا اور خیال رکھنے کا حکم بھی فرمایا۔

اسی طرح عمر رسیدہ افراد کے لیے روزوں، جہاد اور دیگر عبادات میں بھی تخفیف کی گئی ہے۔ نماز میں ان کے اندر قیام کی استطاعت نہیں ہے تو بیٹھ کر پڑھ سکتے ہیں، بیٹھنا بھی مشکل ہے تو لیٹ کر اشارے سے پڑھ سکتے ہیں۔ روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رہ گئی ہے تو چھوڑنے کی اجازت ہے البتہ روزوں کے بدلے میں فدیہ دے دیں۔ ارشاد ہوا:

وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ۔ (سورۂ بقرہ، آیت: ۱۸۴)

ترجمہ: جنھیں اس کی طاقت نہ ہو وہ بدلہ دیں ایک مسکین کا کھانا۔ (کنز الایمان)

اس آیۂ مقدسہ میں شیخِ فانی کے لیے روزوں کے تعلق سے رخصت کا ذکر ہے۔ جس

بوڑھے مرد یا عورت کو پیرانہ سالی کے ضعف سے روزہ رکھنے کی قدرت نہ رہے اور آئندہ قوت حاصل ہونے کی امید بھی نہ ہو اس کو شیخِ فانی کہتے ہیں۔اس کے لیے جائز ہے کہ افطار کرے اور ہر روزے کے بدلے نصف صاع گیہوں یا گیہوں کا آٹا یا اس سے دونے جو یا اس کی قیمت بطورِ فدیہ دے۔ (خزائن العرفان)

اسی طرح جہاد، حج اور دیگر بدنی عبادتیں جن کی تکمیل کی کسی کے جسم میں طاقت نہیں رہ گئی ہے تو ان کے لیے رخصت کا حکم ہے۔

آقائے نعمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تلاش کرنا ہے تو ضعیفوں میں تلاش کرو

ایک مقام پر سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ضعیفوں کو اپنی طرف منسوب کر کے ان کی عزت افزائی فرمائی۔حضرت ابودرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رحمتِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اِبْغُوْنِیْ فِیْ ضُعَفَائِکُمْ فَاِنَّمَا تُرْزَقُوْنَ وَتُنْصَرُوْنَ بِضُعَفَائِکُمْ۔

(سنن ابی داؤد، حصہ سوم، ص:۳۲)

ترجمہ: مجھے اپنے ضعیفوں میں تلاش کرو، اس لیے کہ تمھیں کمزوروں کے صدقے ہی میں روزی بھی دی جاتی ہے اور انھی کے صدقے تمھاری مدد بھی کی جاتی ہے۔

اس روایت میں دو باتوں کا ذکر ہے۔ایک یہ کہ عمر رسیدہ اور کمزور لوگوں کو آقائے کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنی نسبت عطا فرمائی۔دوسری بات یہ ہے کہ آقائے کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: انسانوں کو جو روزی ملتی ہے اور شاہراہِ حیات پر چلنے میں ان کی جو غیبی امداد ہوتی ہے وہ ضعیفوں اور عمر رسیدہ افراد کے صدقے میں ہوتی ہے۔

یتیموں پر سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احسانات

یتیم یعنی وہ نابالغ بچے جن کے والد کا سایہ ان کے سروں سے اٹھ جاتا ہے، آمدِ رسول سے پہلے وہ بھی ظلم وزیادتی کے شکار ہوجایا کرتے تھے۔ ان کی تربیت اور پرورش کا ذمہ اگر بمشکل کوئی لے بھی لیتا تھا تو انھیں اپنے باپ کی وراثت سے جو مال ملا ہوتا ہے وہ مال وہ ہڑپ کر جاتا تھا۔ حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یتیم کی پرورش اور اس کے ساتھ حسنِ سلوک کو عبادت کا مقام دیا اور یتیموں کو معاشرے میں اہمیت عطا فرمائی۔

یتیموں کے ساتھ اچھا سلوک لازم اور بدسلوکی حرام

یتیموں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی فضیلت اور ان کے ساتھ بدسلوکی کی مذمت قرآن مقدس کی بہت سی آیتوں میں مذکور ہے۔

(۱) اللہ کے مخصوص بندوں کی صفات میں ذکر کیا گیا:

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّ يَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا○ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا○ (سورۂ دہر، آیت: ۸، ۹)

ترجمہ: اور کھانا کھلاتے ہیں اس کی محبّت پر مسکین اور یتیم اور اسیر کو، ان سے کہتے ہیں: ہم تمھیں خاص اللہ کے لیے کھانا دیتے ہیں، تم سے کوئی بدلہ یا شکر گزاری نہیں مانگتے۔

(۲) یتیموں کو بھلائی اور حسنِ سلوک کا مستحق قرار دیا گیا:

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ۔ (سورۂ بقرہ، آیت: ۲۱۵)

ترجمہ: تم سے پوچھتے ہیں کیا خرچ کریں؟ تم فرماؤ جو کچھ مال نیکی میں خرچ کرو تو وہ ماں باپ اور قریب کے رشتے داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور راہ گیر کے لیے ہے۔

(۳) تقسیمِ میراث کے وقت اگر وہاں کوئی یتیم آجائے تو اسے بھی کچھ دے دیا جائے:

وَ اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا۝ (سورۂ نساء، آیت:۸)

ترجمہ: پھر بانٹتے وقت اگر رشتے دار اور یتیم اور مسکین آجائیں تو اس میں سے انھیں بھی کچھ دو اور ان سے اچھی بات کہو۔ (کنزالایمان)

(۴) ان کے حقوق کی ادائیگی میں انصاف پر قائم رہنے کی تاکید کی گئی:

وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ۔ (سورۂ نساء، آیت:۱۲۷)

ترجمہ: اور یہ کہ یتیموں کے حق میں انصاف پر قائم رہو۔

(۵) مالِ غنیمت میں بھی ان کا حصہ رکھا گیا:

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ۔ (سورۂ انفال، آیت:۴۱)

ترجمہ: اور جان لو کہ جو کچھ غنیمت لو تو اس کا پانچواں حصہ خاص اللہ اور رسول اور قرابت والوں اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں کا ہے۔ (کنزالایمان)

(۶) یتیموں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنے کی تاکید کی گئی:

فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ۝ (سورۂ ضحٰی، آیت:۹)

ترجمہ: تو یتیم پر دباؤ نہ ڈالو۔ (کنزالایمان)

(۷) یتیموں کے اموال کو ناحق کھانے کی ممانعت وارد ہوئی:

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ۔

(سورۂ انعام، آیت:۱۵۲)

ترجمہ: اور یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ مگر بہت اچھے طریقہ سے جب تک وہ اپنی

جوانی کو پہنچے۔(کنزالایمان)

ان کے علاوہ بہت سی آیتیں ہیں جن میں حکم دیا گیا ہے کہ یتیموں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے، ان کے اموال کی حفاظت کی جائے، ان پر ظلم وزیادتی نہ کی جائے اور ان کے مال کو ناحق نہ کھایا جائے، وہ کمزور ہیں تو ان کی کمزوری کا ناجائز فائدہ نہ اٹھایا جائے۔ وہ بے سہارا ہیں تو انھیں سہارا دیا جائے۔

یتیم کے معاملے میں اللہ کا خوف کرو

یتیموں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کے تعلق سے حدیث پاک میں سخت تاکید آئی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ ان کی حق تلفی کے تعلق سے سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بڑی قباحتوں اور وعیدوں کا ذکر فرمایا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اَللّٰھُمَّ اِنِّی اُحَرِّجُ حَقَّ الضَّعِیۡفَیۡنِ: الۡیَتِیۡمِ وَالۡمَرۡأَۃِ۔ (سنن ابن ماجہ، حصہ دوم، ص: ۱۲۱۳)

ترجمہ: اے اللہ! میں لوگوں کو دو ضعیفوں کے حق سے بہت ڈراتا ہوں ایک یتیم اور دوسری عورت۔

جس بچے کے سر سے والد کا سایہ اٹھ چکا ہو تو کوئی شخص یہ نہ سوچے کہ اس کے حقوق دلانے والا کوئی نہیں ہے۔ اگر اسے بے سہارا سمجھ کر کسی نے دنیا میں اس کی حق تلفی کر لی تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس نے اپنے لیے آخرت کے عذاب کو مول لے لیا ہے۔

یتیم والا گھر سب سے بہتر گھر

یتیم کے سر پر ہاتھ رکھنا اور اسے باپ کا پیار دینا اتنا عظیم عمل ہے کہ جس گھر میں یہ

عمل جاری رکھا جائے اس گھر کو سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سب سے بہتر گھر قرار دیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

خَيْرُ بَيْتٍ فِي الْمُسْلِمِينَ بَيْتٌ فِيهِ يَتِيمٌ يُحْسَنُ إِلَيْهِ، وَشَرُّ بَيْتٍ فِي الْمُسْلِمِينَ بَيْتٌ فِيهِ يَتِيمٌ يُسَاءُ إِلَيْهِ۔ (سنن ابن ماجہ، حصہ دوم، ص: ۱۲۱۳)

ترجمہ: مسلمانوں کے گھروں میں سب سے بہتر گھر وہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو جس کے ساتھ حسنِ سلوک کیا جائے اور مسلمانوں کے گھروں میں سب سے برا گھر وہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو جس کے ساتھ برا سلوک کیا جائے۔

یتیم کا کفیل جنت میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مصاحب

جنت مل جائے تو خود ایک عظیم نعمت مل گئی اور جنت میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ساتھ مل جائے تو کیا خوب ہے۔ یہ شرف اسے ملے گا جو یتیم کی کفالت اور پرورش کرے۔

حضرت سہل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

أَنَا وَكَافِلُ الْيَتِيمِ فِي الْجَنَّةِ هٰكَذَا وَأَشَارَ بِالسَّبَّابَةِ وَالْوُسْطٰى وَفَرَّجَ بَيْنَهُمَا شَيْئًا۔ (صحیح البخاری، حصہ ہفتم، ص: ۵۳)

ترجمہ: میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح ہوں گے۔ آپ نے شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی سے اشارہ کیا اور دونوں کے درمیان تھوڑی سی کشادگی کی۔

اس میں غایتِ قرب بتانا مقصود ہے کہ یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بہت قریب ہوگا۔ کوئی شخص اپنے تین چار بچوں کے اخراجات

برداشت کرتا ہے، اسی کے ساتھ کسی ایک یتیم کی ذمے داری بھی اپنے سر لے لے اور اس کے ساتھ حسنِ سلوک کرے تو وہ کتنے عظیم انعام کا مستحق ہے کہ جنت میں سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قرب میں اسے جگہ میسر آئے گی۔

دل کی سختی دور کرنے کا نسخہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے دل کی سختی کی شکایت کی۔ آپ نے ان کے لیے یہ نسخہ تجویز فرمایا:

اِمْسَحْ رَاْسَ الْيَتِيْمِ وَاَطْعِمِ الْمِسْكِيْنَ۔ (مشکوٰۃ، حصہ سوم، ص: ۱۳۹۳)

ترجمہ: یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرو اور مسکین کو کھانا کھلاؤ۔

اس عمل سے جہاں دل نرم ہوگا وہیں یہ عمل ڈھیروں اجر وثواب کا باعث ہے۔

فرمانِ رسولِ خدا ہے: مَنْ مَسَحَ رَأْسَ يَتِيْمٍ لَمْ يَمْسَحْهُ اِلَّا لِلّٰهِ كَانَ لَهٗ بِكُلِّ شَعْرَةٍ تَمُرُّ عَلَيْهَا يَدُهٗ حَسَنَاتٌ۔ (مشکوٰۃ، حصہ سوم، ص: ۱۳۸۸)

ترجمہ: جس کسی نے کسی یتیم کے سر پر خالص اللہ کی رضا کے لیے ہاتھ پھیرا تو اس کے سر کے جتنے بالوں پر اس کا ہاتھ پھرے گا ان کے برابر اس کے لیے نیکیاں ہوں گی۔

یتیم کا مال کھانا پیٹ میں آگ بھرنے جیسا ہے

دورِ جاہلیت میں اگر کسی کی کفالت میں کوئی یتیم ہوتا اور اس کی ملکیت میں اس کے باپ سے وراثت میں ملی ہوئی رقم ہوتی تو کفالت کرنے والا شخص اس مال کو اپنے لیے استعمال کرنے میں کوئی جھجھک محسوس نہیں کرتا تھا۔ یہ یتیم کی حق تلفی تھی اور اس پر بہت بڑا ظلم تھا۔ اسے والد کی میراث سے ملنے والا جو مال تھا وہ اس کے بڑے ہونے کے بعد اس کی تجارت اور کاروبار میں لگانے کے کام آسکتا ہے، اس کی دیگر ضروریات کی تکمیل اس مال سے ہوسکتی

ہے لیکن اگر کسی نے اسے ظلمًا صرف کر دیا تو اس یتیم کے لیے مستقبل میں پریشانی کا باعث ہوگا۔ اس لیے ظلمًا یتیم کے مال کو کھانا شنیع بتایا گیا اور اس مال کو کھانا اپنے پیٹ میں آگ بھرنے کے مثل قرار دیا گیا۔

فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَاۡکُلُوۡنَ اَمۡوَالَ الۡیَتٰمٰی ظُلۡمًا اِنَّمَا یَاۡکُلُوۡنَ فِیۡ بُطُوۡنِہِمۡ نَارًا ؕ وَسَیَصۡلَوۡنَ سَعِیۡرًا ۝ (سورۂ نساء، آیت:۱۰)

ترجمہ: وہ جو یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں وہ تو اپنے پیٹ میں نِری آگ بھرتے ہیں اور کوئی دام جاتا ہے کہ بھڑکتے دھڑے (آگ) میں جائیں گے۔ (کنزالایمان)

یعنی یتیموں کا مال ناحق کھانا گویا آگ کھانا ہے کیوں کہ وہ سبب ہے عذاب کا۔ حدیث شریف میں ہے روزِ قیامت یتیموں کا مال کھانے والے اِس طرح اُٹھائے جائیں گے کہ اُن کی قبروں سے اور اُن کے منہ سے اور اُن کے کانوں سے دھواں نکلتا ہوگا، تو لوگ پہچانیں گے کہ یہ یتیم کا مال کھانے والا ہے۔ (خزائن العرفان)

یتیموں کے ساتھ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طرزِ عمل

سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خود بھی یتیموں کے ساتھ بہتر سلوک کر کے لوگوں کو ترغیب دلائی اور یتیموں کے درجے کو بلند فرمایا۔

حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت جعفر بن ابی طالب کے انتقال کے بعد تین دن تک نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہمارے پاس نہیں آئے، پھر آپ تشریف لائے تو فرمایا کہ آج کے بعد میرے بھائی پر مت رونا۔ پھر آپ نے فرمایا کہ میرے بھائی کے بچوں کو بلاؤ، ہمیں بلایا گیا، ہم چوزوں کی طرح

(چھوٹے چھوٹے) تھے۔آپ نے فرمایا: حجام بلاؤ۔حجام کو بلا کر آپ نے ہمارے سروں کو مونڈنے کا حکم فرمایا۔ (سنن ابی داؤد، حصہ چہارم،ص:۸۳)

پیغمبرِ امن صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پڑوسیوں کے حقوق کو اہمیت دی

پڑوسیوں کے ساتھ ملنا جلنا اور لین دین عام بات ہے۔ پڑوس میں رہنے کی وجہ سے ان سے بار بار سامنا ہوتا ہے اور جانے انجانے میں انھیں تکلیف پہنچنے کا بھی امکان ہوتا ہے۔اس لیے پڑوسیوں کا خیال رکھنے اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کی بھی سخت تاکید ہے۔ جن لوگوں کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا ضروری ہے ان کی فہرست میں قرآنِ مقدس نے پڑوسیوں کو بھی شامل فرمایا ہے۔ارشاد ہے:

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْــًٔـا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِی الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۔ (سورۂ نساء، آیت:۳۶)

ترجمہ: اور اللہ کی بندگی کرو اور اس کا شریک کسی کو نہ ٹھہراؤ اور ماں باپ سے بھلائی کرو اور رشتے داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور پاس کے ہمسائے اور دور کے ہمسائے اور کروٹ کے ساتھی اور راہ گیر اور اپنی باندی غلام سے۔(کنزالایمان)

پڑوسی کے ساتھ حسنِ سلوک ایمان کا تقاضا ہے

پیغمبرِ رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے تشکیل کردہ معاشرے میں حقوق کی رعایت پر جگہ جگہ توجہ دلائی گئی ہے۔درحقیقت امنِ عالم کی بحالی اسی وقت ممکن ہوسکتی ہے جب ہر کسی کے حقوق صحیح طور پر ادا کیے جائیں۔ پڑوسیوں کے حقوق کی ادائیگی اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا بھی سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ان تعلیمات میں سے

ہے جن کے تعلق سے آپ نے سخت تاکیدیں فرمائی ہیں۔

حضرت ابوشریح خزاعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ سرورِکونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ، فَلْيُحْسِنْ اِلٰى جَارِهٖ۔ (سنن ابن ماجہ، حصہ دوم، ص:۱۲۱۱)

ترجمہ: جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہیے کہ اپنے پڑوسی کے ساتھ حسنِ سلوک کرے۔

ایک روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہے کہ سرورِکائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: خدا کی قسم وہ مومن نہیں، خدا کی قسم وہ مومن نہیں، خدا کی قسم وہ مومن نہیں۔ عرض کی گئی: یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیک وسلم! کون مومن نہیں؟ آپ نے فرمایا: جس کی تکلیف سے اس کا پڑوسی محفوظ نہیں ہے۔ (صحیح البخاری، حصہ ہشتم، ص:۱۰)

پتہ چلا کہ پڑوسیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا ایمان کا تقاضا ہے اور ایمان والے کو اس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ پڑوسیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کرے، ان کا خیال کرے اور اپنے کسی کردار یا عمل سے انھیں تکلیف نہ پہنچائے۔

جو شخص خوشحال ہے اور اس کے پڑوسی نادار ہیں اور وہ اپنے پڑوسیوں کی خبر گیری نہیں کرتا اس کے تعلق سے آقائے نعمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَيْسَ الْمُؤْمِنُ الَّذِیْ يَشْبَعُ وَجَارُهٗ جَائِعٌ اِلٰى جَنْبِهٖ۔

(شعب الایمان للبیہقی، حصہ دوازدہم، ص:۸۷)

ترجمہ: وہ مومن نہیں جو شکم سیر ہو اور اس کے بغل میں اس کا پڑوسی بھوکا ہو۔

پڑوسیوں کے معاملے میں سخت تاکید

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مَا زَالَ جِبْرِيْلُ يُوصِيْنِي بِالْجَارِ، حَتّٰى ظَنَنْتُ اَنَّهٗ سَيُوَرِّثُهٗ۔ (سنن ابن ماجہ، حصہ دوم، ص:۱۲۱۱)

ترجمہ: حضرت جبریل علیہ السلام مجھے پڑوسی کے معاملے میں تاکید کرتے رہے یہاں تک کہ مجھے ایسا لگنے لگا کہ اسے وراثت میں حصے دار قرار دے دیا جائے گا۔

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ قریبی رشتے داروں کے حقوق کی رعایت کرنا جس قدر ضروری ہے اسی قدر پڑوسیوں کے حقوق کی رعایت کرنا بھی ضروری ہے۔ پڑوسیوں کے حقوق کی رعایت کے تعلق سے خدائے تعالیٰ کی جانب سے اس قدر تاکید ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خیال فرمایا کہ کہیں انھیں حقِ وراثت نہ مل جائے۔

پڑوسی کو نقصان پہنچانا دس گنا بڑا جرم ہے

حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو فرماتے سنا:

لَاَنْ يَّزْنِيَ الرَّجُلُ بِعَشَرِ نِسْوَةٍ خَيْرٌ عَلَيْهِ مِنْ اَنْ يَزْنِيَ بِامْرَأَةِ جَارِهٖ، وَلَاَنْ يَّسْرِقَ الرَّجُلُ مِنْ عَشْرَةِ اَبْيَاتٍ اَيْسَرُ عَلَيْهِ مِنْ اَنْ يَّسْرِقَ مِنْ بَيْتِ جَارِهٖ۔ (شعب الایمان للبیہقی، حصہ دوازدہم، ص:۹۹)

ترجمہ: کوئی شخص اپنے پڑوسی کی عورت کے ساتھ زنا کرے یہ اس کے لیے دس عورتوں کے ساتھ زنا کرنے سے بڑا جرم ہے اور کوئی شخص اپنے پڑوسی کے گھر سے چوری کرے یہ اس کے لیے دس گھروں سے چوری کرنے سے بڑا جرم ہے۔

چوری اور زنا بہر حال گناہ ہیں، ان کی شناعت پڑوسی کی حق تلفی کی وجہ سے بڑھ

جاتی ہے کہ پڑوسی کی عورت کے ساتھ زنا کاری میں ملوث ہونا دس عورتوں کے ساتھ زنا کرنے سے بڑھ کر جرم ہے اور پڑوسی کے گھر سے چوری کرنا دس گھروں سے چوری کرنے سے بڑا جرم ہے۔ زنا کاری اور چوری کتنے بڑے جرائم ہیں ان کا اندازہ ان کی شرعی حدوں سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر کسی شادی شدہ انسان نے زنا کیا تو اسے دنیا میں زندہ رہنے کا حق ہی نہیں ہے بلکہ اسے سرِ عام سنگسار کر کے موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے گا۔ اگر کسی نے چوری کی تو اس کی سزا یہ ہے کہ اس کا ہاتھ کاٹ لیا جائے گا۔ ان حدود سے ان جرائم کی سنگینی کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان پر مرتب ہونے والا عذاب کس قدر شدید ہوگا۔ جو شخص پڑوسی کے ساتھ یہ معاملہ کرے اس پر مرتب ہونے والا عذاب اس سے دس گنا زیادہ ہوگا۔

گوشت پکاؤ تو پڑوسی کے لیے سالن بڑھا دو

گوشت اور اس جیسی لذیذ غذا تیار کی جاتی ہے تو اس کی خوشبو پاس پڑوس میں پھیلتی ہے اور پڑوسی اگر مفلوک الحال ہیں تو اس خوشبو کو سونگھ کر ان کے دل میں خیال آئے گا کہ ہمارے پاس بھی فراوانی ہوتی تو ہم بھی لذیذ کھانا کھاتے۔ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی رحمت ہے کہ آپ نے سالن پکانے والے کو حکم فرمایا:

يَا اَبَا ذَرٍّ، اِذَا طَبَخْتَ مَرَقَةً فَاَكْثِرْ مَاءَهَا وَتَعَاهَدْ جِيْرَانَكَ۔

(شعب الایمان للبیہقی، حصہ دوازدہم، ص: ۹۰)

ترجمہ: اے ابوذر! جب تم گوشت پکایا کرو تو پانی بڑھا دیا کرو اور اپنے پڑوسیوں کا بھی خیال کیا کرو۔

اس روایت سے ایک بات اور معلوم ہوتی ہے کہ پہلے ہی سے پڑوسی کا خیال کرتے ہوئے سالن تھوڑا بڑھا دینا چاہیے اور پکائے گئے سالن میں خاص اس کے لیے حصہ

رکھنا چاہیے۔ یہ ان کے ساتھ حسنِ سلوک ہے اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا اللہ عزوجل اور اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی رضامندی کا ذریعہ ہے۔ پھر اللہ اور رسول کی رضامندی جنت کے حصول کا ذریعہ ہے۔

پڑوسیوں کو تکلیف دینا جہنم میں جانے کا سبب ہے

پڑوسیوں کے ساتھ کبھی بچوں کے معاملات کو لے کر، کبھی دوسرے کسی معاملے کو لے کر کبھی کبھی رنجش والی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسے میں اگر کوئی شخص خود صبر کر لے اور اپنے پڑوسی سے کوئی ایسی بات نہ کہے جو اسے ناگوارِ خاطر محسوس ہو تو یہ اس کے لیے اجرِ عظیم کا باعث ہوگا۔ اس کے مقابل میں اگر کوئی شخص پڑوسیوں سے الجھے اور انھیں اپنی زبان اور کردار سے تکلیف پہنچائے تو اللہ کی بارگاہ میں اس کی عبادت اور قیام غیر مقبول ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں:

نبیِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کہا گیا: فلانی عورت رات بھر عبادت کرتی ہے، دن میں روزے رکھتی ہے، نیک کام کرتی ہے، صدقہ کرتی ہے لیکن اپنی زبان سے اپنے پڑوسیوں کو تکلیف پہنچاتی ہے۔ نبیِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: اس میں کوئی بھلائی نہیں ہے، وہ جہنمی ہے۔ ایک عورت کے بارے میں کہا گیا کہ فلانی عورت صرف فرض نمازیں پڑھتی ہے، ستو صدقہ کرتی ہے لیکن کسی کو تکلیف نہیں پہنچاتی ہے۔ نبیِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ جنتی ہے۔ (شعب الایمان للبیہقی، حصہ دوازدہم، ص: ۹۴)

پڑوسیوں کو تکلیف دینا اللہ کی لعنت مول لینا ہے

حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ سرکارِ ابد قرار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آکر پڑوسی کی شکایت کرنے لگے، آپ نے فرمایا: صبر کرو۔ وہ دوبارہ

آئے تب بھی آپ نے فرمایا: صبر کرو۔ جب چوتھی مرتبہ آئے تو نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے گھر کا سامان نکال کر راستے پر رکھ دو۔

اب جو بھی گزرتا تو پوچھتا کہ کیا ماجرا ہے؟ وہ کہتے کہ ایسا ایسا معاملہ ہوا ہے۔ ہر آنے جانے والا ان کے پڑوسی پر لعنت کرتا ہوا چلا جاتا۔ ان کا پڑوسی نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا: یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیک وسلم! آپ کو پتہ ہے کیا ہوا ہے؟ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کہا: کیا ہوا ہے؟ اس نے کہا: لوگ مجھ پر لعنت کر رہے ہیں۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگوں سے پہلے تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے تجھ پر لعنت کی ہے۔ اس نے کہا: اب میں دوبارہ ایسا نہیں کروں گا۔

جب شکایت کرنے والے نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس آئے تو آپ نے فرمایا: اپنا سامان اٹھالو، اب تمھیں امان مل گئی ہے۔

(شعب الایمان للبیہقی، حصہ دوازدہم، ص:۹۶)

یاد رکھیں! پڑوسیوں کو تکلیف پہنچانا اللہ کی لعنت کا ذریعہ ہے اور جو اللہ کی بارگاہ سے ملعون قرار پایا اس کے لیے جہنم کے دہکتے ہوئے شعلے تیار ہیں۔ اس لیے پڑوسیوں کے معاملے میں حد درجہ احتیاط کی ضرورت ہے اور اس بات کا پورا خیال رکھنا ضروری ہے کہ انھیں ہماری زبان یا کردار سے کوئی تکلیف نہیں پہنچنی چاہیے۔

نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پڑوسیوں کے حقوق تفصیل سے بیان کیے

آقاے رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پڑوسیوں کے حقوق پوری تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ کیا تمھیں پتہ ہے کہ پڑوسی کا کیا حق ہے؟ پڑوسی کا حق یہ ہے کہ۔۔۔۔۔

(۱) جب تم سے کسی معاملے میں مدد مانگے تو تم اس کی مدد کرو۔
(۲) جب تم سے قرض مانگے تو تم اس کو قرض دو۔
(۳) جب اسے کسی چیز کی حاجت ہو تو تم اس کی حاجت پوری کرو۔
(۴) جب وہ بیمار ہو تو تم اس کی عیادت کرو۔
(۵) جب اسے کوئی خوشی میسر آئے تو تم اس کو مبارکباد پیش کرو۔
(۶) جب اس کو کوئی مصیبت آئے تو تم اس کی تعزیت کرو۔
(۷) جب اس کا انتقال ہو جائے تو تم اس کے جنازے میں شریک ہو۔
(۸) اپنے گھر کی عمارت کو اس کے گھر کی عمارت سے بلند نہ کرو کہ اس کی طرف ہوا نہ جا سکے مگر اس کی اجازت سے۔
(۹) اس کو اپنی ہانڈی کی خوشبو سے تکلیف مت دو، مگر یہ کہ تم اس کو اس میں سے کچھ بھیج دیا کرو۔
(۱۰) پھل خریدو تو اس کو اس میں سے تحفہ دو، اگر یہ نہیں کر سکتے تو خفیہ طور پر لے کر جاؤ۔ تمھارے بچے بھی پھل ہاتھ میں لیے ہوئے باہر نہ جائیں۔

کیا تم جانتے ہو کہ پڑوسی کا حق کیا ہے؟ خدا کی قسم! پڑوسی کا حق بہت کم ہی لوگ ادا کر پاتے ہیں۔ (شعب الایمان للبیہقی، حصہ دوازدہم، ص: ۱۰۴)

نبیِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے کافر پڑوسیوں کو بھی حقِ پڑوس دیا ہے

مذکورہ حقوق بیان فرمانے کے بعد آقائے رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: پڑوسی تین طرح کے ہوتے ہیں:- بعض کے تین حقوق ہوتے ہیں، بعض کے دو حقوق ہوتے ہیں اور بعض کا صرف ایک حق ہوتا ہے۔

(۱) وہ جس کے تین حقوق ہیں وہ پڑوسی ہے جو رشتے دار بھی ہے اور مسلم بھی ہے۔ اس کے لیے اسلام کا حق بھی ہے، رشتے داری کا حق بھی ہے اور پڑوس کا حق بھی ہے۔

(۲) وہ پڑوسی جو مسلم ہے لیکن رشتے دار نہیں ہے۔ اس کے لیے اسلام کا حق ہے اور پڑوس کا حق ہے۔

(۳) وہ پڑوسی جو کافر ہے، اس کے لیے صرف پڑوس کا حق ہے۔ (ایضًا، ص:۱۰۵)

حاصلِ کلام یہ کہ اگر کسی پڑوسی کے ساتھ پڑوس کے علاوہ اور کوئی قرابت بھی ہے تو اس کا حق دوبالا ہوجاتا ہے۔ نیز یہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خاصیت ہے کہ آپ نے کفار کو بھی حقوق فراہم کیے ہیں۔

پڑوسیوں کی بات انسان کے اچھے یا برے ہونے کی کسوٹی ہے

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں:

جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللهِ دُلَّنِيْ عَلٰى عَمَلٍ اِذَا عَمِلْتُ بِهٖ دَخَلْتُ الْجَنَّةَ؟ قَالَ: كُنْ مُحْسِنًا، قَالَ: كَيْفَ اَعْلَمُ اَنِّيْ مُحْسِنٌ؟ قَالَ: سَلْ جِيْرَانَكَ، فَاِنْ قَالُوْا: اِنَّكَ مُحْسِنٌ فَاِنَّكَ مُحْسِنٌ، وَاِنْ قَالُوْا: اِنَّكَ مُسِيْءٌ فَاَنْتَ مُسِيْءٌ۔ (شعب الایمان للبیہقی، حصہ دوازدہم، ص:۱۱۰)

ترجمہ: ایک شخص نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیک وسلم! کوئی ایسا کام بتائیے کہ میں کروں تو جنت میں داخل ہو جاؤں۔ آپ نے فرمایا: نیک بن جاؤ۔ انھوں نے عرض کی: مجھے کیسے پتہ چلے گا کہ میں نیک ہوں؟ آپ نے فرمایا: پڑوسیوں سے پوچھ لو، اگر کہہ دیں کہ تم نیک ہو تو تم نیک ہو اور اگر کہہ دیں کہ تم برے ہو تو تم برے ہو۔

پتہ چلا کہ پڑوسی جس شخص کو بہتری اور پارسائی کی سند دے دیں تو وہ شخص بہتر اور پارسا ہے اور جو پارسا ہے وہی جنت کا مستحق ہے۔ اسی طرح پڑوسیوں کا کسی شخص کو برا قرار دینا اس کے برے ہونے کی دلیل بھی ہے۔ کیوں کہ ان کے ساتھ روز وشب کے معاملات ہیں اور وہ اس شخص کے احوال سے زیادہ واقف ہوتے ہیں۔ اگر ہر پڑوسی اپنے پڑوسی کے حقوق کو ادا کرنے لگے تو ہمارا معاشرہ امن وسکون کا گہوارہ بن جائے گا اور ہر جگہ امن وشانتی کا ماحول نظر آئے گا۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسافروں کو سہولیات عطا کیں

چودہ سو سال پہلے آج کے دور کی طرح سہولتیں نہیں ہوا کرتی تھیں اور سفر میں نکلنا کسی بڑی مصیبت برداشت کرنے سے کم نہیں ہوا کرتا تھا۔ اسی لیے اہلِ عرب کہا کرتے تھے: اَلسَّفَرُ کَالسَّقَرِ، سفر جہنم نما ہے۔ دورانِ سفر مسافروں کو سفر کی تھکان کے علاوہ کھانے پینے، رہنے سہنے، روپے پیسے ہر چیز کی تنگی اور تکلیف ہوا کرتی تھی۔ اسی لیے مسافروں کو شرعی احکام میں بھی تخفیف دی گئی ہے۔ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مسافروں کے لیے بھی حقوق متعین فرمائے، انھیں سہولتیں فراہم کیں اور انھیں بھی مسلمانوں کی امداد کا مستحق قرار دیا۔ قرآن مقدس کی متعدد آیات جن میں رشتے داروں اور فقرا ومساکین کے تعاون اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کا ذکر ہے وہیں ''ابن السبیل'' کا لفظ بھی آیا ہے۔ ابن السبیل میں مسافر بھی داخل ہیں۔ فرمانِ قرآن ہے:

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ۔ (سورۂ روم، آیت: ۳۸)

ترجمہ: تو رشتے دار کو اس کا حق دو اور مسکین اور مسافر کو۔ (کنزالایمان)

اس آیۂ مقدسہ اور اس طرح کی متعدد آیاتِ مبارکہ میں ابن السبیل یعنی مسافروں

کے حقوق کی ادائیگی سارے مسلمانوں پر ضروری قرار دی گئی ہے۔

مسافروں کے لیے نماز میں تخفیف

سرورِ کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حکمِ قرآن کے مطابق مسافروں کو نماز میں قصر کرنے کا حکم فرمایا۔ چار رکعات والی فرض نمازیں دو دو رکعتیں پڑھی جائیں گی اور سنن مؤکدہ بھی مسافروں کے لیے غیر مؤکدہ کے حکم میں ہو جائیں گی۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلٰوةِ۔ (سورۂ نساء، آیت:۱۰۱)

ترجمہ: اور جب تم زمین میں سفر کرو تو تم پر گناہ نہیں کہ بعض نمازیں قصر سے پڑھو۔

اب نئی ایجادات کی وجہ سے اگرچہ سفر بہت آسان ہو گیا ہے لیکن بحیثیت مسافر اب بھی قصرِ نماز کی یہ سہولت جاری ہے۔ البتہ یاد رہے کہ یہ سہولت شرعی مسافر کے لیے ہے، یعنی جو شخص تین دن اور تین رات کی مسافت کے سفر پر نکلا جس کی مقدار تقریباً ۹۲ کلومیٹر ہے۔ شرعی مسافر کے لیے متعدد شرعی احکام میں تخفیف ہے۔

مسافروں کے لیے مسح علی الخفین کی مدت تین دن ہے

عرب میں پہلے خف پہنا کرتے تھے۔ خف چمڑے یا اس جیسی کسی دبیز چیز کا بنا ہوا ہوتا تھا۔ اگر کوئی شخص باوضو خف پہن لے تو اگر وہ مقیم ہے تو ایک دن اور ایک رات تک جب بھی وضو کرے گا اسے خفین اتار کر پیر دھلنے کی ضرورت نہیں بلکہ وہ ان پر مسح کر سکتا ہے۔ مسافر کو تین دن تین رات مسح کی اجازت دی گئی ہے۔

حضرت صفوان بن عسال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں:

رَخَّصَ لَنَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا كُنَّا مُسَافِرِيْنَ أَنْ لَّا

نَنْزِعَ خِفَافَنَا ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ وَلَيَالِيَهُنَّ۔ (سنن النسائی، حصہ اول، ص: ۸۳)

ترجمہ: نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہمیں رخصت عطا فرمائی ہے کہ جب ہم مسافر ہوں تو تین دن تین رات تک اپنے خف نہ اتاریں۔

بلکہ جب بھی وضو کریں تو خف پر مسح کریں۔ پھر جب مدت ختم ہو جائے تو خف اتار کر پیر دھل لیے جائیں اور پھر سے خفین پہن لیے جائیں۔ واضح ہو کہ یہ مسح صرف خفین یا اس کے حکم میں جو پاپوش ہوں انھی پر جائز ہے، ورنہ جائز نہیں۔

مسافر کے لیے نفل نماز پڑھنے کے دوران استقبال قبلہ ضروری نہیں

مسافر بیرونِ شہر سواری پر بھی نفل پڑھ سکتا ہے اور اس صورت میں استقبالِ قبلہ شرط نہیں بلکہ سواری جس رُخ کو جا رہی ہو ادھر ہی منہ ہو۔ نماز شروع کرتے وقت بھی قبلے کی طرف منہ ہونا شرط نہیں بلکہ سواری جدھر جا رہی ہے اُس طرف ہو اور رکوع وسجود اشارے سے کرے۔

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں: مجھے نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کسی کام سے بھیجا، میں جب واپس آیا تو دیکھا کہ آپ اپنی سواری پر بیٹھے ہوئے مشرق کی طرف رُخ کر کے اشارے سے رکوع وسجود کر کے نماز پڑھ رہے ہیں۔

(سنن الترمذی، حصہ دوم، ص: ۱۸۲)

امام ترمذی اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

وَالْعَمَلُ عَلَيْهِ عِنْدَ عَامَّةِ اَهْلِ الْعِلْمِ لَا نَعْلَمُ بَيْنَهُمْ اخْتِلَافًا، لَا يَرَوْنَ بَأْسًا اَنْ يُّصَلِّيَ الرَّجُلُ عَلٰى رَاحِلَتِهٖ تَطَوُّعًا حَيْثُ مَا كَانَ وَجْهُهٗ اِلَى الْقِبْلَةِ اَوْ غَيْرِهَا۔ (ایضًا)

ترجمہ: سبھی اہلِ علم کے نزدیک اسی پر عمل ہے، ہم ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں جانتے ہیں، وہ حضرات سواری پر نفل نماز پڑھنے کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں کرتے، خواہ اس کا چہرہ قبلے کی طرف ہو یا کسی اور رُخ پر ہو۔

اسی طرح اور بھی متعدد احکامِ شرع ہیں جن میں پیغمبرِ امن ورحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مسافروں کو سہولت فراہم کی ہے تاکہ دورانِ سفر انھیں شرعی احکام پر عمل کرنے میں آسانی ہو۔ پھر جب وہ کسی کے یہاں ٹھہرتے ہیں تو بحیثیت مہمان ہوتے ہیں۔ آقائے نعمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مہمانوں کے حقوق بھی متعین فرمادیے ہیں۔

مہمانوں کو پیغمبرِ امن صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے باعث رحمت قرار دیا

کسی کے گھر مہمان آجائیں تو صاحب خانہ انھیں اپنے لیے باعثِ زحمت سمجھنے لگتا ہے اور بعض لوگ مہمانوں کی آمد سے گھبراتے ہیں۔ پیغمبرِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پہلے تو یہ ذہن دیا کہ مہمان باعثِ رحمت ہیں اور پھر ان کے حقوق متعین فرما کر ان کے لیے آسانی مہیا فرمائی ہے۔

مہمانوں کی تعظیم مسلمانوں کی ذمے داری

مہمانوں کی عزت کرنا، ان کے لیے مناسب انتظام کرنا اور انھیں حتی المقدور سہولت فراہم کرنا سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مسلمانوں کا فریضہ قرار دیا ہے۔

حضرت ابوشریح رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور رحمتِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهٗ۔

(صحیح مسلم، حصہ اول، ص: ٦٨)

ترجمہ: جو اللہ تبارک وتعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہیے کہ

مہمان کی تعظیم کرے۔

اس سے پتہ چلا کہ مہمان کی خدمت کرنا اور اس کے لیے حتی المقدور انتظام کرنا ایمان کا تقاضا ہے۔

مہمان رحمت لے کر آتا ہے

رزق ہر کسی کا اللہ تبارک وتعالیٰ کے ذمۂ کرم پر ہے، وہ ہر شخص کے کھانے پینے کا انتظام فرمانے والا ہے۔ اگر ہمارے یہاں کوئی مہمان آئے اور ہم نے اس کے لیے کھانے پینے کا انتظام کیا تو درحقیقت اس کا حصہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے یہاں بھیجا ہے اور اس کی خدمت کے صلے میں ہمارے گھر برکتوں کا نزول بھی ہونے والا ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور رحمتِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اَلْخَيْرُ اَسْرَعُ اِلَى الْبَيْتِ الَّذِي يُغْشٰى مِنَ الشَّفْرَةِ اِلٰى سَنَامِ الْبَعِيرِ۔ (سنن ابن ماجہ، حصہ دوم، ص: ۱۱۱۴)

ترجمہ: جس گھر میں مہمانوں کا آنا جانا ہو اس گھر میں اونٹ کی طرف بڑھنے والی چھری سے زیادہ تیزی سے بھلائی بڑھتی ہے۔

اس حدیث پاک میں سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہ ذہن دیا کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ مہمانوں کے لیے تکلف کرنا ان کے لیے پریشانی کا باعث ہے بلکہ مہمان ان کے لیے رحمت و برکت لے کر آتا ہے۔

شرعی ضیافت تین دن ہے، اس کے بعد صدقے کا ثواب ہے

کسی مسلمان کا کسی مسلمان پر کسی بھی اعتبار سے خرچ کرنا کبھی رائیگاں نہیں جاتا ہے۔ تین دن تک مہمان نوازی کا حکم ہے، اس کے بعد بھی اگر کھلاتا ہے تو صدقے کا ثواب

ہے۔حضرت ابوشریح عدوی سے مروی ہے کہ رسولِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

جَائِزَتَهٗ يَوْمُهٗ وَلَيْلَتُهٗ وَالضِّيَافَةُ ثَلَاثَةُ اَيَّامٍ، فَمَا كَانَ وَرَاءَ ذٰلِكَ فَهُوَ صَدَقَةٌ عَلَيْهِ۔ (صحیح مسلم، حصہ اول، ص:۶۸)

ترجمہ: پر تکلف ضیافت ایک دن اور ایک رات ہے اور مہمان نوازی تین دن تک ہے۔اس سے اوپر جو بھی ہو اس میں صدقہ کرنے کا ثواب ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ مہمان کو بھی یہ حکم ہوا کہ کسی کے یہاں اتنا نہ رکے کہ اسے تنگی اور پریشانی میں ڈال دے۔جیسا کہ صحیح مسلم کی حدیث میں ہے۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مہمان نوازی

سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے یہاں کوئی مہمان بن کر آتا تو آپ خود اس کی مہمان نوازی فرمایا کرتے تھے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ایک کافر آقائے نعمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے یہاں مہمان بنا، آپ نے بکری کا دودھ دوہنے کا حکم فرمایا، اس نے ایک بکری کا پورا دودھ پی لیا، پھر دوسری بکری کا دودھ دوہنے کا حکم فرمایا، اس نے اس کا بھی پورا دودھ پی لیا یہاں تک کہ اس نے سات بکریوں کا دودھ پی لیا۔پھر صبح ہوئی تو اس نے اسلام قبول کر لیا۔ (صحیح مسلم، حصہ سوم، ص:۱۶۳۲)

آقائے رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حسنِ سلوک کی جو تعلیم فرمائی وہ اسلام کی عظمتوں کو اُجاگر کرتا ہے۔ایسے بے شمار واقعات ملیں گے کہ حسنِ سلوک کی برکت ایسی ظاہر ہوئی کہ کسی کافر کے ساتھ حسنِ سلوک کا معاملہ کیا گیا اور اس سے متأثر ہو کر وہ دامنِ اسلام سے وابستہ ہو گیا۔آج کے زمانے میں اس بات کی زیادہ ضرورت ہے کہ ہم اپنے کردار میں

نبوی تعلیمات کو داخل کریں، صرف زبان سے حدیثیں پڑھنا یا پڑھ کر سنانا کافی نہیں ہے۔

مہمانوں کو خندہ پیشانی کے ساتھ رخصت کیا جائے

عموماً دیکھا جاتا ہے کہ مہمانوں کی آمد سے لوگ اکتاہٹ محسوس کرتے ہیں اور پھر بار بار یہ خیال آتا ہے کہ کتنی جلدی مہمان چلے جائیں۔ اسی اکتاہٹ کی وجہ سے مہمانوں کو صحیح طور پر رخصت بھی کرنے کا ماحول دھیرے دھیرے ناپید ہوتا جا رہا ہے۔ نبوی تعلیم یہ ہے کہ جب مہمان رخصت ہو تو انھیں خندہ پیشانی کے ساتھ رخصت کیا جائے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آقائے کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اِنَّ مِنَ السُّنَّةِ اَنْ يَّخْرُجَ الرَّجُلُ مَعَ ضَيْفِهٖ اِلٰى بَابِ الدَّارِ۔

(سنن ابن ماجہ، حصہ دوم، ص: ۱۱۱۴)

ترجمہ: یہ سنت ہے کہ کوئی شخص مہمان کے ساتھ گھر کے دروازے تک نکلے۔

اس حدیث میں یہ حکم ہے کہ مہمان جب رخصت ہونے لگے تو ادب یہ ہے کہ اسے خندہ پیشانی کے ساتھ رخصت کیا جائے۔ اس رخصت کرنے میں اس بات کا اظہار ہوگا کہ ان کے آنے سے ہم نے اکتاہٹ محسوس نہیں کی ہے بلکہ ان کے آنے کو ہم نے اپنے لیے بہتر اور باعثِ برکت محسوس کیا ہے۔

پیغمبر امن صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معذوروں کے حقوق محفوظ کیے

معذورین میں ان لوگوں کا شمار ہوتا ہے جو جسمانی یا ذہنی کمزوری کی وجہ سے زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ دورِ جدید میں بعض اقوام اور بعض حکومتوں نے ان کے لیے کچھ سہولتیں مہیا کی ہیں لیکن وہ ناکافی ہیں۔ قرآنِ مقدس اور احادیث مبارکہ میں ان کے لیے عبادتوں میں تخفیف کی گئی ہے۔ پیغمبرِ امن صلی اللہ علیہ وسلم نے چودہ سو سال پہلے ان کے

لیے مستقل حقوق متعین فرمائے اور مسلمانوں کو تاکید فرمائی کہ ان کی خبر گیری کریں۔

معذوروں سے عبادات میں تخفیف

بہت سی ایسی عبادتیں جن میں جسمانی تھکان ہوتی ہے سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حکمِ قرآن کے مطابق ان سے یا تو معذوروں کو بالکلیہ مستثنیٰ کر دیا ہے یا پھر ان میں ان کے لیے تخفیف پیدا فرما دی ہے۔ اگر مالدار ہیں لیکن معذور ہیں تو حج میں حج بدل کی صورت رکھی گئی ہے، روزے میں فدیہ دے سکتے ہیں۔ ان کو جہاد سے بھی مستثنیٰ کیا گیا ہے۔

قرآن مقدس میں ارشاد ہوا:

لَيْسَ عَلَى الْأَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ۔ (سورۂ فتح، آیت: ۱۷)

ترجمہ: اندھے پر تنگی نہیں اور نہ لنگڑے پر مضائقہ اور نہ بیمار پر مواخذہ۔

حد تو یہ ہے کہ یہ معذور حضرات جو اپنی معذوری کے سبب جہاد میں شرکت نہیں کر سکتے، ان کے لیے بھی مجاہدین کے برابر اجر و ثواب کا وعدہ ہے۔

غزوۂ تبوک سے واپسی میں جب مدینے سے قریب ہوئے تو سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صحابہ سے ارشاد فرمایا: تمھارے پیچھے مدینے میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ تم جس وادی کو بھی طے کرتے ہو اور جس راستے پر بھی چلتے ہو تمھارے ساتھ وہ اجر میں برابر کے شریک ہیں۔ صحابۂ کرام نے پوچھا: یہ کیسے ہو سکتا ہے جب کہ وہ مدینے میں بیٹھے ہیں؟ آپ نے فرمایا: اس لیے کہ وہ عذر کی وجہ سے مدینے میں رکے ہوئے ہیں۔

(صحیح البخاری، حصہ ششم، ص: ۸)

پتہ چلا کہ اگر کوئی عذر کی وجہ سے عبادت کا کوئی کام نہیں کر پا رہا ہے لیکن نیت تھی

تو اجر وثواب سے محروم نہیں ہوگا بلکہ اس کے لیے بھی اجر وثواب میں حصہ متعین ہے۔

معذور کے عذر کی وجہ سے خیارِ شرط کی مشروعیت

خیارِ شرط کی تعریف وتشریح کرتے ہوئے فقیہ العصر صدر الشریعہ بدر الطریقہ حضرت علامہ مولانا مفتی محمد امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

بائع ومشتری کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ قطعی طور پر بیع نہ کریں بلکہ عقد میں یہ شرط کر دیں کہ اگر منظور نہ ہوا تو بیع باقی نہ رہے گی، اسے خیارِ شرط کہتے ہیں۔ (بہار شریعت)

غبن اور نقصان سے بچانے کے لیے یہ شرعی حکم جو بیان ہوا وہ ایک معذور صحابیِ رسول کی وجہ سے ہوا۔ حضرت محمد بن یحییٰ بن حبان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرے دادا مُنقِذ بن عمرو کا واقعہ ہے کہ ان کے دماغ میں چوٹ لگنے کی وجہ سے ان کی زبان بھی متأثر ہو گئی تھی اس لیے وہ خرید وفروخت میں دھوکا کھا جایا کرتے تھے۔ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور انھوں نے اس کا ذکر کیا تو آقائے نعمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِذَا اَنۡتَ بَایَعۡتَ، فَقُلۡ: لَّا خِلَابَةَ. ثُمَّ اَنۡتَ فِي كُلِّ سِلۡعَةٍ ابۡتَعۡتَهَا بِالۡخِيَارِ ثَلَاثَ لَيَالٍ، فَاِنۡ رَضِيۡتَ فَاَمۡسِكۡ، وَاِنۡ سَخِطۡتَ فَارۡدُدۡهَا عَلٰى صَاحِبِهَا۔ (سنن ابن ماجہ، حصہ دوم، ص:۷۸۹)

ترجمہ: جب تم خرید وفروخت کا معاملہ کرو تو کہو: کسی قسم کا دھوکا نہیں ہونا چاہیے۔ پھر ہر مال کے تعلق سے تمھیں تین دنوں تک خیارِ شرط ہوگی، اگر تمھیں ٹھیک لگے تو اپنے پاس روکے رکھنا اور اگر ٹھیک نہ لگے تو تم واپس کر سکتے ہو۔

معذور اپنے عذر پر صبر کرے تو جنت یقینی

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اگر دنیا میں کسی کو معذور بنا دیا تو اس پر ناشکری کا اظہار نہیں

کرنا چاہیے بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ دنیا میں کسی کو ادنیٰ سی بھی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اس کے لیے ذخیرۂ آخرت بنتا ہے۔

حضرت عطا بن رباح رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھ سے فرمایا: کیا میں تجھے ایک جنتی عورت نہ دکھاؤں؟ میں نے عرض کی: ضرور دکھایئے۔ فرمایا: وہ سامنے کھڑی ہوئی حبشی عورت۔ اس نے ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کی تھی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیک وسلم! مجھے مرگی کا دورہ پڑتا ہے جس کے باعث میرا استر ظاہر ہوجاتا ہے۔ آپ اللہ تعالیٰ سے میرے لیے دعا فرما دیجیے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر تو چاہے تو صبر کر، اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ تجھے جنت عطا فرمائے گا اور اگر پسند کرے تو اللہ تعالیٰ سے تیرے لیے عافیت اور تندرستی کی دعا کروں۔

اس عورت نے عرض کی: میں ان شاء اللہ صبر کروں گی لیکن آپ یہ دعا ضرور فرما دیجیے کہ اس حالت میں میرا استر ظاہر نہ ہوا کرے۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کے لیے حفاظتِ ستر کی دعا فرمائی۔ (الدر المنثور، حصہ پنجم، ص: ۱۶۲)

یہ واقعہ درسِ نصیحت ہے خصوصًا خواتین کے لیے کہ وہ اللہ کی نیک بندی اپنی تکلیف سے اس قدر پریشان نہیں تھیں جس قدر انھیں اپنے ستر کے کھلنے کا خوف تھا۔ اس روایت میں دیکھیں کہ سرور کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پریشانی، مصیبت اور عذر لاحق ہونے کی صورت میں صبر کرنے پر جنت کی بشارت عطا فرمائی ہے۔

معذور صحابیِ رسول کو سرکار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا نائب بنایا

معذوروں کو سرکارِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کتنا بلند مقام عطا فرمایا اس کا

اندازہ اس روایت سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ غزوۂ اُحد کے لیے جب رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نکلے تو آپ نے نابینا صحابی حضرت عبداللہ بن ام مکتوم کو مدینۂ منورہ میں اپنا نائب مقرر فرمایا۔ حضرت ابوعفیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں: اِسْتَخْلَفَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلَی الْمَدِیْنَۃِ ابْنَ أُمِّ مَکْتُوْمٍ۔

(مغازی الواقدی، حصہ اول، ص: ۱۸۴)

ترجمہ: رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مدینۂ منورہ پر حضرت عبداللہ بن امّ مکتوم کو اپنا نائب مقرر فرمایا۔

اگر کوئی شخص جسم کے کسی عضو کے اعتبار سے کمزور ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بالکل ناکارہ ہے بلکہ بارہا ایسا دیکھا گیا ہے کہ جسمانی اعتبار سے کوئی شخص کمزور ہوتا ہے لیکن دیگر معاملات میں بہت قوی ہوتا ہے۔ اس لیے کسی معذور کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیے۔ بلکہ مذکو ہر حدیث میں آپ نے دیکھا کہ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے معذور صحابی کو اپنا نائب مقرر فرما کر ان کی عزت افزائی فرمائی۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معذوروں کی دلجوئی فرماتے

سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ذمے تبلیغی مشاغل اور گوناگوں مصروفیات تھیں اس کے باوجود آپ اپنے غلاموں کا بھرپور خیال فرمایا کرتے تھے۔ امیر ہو کہ غریب، تندرست ہو کہ بیمار، صحیح ہو کہ معذور جہاں جیسی ضرورت پڑتی سب کی دلجوئی فرماتے۔

حضرت عتبان بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو کہ نابینا تھے، اپنی قوم کی امامت کیا کرتے تھے۔ انھوں نے سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی: تاریک راتوں میں اور بارش کے دنوں میں مجھے مسجد آنے جانے میں تکلیف ہوتی ہے، اگر

آپ میرے گھر میں کسی جگہ پر نماز ادا فرما لیں تو اس جگہ کو میں اپنے لیے جاے نماز بنا لوں گا۔ نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ان کے گھر تشریف لائے اور ان سے پوچھا: کس جگہ پر میں نماز پڑھوں؟ انھوں نے گھر کے ایک حصے کی طرف اشارہ کیا، سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس مقام پر نماز ادا فرمائی۔ (صحیح البخاری، حصہ اول، ص: ۱۳۴)

اس روایت میں دیکھیں کہ آقاے نعمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے معذور صحابی کی دلجوئی کے لیے خود ان کے گھر تشریف لے گئے اور وہاں نماز پڑھی تاکہ وہ جگہ متبرک ہو جائے اور اس جگہ کو وہ اپنے لیے جاے نماز بنا لیں۔

مسکینوں اور غریبوں کو پیغمبر امن صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عزت دی

فقیر وہ ہے جس کے پاس کچھ ہو اور مسکین وہ ہے جس کے پاس کچھ نہ ہو۔ عموماً فقیروں اور مسکینوں کو معاشرے میں کمترین درجہ دیتے ہیں۔ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انھیں حسنِ سلوک کا مستحق قرار دیا اور ان کے لیے مسلمانوں کے اموال میں حصہ مقرر فرمایا۔ خوشی کا موقع ہو تب بھی، غم کا وقت ہو تب بھی اور کوئی شرعی جرم یا جنایت کر لیا تب بھی فقرا و مساکین پر صدقہ کرنے اور انھیں کھلانے پلانے کا حکم ہوا۔ قرآن مقدس میں جگہ جگہ ان پر صدقہ کرنے، ان کی خبر گیری کرنے اور انھیں کھلانے پلانے کی تاکید کی گئی ہے۔ آیاتِ مقدسہ کی تعداد بہت زیادہ ہے، ان کا خلاصہ ذکر کیا جاتا ہے۔

☆ دورِ جاہلیت میں جن کاموں کو وہ نیکی سمجھتے تھے وہ دراصل نیکی نہیں ہے، نیکی یہ ہے کہ مسکینوں کی مالی امداد کی جائے۔

☆ ایک تفسیر کے مطابق پہلے روزہ جب فرض ہوا تو اختیار دیا گیا کہ یا تو روزے رکھے جائیں یا ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلایا جائے۔

☆ شیخ فانی جس کے اندر اب کبھی روزہ رکھنے کی طاقت نہیں آسکتی ہے وہ ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلائے۔

☆ جب نیکی کرنے کا ارادہ ہو تو مساکین کو مالی امداد فراہم کی جائے۔

☆ وراثت کی تقسیم کے وقت کوئی مسکین آجائے تو اسے بھی کچھ دے دیا جائے۔

☆ قسم پوری نہیں کیا تو دس مسکینوں کو کھانا کھلائے۔

☆ حدود حرم میں کسی شکار کا قتل کیا تو اس کی قیمت کے برابر مسکینوں کو کھانا کھلائے۔

☆ مالِ غنیمت میں مسکینوں کا حصہ مقرر کیا گیا۔

☆ مسلمانوں پر مال کا چالیسواں حصہ بطور زکوٰۃ ادا کرنا فرض کیا گیا اور زکوٰۃ وصدقات کا مسکینوں کو مستحق قرار دیا گیا۔

☆ حضرت مسطح نادار تھے، سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کا خرچ اٹھاتے تھے، اُم المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر تہمت لگانے والوں کے ساتھ انھیں دیکھ کر آپ نے ان کی مدد نہ کرنے کی قسم کھائی تو قرآنِ مقدس میں اس طرح کی قسم سے منع کیا گیا۔

☆ جو اللہ کی رضا چاہتا ہے اس کو چاہیے کہ مسکینوں کی مدد کرے۔

☆ کسی نے ظہار کر لیا اور کفارے میں پے در پے دو ماہ کے روزے نہیں رکھ سکتا ہے تو بطور کفارہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔

☆ مالِ فے میں ایک حصہ مسکینوں کا مقرر کیا گیا۔

☆ مسکینوں کی مدد نہ کرنا جہنم میں لے جانے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

☆ اللہ کے مخصوص بندوں کی علامت یہ ہے کہ خود ان کے دل کا میلان کھانے کی

طرف ہوتا ہے اس کے باوجود وہ مسکین کو کھلا دیتے ہیں۔

☆ مسکین کی مدد نہ کرنے والے کی قرآن میں مذمت کی گئی ہے۔

☆ مسکینوں کو سختی کے دنوں میں کھانا کھلانے والا قیامت کے دن نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں پائے گا۔

اسی طرح احادیث مبارکہ میں جگہ جگہ فقرا ومساکین کی مدد کرنے کی تاکید کی گئی ہے، ان کی مدد کے فائدے بیان کیے گئے ہیں اور مسلمانوں کو ان کی مدد پر ابھارا گیا ہے۔

☆ اگر کوئی شخص اپنی پاکیزہ کمائی سے کسی فقیر یا مسکین پر ایک کھجور کے برابر بھی صدقہ کرتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اسے بڑھاتا ہے یہاں تک کہ وہ پہاڑ کے برابر ہو جاتا ہے۔ (بخاری، مسلم)

☆ فقیروں اور مسکینوں کو کھلانا کبھی مال کو کم نہیں کرتا۔ (بخاری، مسلم)

☆ فقیروں اور مسکینوں کی مدد کرنا اللہ کے غضب سے نجات دیتا ہے اور بری موت سے بچاتا ہے۔ (ترمذی)

☆ جو کسی حاجت مند مسلمان کو کپڑا پہنائے اللہ تعالیٰ اس کو جنت کے سبز کپڑے پہنائے گا۔ جو کسی حاجت مند کو کھانا کھلائے اللہ تعالیٰ اس کو جنت کا پھل کھلائے گا۔ جو کسی پیاسے کو پانی پلائے اللہ تعالیٰ اس کو رحیق مختوم کا پانی پلائے گا۔ (ترمذی)

☆ جس نے کسی حاجت مند کو کپڑا پہنایا، جب تک وہ کپڑا اس کے بدن پر ہوگا یہ اللہ کے حفظ وامان میں ہوگا۔ (احمد، ترمذی)

☆ جو شخص کسی فقیر یا مسکین کی خفیہ طور پر مدد کرے گا وہ اللہ کا محبوب ہے۔ (ترمذی)

☆ فقیر اور مسکین کی مدد کرنے والا قیامت کے دن سایہ پائے گا۔ (احمد)

☆ نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر میرے پاس اُحد کے برابر سونا بھی ہوتا تو میں تین دنوں تک اسے اپنے پاس رکھنا پسند نہیں کرتا۔ (بخاری)

ان کے علاوہ متعدد احادیث مبارکہ ہیں جن میں سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فقرا ومساکین کی امداد کرنے کی تاکید فرمائی ہے، آپ نے انھیں معاشرے میں عزت کا مقام دیا ہے۔ ان کی مدد کی طرف لوگوں کو راغب کرنے کے لیے ان کی مدد کے بے شمار فوائد وفضائل بیان فرمائے۔ بلکہ آپ کے قائم کردہ نظام میں جگہ جگہ صدقات وخیرات بلکہ کفاروں اور فدیوں کا رواج بھی اسی لیے ہے کہ ان سے غریبوں مسکینوں کی امداد ہوتی ہے۔

اسلام کی بنیاد غریبوں میں رکھی گئی

غریبوں کے لیے باعث شرف یہی بات ہے کہ اسلام کی بنیاد غریبوں میں رکھی گئی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بَدَاَ الْاِسْلَامُ غَرِیْبًا وَسَیَعُوْدُ کَمَا بَدَاَ غَرِیْبًا فَطُوْبٰی لِلْغُرَبَاءِ۔
(صحیح مسلم، حصہ اول، ص: ۱۳۰)

ترجمہ: اسلام غریبوں میں شروع ہوا اور وہ دن دور نہیں کہ غریبوں کی طرف لوٹ جائے گا جیسے شروع میں تھا، تو غریبوں کے لیے خوش خبری ہو۔

آج دنیا اس کا مشاہدہ کر رہی ہے کہ صاحبانِ ثروت اسلامی احکام پر عمل پیرا ہونے میں کسرِ شان سمجھتے ہیں اور مسجدوں، اجتماعات، دینی قافلوں اور دینی محافل میں عموماً غربا ہی نظر آتے ہیں۔ صاحبانِ ثروت اپنے بچوں کو دینی تعلیم دلانا پسند نہیں کرتے اور غریبوں کے بچے دین کی تعلیم حاصل کر کے مسلمانوں کی قیادت کرتے ہیں۔

فقرا ومساکین سے بھلی بات کی جائے

کوئی سائل سوال کرنے آیا اور اسے دینے کے لیے کچھ نہیں ہے تو اس کے ساتھ نرم بات کرنے کا حکم ہے۔ اگر اس نے کسی وجہ سے ایسی بات کہہ دی جو ہمیں بری لگ گئی تب بھی اس سے نرم گفتگو کی جائے۔ یہی تعلیم اس آیۂ مقدسہ میں دی گئی ہے:

قَوۡلٌ مَّعۡرُوۡفٌ وَّمَغۡفِرَةٌ خَيۡرٌ مِّنۡ صَدَقَةٍ يَّتۡبَعُهَاۤ اَذًى۔

(سورۂ بقرہ، آیت: ۲۶۳)

ترجمہ: اچھی بات کہنا اور درگزر کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے بعد ستانا ہو۔

اس آیت میں اس بات کا حکم دیا گیا کہ اگر کسی نے ہمارے سامنے دستِ سوال دراز کیا اور ہم اس کی کچھ مدد کر سکتے ہیں تو کر دیں، ورنہ معذرت کر لیں کہ ہمارے لیے مدد کا امکان نہیں ہے۔ اگر کسی نے مدد کر دیا لیکن اس سے ایسی کوئی بات کہہ دی جس کی وجہ سے اس کے دل کو ٹھیس پہنچی تو اس کا یہ مدد کرنا بے سود ہو گیا۔

فقرا و مساکین ہمارے صدقات قبول کر لیتے ہیں تو اس میں ہمارا ہی فائدہ ہے

کوئی شخص یہ نہ سمجھے کہ فقرا و مساکین کا تعاون کر کے وہ ان پر احسان کر رہا ہے بلکہ اس میں خود تعاون کرنے والے کے لیے فوائد ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے فرمایا:

خُذۡ مِنۡ اَمۡوٰلِهِمۡ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمۡ وَتُزَكِّيۡهِمۡ۔ (سورۂ توبہ، آیت: ۱۰۳)

ترجمہ: اے محبوب! ان کے مال میں سے زکوٰۃ تحصیل کرو جس سے تم انھیں ستھرا اور پاکیزہ کر دو۔ (کنز الایمان)

اس آیۂ مقدسہ سے معلوم ہوا کہ یہ صدقہ اور زکوٰۃ جو فقرا و مساکین کو دی جاتی ہے، وہ اسے قبول کر لیتے ہیں تو ہمارے لیے طہارت اور تزکیہ کا ذریعہ بنتا ہے۔ اگر فقرا و مساکین نہ ہوں تو ہم اس عظیم اجر و ثواب اور خیر و برکت سے محروم ہو جائیں گے جو ان کے تعاون اور مدد سے ہمیں حاصل ہوتا ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا معمول

سرورِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فقرا و مساکین کی خبر گیری خود کر کے دکھائی ہے اور یہ حکم فرمایا کہ جس سے جس قدر ممکن ہو ان کی خبر گیری کرتے رہنا چاہیے۔

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سرکارِ ابد قرار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے معمولات بیان کرتے ہوتے فرماتے ہیں:

كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُكْثِرُ الذِّكْرَ وَيُقِلُّ اللَّغْوَ وَيُطِيْلُ الصَّلٰوةَ وَيُقْصِرُ الْخُطْبَةَ وَلَا يَأْنَفُ اَنْ يَّمْشِيَ مَعَ الْاَرْمَلَةِ وَالْمِسْكِيْنِ فَيَقْضِيَ لَهُ الْحَاجَةَ۔ (سنن نسائی، حصہ سوم، ص:۱۰۸)

ترجمہ: سرورِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کثرت سے ذکرِ الٰہی کیا کرتے، لغویات سے اجتناب فرماتے، نماز لمبی پڑھتے، خطبہ مختصر ارشاد فرماتے اور بیواؤں اور مسکینوں کے ساتھ چلنا اور ان کی حاجتیں پوری کرنا پسند فرمایا کرتے تھے۔

سرورِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ ہمارے لیے مشعلِ راہ اور آپ کی ذات میں ہمارے لیے اسوۂ حسنہ ہے۔ آپ کے ان معمولات پر عمل پیرا ہونا ہمیں دنیا اور آخرت میں کامیاب بنا سکتا ہے، خصوصیت کے ساتھ بیواؤں اور مسکینوں کی مدد اور ان کی خبر گیری کرنا ہمارے لیے بے شمار فضائل و فوائد کا باعث ہے۔

فقرا و مساکین کی مدد کرنے پر جہاد کا ثواب

جہاد فی سبیل اللہ ایسی عبادت ہے جس میں ایک بندۂ مومن اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر نکلتا ہے، اللہ کے دشمنوں سے لڑتا ہے، ان کے سر قلم کرتا ہے، اگر زندہ واپس آیا تو غازی کہلاتا ہے اور اگر قتل کر دیا گیا تو شہید کہلاتا ہے۔ جان کی بازی لگا کر جو اجر و ثواب ملتا ہے اسی جیسا اجر و ثواب پانا ہے تو اس کا طریقہ بھی آقائے کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بیان فرما دیا ہے۔ حضرت صفوان بن سُلیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اَلسَّاعِیْ عَلَی الْاَرْمَلَةِ وَالْمِسْکِیْنِ کَالْمُجَاھِدِ فِیْ سَبِیْلِ اللہِ۔

(سنن الترمذی، حصہ چہارم، ص: ۳۴۶)

ترجمہ: بیواؤں اور مسکینوں کی مدد کے لیے کوشش کرنے والا اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کی طرح ہے۔

ان آیات و روایات سے یہ بات عیاں ہوگئی کہ سرورِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فقرا و مساکین کو معاشرے میں مقام عطا فرمایا، ان کی مدد کی تاکید فرمائی، خود بھی ان کی خبر گیری فرمائی اور دوسروں کو بھی ان کی مدد پر اُبھارا اور مدد پر اجر و ثواب کا وعدہ فرمایا۔

معلم کے مقام کو آقائے کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بلند فرمایا

معلم یعنی وہ شخص جو علمِ دین سکھانے میں مصروف ہو اسے سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بڑی اہمیت دی ہے اس لیے کہ علمِ دین کی ترویج و اشاعت میں معلم کا انوکھا کردار ہوتا ہے۔ اسی لیے اللہ تبارک و تعالیٰ نے علم والوں کا مقام و مرتبہ بہت بلند فرمایا ہے۔ قرآنِ مقدس میں ارشادِ ربانی ہے:

يَرۡفَعِ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡكُمۡ ۙ وَالَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ دَرَجٰتٍ۔

(سورۂ مجادلہ، آیت:۱۱)

ترجمہ: اللہ تمھارے ایمان والوں کے اور ان کے جن کو علم دیا گیا درجے بلند فرمائے گا۔(کنزالایمان)

یہ بڑا کرم ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کا کہ علم عطا فرمانے کے لیے خود ہی منتخب فرماتا ہے اور پھر خود ہی بلندیِ درجات سے بھی سرفراز فرماتا ہے۔

علما کو مرجعِ خلائق بنایا گیا

علم والوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے سب کے لیے مرجع بنایا ہے اور حکم ہوا کہ اگر کسی معاملے کا علم نہیں ہے تو علم رکھنے والوں سے رجوع کریں۔ فرمانِ قرآن ہے:

فَسۡـَٔلُوۡۤا اَهۡلَ الذِّكۡرِ اِنۡ كُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ۔ (سورۂ نحل، آیت:۴۳)

ترجمہ: تو اے لوگو علم والوں سے پوچھو اگر تمھیں علم نہیں۔(کنزالایمان)

عالم کو عابد پر فضیلت ہے

ایک عابد جو قیامِ شب کرتا ہے، دن میں روزے رکھتا ہے، نوافل پڑھتا ہے اور ان کاموں سے اللہ کی رضا جوئی کرتا ہے۔ ایک عالم ہے جو فرائض وواجبات کی پابندی کرتا ہے، حرام کاموں سے پرہیز کرتا ہے اور لوگوں کو علم سکھاتا ہے۔ آقاے کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق دونوں کے درجوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔

حضرت ابواُمامہ باہلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

ذُكِرَ لِرَسُوۡلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ رَجُلَانِ اَحَدُهُمَا عَابِدٌ

وَالْاٰخَرُ عَالِمٌ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَی الْعَابِدِ کَفَضْلِی عَلٰی اَدْنَاکُمْ۔ (سنن الترمذی، حصہ پنجم، ص:۵۰)

ترجمہ: نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سامنے دولوگوں کا ذکر کیا گیا، ایک عابد اور دوسرا عالم۔ رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: عالم کی فضیلت عابد پر ایسے ہے جیسے میری فضیلت تم میں سے سب سے کم درجے کے مسلمان پر ہے۔

یہ فضیلت اس لیے ہے کہ عبادت سے انسان اپنے آپ کو جہنم میں جانے سے بچا سکتا ہے لیکن علم سے انسان لاکھوں کو بچا سکتا ہے۔ عابد پر شیطان کا داو پیچ چل سکتا ہے لیکن عالم پر شیطان اپنا فریب مسلط کردے یہ مشکل ہوتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

فَقِیْہٌ اَشَدُّ عَلَی الشَّیْطَانِ مِنْ اَلْفِ عَابِدٍ۔ (سنن الترمذی، حصہ پنجم، ص:۴۸)

ترجمہ: ایک عالم شیطان پر ہزار عابدوں سے زیادہ بھاری ہے۔

عالم سب سے بہتر انسان

انسانوں میں بعض کا مرتبہ بعض سے علم وفضل اور دینی مقام کے اعتبار سے بلند ہوتا ہے۔ سب سے افضل انسان انبیاے کرام علیہم السلام، ان کے بعد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ہوتے ہیں کہ ان کے مقام تک کوئی شخص کسی بھی طرح سے پہنچ نہیں سکتا۔ عام انسانوں میں سب سے بہتر انسان سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے علما کو قرار دیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

نِعْمَ الرَّجُلُ الْفَقِیْہُ فِی الدِّیْنِ اِنِ احْتِیْجَ اِلَیْہِ نَفَعَ وَاِنِ اسْتُغْنِیَ

عَنْهُ اَغْنٰى نَفْسَهٗ۔ (مشکوٰۃ المصابیح، حصہ اول، ص: ۸۳)

ترجمہ: عالم کیا ہی بہتر انسان ہوتا ہے کہ اگر کوئی اس کی طرف احتیاج ظاہر کرے تو اسے نفع پہنچاتا ہے اور اگر کوئی اس سے بے نیازی ظاہر کرے تو وہ خود اپنے آپ کو بے نیاز کر لیتا ہے۔

یعنی عالم کو بلند مقام اس لیے ہے کہ اگر کوئی شخص اس کی بارگاہ میں علم کی پیاس لے کر حاضر ہوتا ہے تو وہ اس کی پیاس بجھا دیتا ہے۔

علما کا اٹھ جانا قربِ قیامت کی نشانی

قیامت کے قریب دنیا سے علم ختم ہو جائے گا اور وہ اس طرح سے ہوگا کہ علما کو اللہ تبارک وتعالیٰ دنیا سے اٹھا لے گا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسولِ اعظم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو فرماتے سنا:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَقْبِضُ الْعِلْمَ انْتِزَاعًا يَنْتَزِعُهٗ مِنَ الْعِبَادِ، وَلٰكِنْ يَّقْبِضُ الْعِلْمَ بِقَبْضِ الْعُلَمَاءِ، حَتّٰى اِذَا لَمْ يُبْقِ عَالِمًا اتَّخَذَ النَّاسُ رُءُوْسًا جُهَّالًا، فَسُئِلُوْا فَاَفْتَوْا بِغَيْرِ عِلْمٍ، فَضَلُّوْا وَاَضَلُّوْا۔

(صحیح البخاری، حصہ اول، ص: ۳۱)

ترجمہ: اللہ تبارک وتعالیٰ علم کو بندوں سے یکبارگی نہیں ختم فرمائے گا بلکہ اس طرح سے ختم فرمائے گا کہ علما کو اٹھا لے گا۔ یہاں تک کہ جب کوئی عالم باقی نہیں رہ جائے گا تو لوگ جاہلوں کو اپنا پیشوا بنا لیں گے، ان سے سوال کیے جائیں گے تو وہ بے علم جواب دیں گے، خود بھی گمراہ ہوں گے اور لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے۔

پتہ چلا کہ دنیا میں علما کا موجود ہونا دنیا کے محفوظ ہونے کی علامت ہے اور جیسے جیسے

علما دنیا سے اٹھتے چلے جائیں گے، دنیا قیامت سے قریب ہوتی چلی جائے گی۔

علما انبیا کے وارث ہیں

سرورِکونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی جلوہ گری سے پہلے انبیاے کرام کی آمد کا سلسلہ جاری تھا۔آپ خاتم الانبیاء بنا کر بھیجے گئے اور آپ کے بعد انبیاے کرام کی جلوہ گری کا سلسلہ موقوف ہو گیا۔انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی کی پھر بھی ضرورت تھی تو اس کام کے لیے علما کو انبیا کا نائب اور وارث بنا دیا گیا۔

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ ابدقرار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَۃُ الْاَنْبِیَاءِ، اِنَّ الْاَنْبِیَاءَ لَمْ یُوَرِّثُوْا دِیْنَارًا وَّلَا دِرْھَمًا، اِنَّمَا وَرَّثُوا الْعِلْمَ۔ (سنن ابن ماجہ، حصہ اول، ص:۸۱)

ترجمہ: علما انبیاے کرام علیہم السلام کے وارث ہیں، انبیا علیہم السلام نے درہم و دینار نہیں چھوڑے بلکہ علم چھوڑا۔

پانچواں مت بننا

علما اور معلمین کے ساتھ کس طرح کا معاملہ کرنا چاہیے اس سے اکثر لوگ ناواقف ہوتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے ایک شخص کو علم عطا فرما کر سرفراز فرمایا، اسے معاشرے میں بلند مقام عطا فرمایا اور وہ عوام کی قیادت میں مصروف ہے۔ایسے عالم کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنا چاہیے اس کا ذکر اس حدیثِ پاک میں دیکھیں:

کُنْ عَالِمًا، اَوْ مُتَعَلِّمًا، اَوْ مُسْتَمِعًا، اَوْ مُحِبًّا، وَلَا تَکُنِ الْخَامِسَ فَتَھْلِکَ۔ (تفسیر الرازی، حصہ دوم، ص:۴۰۹)

ترجمہ: عالم بن جا، یا عالم سے علم حاصل کرنے والا بن جا، یا عالم کی بات سننے والا بن جا، یا عالم سے محبت کرنے والا بن جا۔ پانچواں مت بننا کہ تو ہلاک ہو جائے گا۔

اس حدیث سے پتہ چلا کہ غیر عالم کو بہرحال عالم کی عزت اور قدر کرنی چاہیے۔ اگر امکان ہو تو اس کے درسِ علم میں حاضر ہو کر علم حاصل کرنا چاہیے، یہ نہیں کر سکتے تو اگر وہ کبھی کسی بات پر تنبیہ اور تاکید کرے تو اسے سن کر اس پر عمل کرنا چاہیے، اگر عالم سے ملاقات نہیں ہوتی ہے تو کم از کم اتنا ہو کہ دل میں اس کی محبت ہونی چاہیے۔ البتہ پانچواں بننے سے منع فرمایا، یعنی عالم سے بغض اور نفرت کرنے والا مت بننا اس لیے کہ یہ ہلاکت میں ڈالنے والا عمل ہے۔

سرکار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طالب علم کے امتیازات ذکر فرمائے

جو شخص علم حاصل کرنے کے لیے اپنے گھر سے نکلے اور علم کے راستے میں مشقتیں برداشت کرے اسے آقاے کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بڑی اہمیت دی ہے اس لیے علم اور دین کو آگے بڑھانے اور آئندہ نسلوں تک منتقل کرنے میں طالبِ علم کا اہم رول ہوتا ہے۔ وہ اپنے استاذ سے سیکھتا ہے اور پھر خود استاذ بن کر سیکڑوں کو فیضِ علم پہنچاتا ہے۔

علمِ دین چنیدہ لوگوں کو ہی ملتا ہے

علمِ دین طلب کرنے والے کے لیے سب سے فضیلت کی بات یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ یہ علم عطا فرمانے کے لیے انھیں اپنے لاکھوں لاکھ بندوں میں سے چن لیتا ہے۔ یہ اللہ کے مخصوص بندے ہوتے ہیں جنھیں اللہ اپنے فضل سے علمِ دین سے نوازتا ہے۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دورانِ خطبہ نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا یہ فرمان بیان فرمایا:

مَنۡ یُّرِدِ اللہُ بِہٖ خَیۡرًا یُفَقِّھۡہُ فِی الدِّیۡنِ۔ (صحیح البخاری، حصہ اول، ص: ۲۵)

ترجمہ: اللہ تبارک وتعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے اسے دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے۔

یعنی علم ہر کس وناکس کو نہیں دیا جاتا ہے بلکہ علم عطا کرنے کے لیے بندوں میں سے ان کا انتخاب ہوتا ہے جن کے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے۔

طالبِ علم کے لیے فضیلت ہی فضیلت

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آقاے کون ومکاں علیہ التحیۃ والثناء فرماتے ہیں:

مَنْ سَلَكَ طَرِيقًا يَلْتَمِسُ فِيهِ عِلْمًا، سَهَّلَ اللّٰهُ لَهُ طَرِيقًا إِلَى الْجَنَّةِ، وَإِنَّ الْمَلَائِكَةَ لَتَضَعُ أَجْنِحَتَهَا رِضًا لِطَالِبِ الْعِلْمِ، وَإِنَّ طَالِبَ الْعِلْمِ يَسْتَغْفِرُ لَهُ مَنْ فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ، حَتَّى الْحِيتَانِ فِي الْمَاءِ۔

(سنن ابن ماجہ، حصہ اول، ص: ۸۱)

ترجمہ: جو شخص حصولِ علم کے راستے پر نکل جاتا ہے اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان فرماتا ہے۔ فرشتے طالبِ علم سے خوش ہو کر اس کے لیے اپنے پر بچھا دیتے ہیں۔ طالبِ علم کے لیے زمین وآسمان کی ساری چیزیں استغفار کرتی ہیں یہاں تک کہ پانی میں مچھلیاں بھی استغفار کرتی ہیں۔

اس ایک حدیث پاک میں سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے طالب علم کے متعدد فضائل بیان فرما دیے۔ اس سے بڑھ کر فضیلت کیا ہو سکتی ہے کہ معصوم فرشتے ان کے قدموں کے نیچے اپنے نورانی پروں کو بچھا دیتے ہیں۔

علمِ دین حاصل کرنے والوں کا آسمانوں میں ذکر ہوتا ہے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کون ومکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِيْ بَيْتٍ مِنْ بُيُوْتِ اللهِ، يَتْلُوْنَ كِتَابَ اللهِ، وَيَتَدَارَسُوْنَهُ بَيْنَهُمْ، إِلَّا حَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ، وَنَزَلَتْ عَلَيْهِمُ السَّكِيْنَةُ، وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ، وَذَكَرَهُمُ اللهُ فِيْمَنْ عِنْدَهُ۔ (سنن ابن ماجہ، حصہ اول، ص:۸۲)

ترجمہ: جب بھی کوئی قوم اللہ کے کسی گھر میں جمع ہو کر قرآن مقدس کی تلاوت کرتی ہے اور آپس میں اس کے علم کی تکرار کرتی ہے تو فرشتے انھیں گھیر لیتے ہیں، ان پر سکون کی دولت نازل ہوتی ہے، انھیں رحمت ڈھانپ لیتی ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے مقرب فرشتوں میں ان کا ذکر کرتا ہے۔

اس قدر عظیم مرتبہ ہے طالبِ علم کا کہ اسکے لیے فرشتوں کی نگہبانی، سکون اور قرار اور رحمت وبرکت ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ آسمانوں پر اس کا ذکر اور چرچا ہوتا ہے کہ خود خالقِ کائنات عز وجل مقرب فرشتوں میں اس کا ذکر فرماتا ہے۔

طالبِ علم کے لیے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کا ثواب

حدیث پاک میں ہے:

مَنْ جَاءَ مَسْجِدِيْ هٰذَا، لَمْ يَأْتِهِ إِلَّا لِخَيْرٍ يَتَعَلَّمُهُ أَوْ يُعَلِّمُهُ، فَهُوَ بِمَنْزِلَةِ الْمُجَاهِدِ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ۔ (سنن ابن ماجہ، حصہ اول، ص:۸۲)

ترجمہ: جو میری اس مسجد میں صرف اس نیت سے آیا کہ بھلائی کی باتیں سیکھے گا یا دوسروں کو سکھائے گا تو وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کی منزل میں ہے۔

علم حاصل کرنا سابقہ گناہوں کا کفارہ ہے

حضرت سخبرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مَنْ طَلَبَ الْعِلْمَ كَانَ كَفَّارَةً لِّمَا مَضٰى۔ (سنن الترمذی، حصہ پنجم، ص:۲۹)

ترجمہ: جس نے علم حاصل کیا اس کے گزشتہ گناہوں کے لیے وہ کفارہ ہوگا۔

واضح رہے کہ جہاں کہیں بھی کسی نیکی کے تعلق سے یہ مروی ہے کہ وہ گناہوں کا کفارہ بن جائے گی وہاں صغیرہ گناہ مراد ہیں۔ کبیرہ گناہ توبہ کے بغیر نہیں معاف ہوتے ہیں اور اگر وہ کسی کے حق سے متعلق ہیں تو جب تک صاحبِ حق معاف نہ کردے معاف نہیں ہو سکتے ہیں۔ بہرحال طالبِ علم کی فضیلت یہ ہے کہ اس کا طلبِ علم میں مصروف رہنا اس کے صغیرہ گناہوں کی معافی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

علم کے حصول میں لگے رہنے والا جنت میں انبیا سے قریب مقام پائے گا

حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ مرسلاً روایت کرتے ہیں کہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مَنْ جَاءَهُ الْمَوْتُ وَهُوَ يَطْلُبُ الْعِلْمَ لِيُحْيِيَ بِهِ الْإِسْلَامَ، فَبَيْنَهُ وَبَيْنَ النَّبِيِّيْنَ دَرَجَةٌ وَاحِدَةٌ فِي الْجَنَّةِ۔ (سنن الدارمی، حصہ اول، ص:۳۶۸)

ترجمہ: جسے احیاے اسلام کے لیے علم حاصل کرتے کرتے موت آگئی تو اس کے اور انبیاے کرام علیہم السلام کے درمیان جنت میں صرف ایک درجے کا فرق ہوگا۔

اس حدیث کے الفاظ سے پتہ چلتا ہے کہ حصولِ علم اس مقام تک پہنچنے کا ذریعہ اسی صورت میں بنے گا جب کہ اس سے مقصود احیاے اسلام ہو، خلوص پر اس کی بنیاد ہو اور طالبِ علم محض دینِ اسلام کی تبلیغ واشاعت کے لیے حصولِ علم میں مصروف ہو۔ اگر کوئی دنیوی

غرض ہے تو اس کی کوشش ناکام ہے اور وہ بے سود کام میں اپنا وقت ضائع کر رہا ہے۔

پیغمبرِ امن صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طالب علم کا گرمجوشی سے استقبال فرمایا

اسلام کی پہلی درسگاہ مسجدِ نبوی میں لگا کرتی تھی اور اس درسگاہ کے معلم سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تھے۔ متعدد اصحاب نے اس میں داخلہ لے کر فیضِ علم حاصل کیا تھا، ان کو اصحابِ صفّہ کہا جاتا ہے۔

حضرت صفوان بن عَسّال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا، آپ مسجد میں اپنے سرخ رنگ کے تکیے کے ساتھ ٹیک لگائے تشریف فرما تھے۔ میں نے عرض کی:

یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں آپ کی خدمت میں اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ میں یہاں علم حاصل کروں۔ (میرا نام یہاں کے طلبہ میں شامل فرما لیجیے)

آپ نے فرمایا:

مَرْحَبًا بِطَالِبِ الْعِلْمِ اِنَّ طَالِبَ الْعِلْمِ لَتَحُفُّ بِهِ الْمَلَائِكَةُ بِاَجْنِحَتِهَا ثُمَّ يَرْكَبُ بَعْضُهُمْ بَعْضًا حَتّٰى يَعْلُوَ اِلَى السَّمَاءِ۔

(جامع بیان العلم وفضلہ، ج:۱،ص:۱۵۵)

ترجمہ: طالب علم کو خوش آمدید ہے، بے شک طالب علم کی شان یہ ہے کہ رحمت کے فرشتے اسے اپنے پروں سے ڈھانپ لیتے ہیں، پھر ایک دوسرے کے اوپر چڑھتے چلے جاتے ہیں حتی کہ آسمان تک پہنچ جاتے ہیں۔

ان کے علاوہ کثیر احادیث مبارکہ ہیں جن میں طالب علم کے مقام ومرتبے کی وضاحت کی گئی ہے اور طلبِ علم پر ملنے والے اجر وثواب کا ذکر کیا گیا ہے۔

طلبِ علم کا ایسا جذبہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے ماننے والوں کے دلوں میں پیدا فرمایا کہ ایک ایک حدیث سیکھنے کے لیے لوگ میلوں کا سفر طے کرنے کے لیے نکل جایا کرتے تھے۔ آج جو ذخیرۂ علم ہمارے پاس موجود ہے یہ انھی نفوسِ قدسیہ کی قربانیوں کا نتیجہ ہے جنھوں نے طلبِ علم کی اصل مشقتیں برداشت کی ہیں۔ ہمارے سامنے علم بڑی آسان صورت میں موجود ہے، ہماری ذمے داری ہے کہ اس کی قدر کریں اور اسے حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

مظلوم کی امداد کو اہم فریضہ قرار دیا

رحمت اور ظلم میں باہمی تضاد ہے۔ سرورِ کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم رحمت تمام بن کر تشریف لائے تو ظاہر ہے کہ دنیا سے ظلم و جبر کا خاتمہ ہونا ہی تھا۔ آپ نے ظلم کی سخت مذمت فرمائی، ظالم کا انجام بد بیان فرمایا، مظلوم کی خود مدد فرمائی، لوگوں کو ان کی مدد پر اُبھارا اور دنیا سے ظلم کے خاتمے کی ہر ممکن کوشش فرمائی۔

خود قرآن مقدس کی بے شمار آیات میں ظلم و زیادتی، فساد اور امن و امان کو متاثر کرنے والے ہر اقدام کی مذمت کی گئی ہے۔ چند فرامین کے خلاصے درج کیے جاتے ہیں:

- ☆ جس نے کسی ایک جان کا ناحق قتل کیا گویا اس نے ساری انسانیت کا خون کیا۔
- ☆ اللہ ظالموں کو پسند نہیں فرماتا ہے۔
- ☆ اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا ہے۔
- ☆ اللہ کبھی کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں فرماتا۔
- ☆ ظالموں کے لیے بہت برا ٹھکانا ہے۔
- ☆ قیامت کے دن ظالموں کی مدد کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔

☆ ظلماً یتیموں کا مال کھانا ایسا ہے جیسے اپنے پیٹ میں آگ بھرنا۔
☆ ظلم اللہ کے عذاب کو دعوت دیتا ہے۔
☆ ظلم کی وجہ سے بہت سی سہولتیں ختم کر دی جاتی ہیں۔
☆ ظالم کو جہنم میں جلنا ہوگا۔
☆ ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے۔
☆ جو لوگ ظالموں کے ساتھ دوستانہ رکھتے ہیں وہ بھی عذاب کے مستحق ہو سکتے ہیں۔
☆ ظالم کو کبھی کامیابی نہیں ملتی ہے۔
☆ اللہ ظالموں کے کرتوت سے غافل نہیں، انھیں قیامت تک کے لیے مہلت دیتا ہے۔
☆ قیامت کے دن ہر کسی کو اس کے عمل کا بدلہ ملے گا، اس دن ظلم کی کوئی گنجائش نہیں۔
☆ قیامت کے دن ظالموں کا نہ کوئی دوست ہوگا، نہ کوئی سفارشی جس کی بات مانی جائے۔
☆ قیامت کے دن جب ظالموں کے سامنے ان کے اعمال رکھ دیے جائیں گے تو وہ ان کو دیکھ کر سہمے ہوئے ہوں گے۔

ان کے علاوہ کثیر آیاتِ مقدسہ ہیں جن میں ظلم و جبر اور زمین میں فساد مچانے کی سخت مذمت کی گئی ہے۔

سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم رحمتِ تمام بن کر تشریف لائے اور آپ نے دنیا سے ظلم کے خاتمے کی ہر ممکن کوشش کی۔ زبان و بیان سے ظلم کی مذمت فرمائی، اخلاق وکردار سے ظلم کا خاتمہ فرمایا اور ظالموں کے انجام کو جگہ جگہ بیان فرمایا۔ چند احادیث مبارکہ پیش کی جارہی ہیں:

مظلوم کی بددعا سے بچو

جب کوئی شخص اپنے اختیارات کا بے جا استعمال کر کے کسی کے دل کو دکھاتا ہے تو اس شخص کے دل سے نکلنے والی آہیں بڑی تیزی کے ساتھ بابِ اجابت سے ٹکراتی ہیں اور پھر یہ ظالم اپنے انجام کو پہنچ جاتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ جب سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یمن کی طرف بھیجا تو آپ نے انھیں جو نصیحتیں اور ہدایتیں فرمائی تھیں ان میں سے ایک نصیحت یہ بھی تھی:

وَإِيَّاكَ وَدَعْوَةَ الْمَظْلُومِ فَإِنَّهَا لَيْسَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ اللهِ حِجَابٌ۔

ترجمہ: مظلوم کی بددعا سے اپنے آپ کو بچاتے رہنا اس لیے کہ اس بددعا اور اللہ کے بابِ اجابت کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہوتا ہے۔ (شعب الایمان للبیہقی، حصہ اول، ص:۱۸۸)

امن وامان کے قیام کے لیے ظلم کا خاتمہ شرطِ اول ہے اور ظلم کے خاتمے کے لیے ظالم کو یہ احساس دلانا ضروری ہے کہ وہ یہ نہ سمجھے کہ جس پر ظلم کر رہا ہے اس کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہے۔ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس حدیث میں اسی جانب ہمارے ذہن کو مبذول فرمایا کہ مظلوم کی آہوں کو اللہ سنتا ہے اور اس کے دل سے نکلنے والی بددعا بارگاہِ الٰہی میں بہت جلد مستجاب ہو جاتی ہیں۔

مظلوم کی دعا ہرگز رد نہیں کی جاتی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ ابد قرار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ثَلَاثَةٌ لَّا يَرُدُّ اللهُ دُعَاءَهُمْ: الذَّاكِرُونَ اللهَ كَثِيرًا، وَدَعْوَةُ الْمَظْلُومِ، وَالْإِمَامُ الْمُقْسِطُ۔ (شعب الایمان، حصہ دوم، ص:۱۰۴)

ترجمہ: اللہ تبارک وتعالیٰ تین لوگوں کی دعا کبھی رد نہیں فرماتا ہے۔ (۱) جو لوگ اللہ

کا کثرت سے ذکر کرتے ہیں۔(۲) مظلوم۔(۳) انصاف ور امام۔

امام سے مراد یہاں خلیفہ اور بادشاہ ہیں۔اس روایت میں بھی یہی فکر دی گئی ہے کہ کسی پر ظلم کرنے سے پہلے ظالم کو یہ سوچ لینا چاہیے کہ اس کے دل سے نکلنے والی آہوں کو بارگاہِ الٰہی تک پہنچنے سے کوئی روک نہیں سکتا ہے۔

ظالم کو ظلم سے روکا جائے

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں:

قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اُنْصُرْ اَخَاكَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا۔ فَقَالَ رَجُلٌ: يَا رَسُوْلَ اللهِ اَنْصُرُهٗ مَظْلُوْمًا فَكَيْفَ اَنْصُرُهٗ ظَالِمًا؟ قَالَ: تَمْنَعُهٗ مِنَ الظُّلْمِ فَذَاكَ نَصْرُكَ اِيَّاهُ۔ (صحیح البخاری، حصہ نہم، ص:۲۲)

ترجمہ: رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ایک شخص نے کہا: یا رسول اللہ! وہ مظلوم ہو تو اس کی مدد کرنے کی بات سمجھ میں آرہی ہے، ظالم کی مدد کیسے کریں؟ نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: اسے ظلم سے روکو، یہ اس کی مدد ہے۔

یعنی ظلم کی وجہ سے وہ اللہ کے عذاب میں گرفتار ہو سکتا ہے، اسے ظلم سے روک کر اللہ کے عذاب میں گرفتار ہونے سے بچنے میں اس کی مدد کرو۔

ظالم کی مدد کرنا اسلام کے خلاف کام کرنا ہے

مذہبِ اسلام کے پیغمبر وہ ہیں جو خود امن کے داعی ہیں۔اس لیے اس مذہب کا ماننے والا کوئی شخص ظلم کرے یہ اس کی شایانِ شان نہیں ہے۔ظلم کرنا تو درکنار، ظالم کی مدد کرنا بلکہ ظالم کا کسی بھی طرح سے ساتھ دینا سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اسلام کے

خلاف کام قرار دیا ہے۔

حضرت اوس بن شرحبیل سے مروی ہے کہ انھوں نے سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے سنا:

مَنْ مَّشٰى مَعَ ظَالِمٍ لِيُقَوِّيَهٗ وَهُوَ يَعْلَمُ اَنَّهٗ ظَالِمٌ فَقَدْ خَرَجَ مِنَ الْاِسْلَامِ۔ (مشکوٰۃ المصابیح، حصہ سوم، ص: ۱۴۲۰)

ترجمہ: جو شخص کسی ظالم کے ساتھ نکلا تاکہ اسے قوت دے اور وہ جانتا ہے کہ وہ شخص ظالم ہے تو وہ اسلام سے خارج ہو گیا۔

یعنی اس نے اسلام کے احکام کے خلاف کام کیا جو کسی مسلمان کی شایانِ شان نہیں ہے۔ جب ظالم کی مدد کرنے کا یہ انجام ہے تو خود ظلم کرنا کس قدر معیوب کام ہوگا۔

قیامت کے دن ظالم کا حشر کیسا ہوگا؟

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہے؟ لوگوں نے عرض کی: ہم میں مفلس وہ ہے جس کے پاس درہم و دینار اور ساز و سامان نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا: نہیں نہیں مفلس وہ نہیں ہے بلکہ مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن نماز، روزہ، زکوٰۃ اور اس قسم کی دیگر نیکیاں لے کر آئے گا، لیکن اس نے کسی کو گالی دی ہوگی، کسی پر الزام تراشی کی ہوگی، کسی کا مال ناحق کھایا ہوگا، کسی کا ناحق خون بہایا ہوگا، کسی کو ناحق مارا ہوگا تو اس کی نیکیاں اُن لوگوں کو دے دی جائیں گی۔ پھر جب اس کی نیکیاں ختم ہو جائیں گی تو اُن لوگوں کا گناہ اِس پر ڈال دیا جائے گا، پھر اسے جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ (صحیح مسلم، حصہ چہارم، ص: ۱۹۹۷)

اللہ اکبر! دنیا میں کسی شخص نے ڈھیروں نیکیاں کی ہوں لیکن لوگوں کو ناحق ستایا بھی

ہوتو قیامت کے دن اس کی نیکیاں مظلوموں کو دے دی جائیں گی اور پھر جب یہ نیکیوں سے خالی ہو جائے گا تو مظلوموں کے گناہ اس پر لاد دیے جائیں گے اور اسے جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

کوئی ظلم کرے تب بھی ظلم نہ کرو

عموماً انسانوں کا یہی مزاج ہوتا ہے کہ جو ہمارے ساتھ اچھائی کرے گا ہم اس کے ساتھ اچھائی کریں گے اور جو ہمارے ساتھ ظلم کرے گا ہم اس سے ظلم کا بدلہ لیں گے۔ سرورِ کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہ مزاج دیا کہ اگر کوئی ظلم بھی کرے تو صبر کا دامن تھام لیا جائے اور اس کا معاملہ اللہ کے حوالے کر دیا جائے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لَا تَكُونُوا إِمَّعَةً تَقُولُونَ: إِنْ أَحْسَنَ النَّاسُ أَحْسَنَّا وَإِنْ ظَلَمُوا ظَلَمْنَا وَلَكِنْ وَطِّنُوا أَنْفُسَكُمْ إِنْ أَحْسَنَ النَّاسُ أَنْ تُحْسِنُوا وَإِنْ أَسَاءُوا فَلَا تَظْلِمُوا۔ (سنن الترمذی، حصہ چہارم، ص: ۳۶۴)

ترجمہ: لوگوں کی بات سننے والا نہ بنو کہ اگر لوگ احسان کریں گے تو ہم بھی احسان کریں گے اور اگر لوگ ظلم کریں گے تو ہم بھی ظلم کریں گے۔ البتہ اپنے آپ کو اس طرف آمادہ کرو کہ اگر لوگوں نے احسان کیا تو ان کے ساتھ احسان کرو اور اگر لوگوں نے تمھارا برا کیا تو تم ان پر ظلم نہ کرو۔

ظلم سے دنیا کو پاک کرنے اور امن کی چادر دنیا پر پھیلانے کا سب سے عظیم نسخہ یہی ہے۔ کسی نے ہمارے ساتھ برا کیا اور ہم نے اسے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ خاموشی اختیار

کر لی تو ایک نہ ایک دن وہ ضرور شرمندہ ہوگا یا پھر اللہ تبارک وتعالیٰ ایک نہ ایک دن اسے ضرور یہ احساس دلائے گا کہ اس کے ظلم کی وجہ سے اس کا برا انجام ہو رہا ہے۔

بلکہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خود اپنے لیے جو بات پسند فرمائی وہ یہ ہے کہ اگر آپ پر کوئی شخص ظلم کر دے تو آپ اسے معاف کر دیا کرتے تھے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میرے رب نے مجھے نو باتوں کا حکم فرمایا:

(۱) خلوت وجلوت میں اللہ سے ڈرتا رہوں۔

(۲) ہر حالت میں عدل وانصاف کی بات کروں۔

(۳) تنگدستی ہو یا خوشحالی، میانہ روی اختیار کروں۔

(۴) کوئی شخص مجھ سے رشتہ توڑے تب بھی میں اس سے رشتہ جوڑوں۔

(۵) جو مجھے محروم کرے اسے بھی میں عطا کروں۔

(۶) جو مجھ پر ظلم کرے میں اسے معاف کر دوں۔

(۷) جب خاموش رہوں تو فکر (آخرت) میں رہوں۔

(۸) جب بولوں تو اللہ کا ذکر کروں۔

(۹) لوگوں کو نیکیوں کا حکم دوں۔ (مشکوٰۃ المصابیح، حصہ سوم، ص: ۱۴۲۷)

یہ اخلاقِ کریمانہ ہیں جن کے پیکر ہمارے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں۔ ان سب میں دنیا میں امن وسکون کی فضا قائم کرنے کے راز ہائے سربستہ ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ چھٹی بات کہ اگر کوئی ظلم کرے تو بجائے اس کے کہ اس سے بدلہ لیا جائے، اس کو معاف کر دیا جائے۔

ظالموں اور جابروں سے مظلوموں کا حق دلانا حضور ﷺ کی خاصیت تھی

ایک اِراشی آدمی کے ساتھ ابوجہل نے اونٹوں کا سودا کیا تھا، ابوجہل نے اونٹ خرید لیے لیکن ان کی قیمت ادا کرنے میں ٹال مٹول کررہا تھا۔ وہ شخص اس کے پاس بار بار آتا اور وہ اسے لوٹا دیا کرتا تھا۔ تنگ آکر اس نے ایک دن ارادہ کیا کہ اہلِ قریش جہاں محفلیں جمائے بیٹھتے ہیں وہاں ابوجہل کے تعلق سے باتیں بتائے گا، ہوسکتا ہے اسے غیرت آئے اور وہ قیمت ادا کردے۔

اہلِ قریش حرم شریف کے آس پاس مجلسیں جمائے بیٹھے تھے اور حرمِ کعبہ میں سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم عبادت فرما رہے تھے۔ جب اس نے قریشیوں سے اپنا ماجرا بیان کیا تو ان لوگوں نے حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ یہی شخص تجھے انصاف دلا سکتے ہیں۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ابوجہل کے ساتھ عداوت ہے، اس بنیاد پر آپ اس سے معذرت کرلیں گے اور پھر ان لوگوں کو ہنسنے کا موقع مل جائے گا۔ وہ شخص حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی پریشانی کا ذکر کیا۔ مصطفی جانِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کہا: چلو میرے ساتھ۔ جب اُن لوگوں نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس اِراشی شخص کو لے کر جارہے ہیں تو ایک آدمی کو ان کے پیچھے بھیجا کہ دیکھنا کیا ہوتا ہے؟

سرورِ کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ابوجہل کے دروازے پر آئے، دروازہ کھٹکھٹایا، اس نے پوچھا: کون ہے؟ آپ نے فرمایا: میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوں، ذرا باہر نکلو۔ وہ باہر نکلا، اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور چہرے کا رنگ فق پڑ چکا تھا۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: اس شخص کا حق اسے دے دو۔ اس نے کہا: جی ہاں! آپ لوگ

یہیں رکو میں ابھی اس کا حق ادا کرتا ہوں۔ وہ گھر کے اندر گیا اور پھر پوری قیمت لا کر اس اراشی شخص کو دے دیا۔ نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس شخص سے کہا: ٹھیک ہے اب تم جا سکتے ہو۔ وہ شخص اہلِ قریش کی مجلس میں آیا اور کہنے لگا: اللہ اس شخص (حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کو جزائے خیر دے کہ انھوں نے مجھے میرا حق دلا دیا۔

جس شخص کو ان لوگوں نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے بھیجا تھا وہ بھی واپس آیا اور اس نے پوری داستان بیان کی۔ اسی دوران ابوجہل بھی وہاں پہنچ گیا۔ لوگوں نے اس سے کہا: تیری خرابی ہو، تو نے یہ کیا کیا؟ اس کے جواب میں ابوجہل نے ان سے کہا:

وَيحَكُمْ وَاللهِ اِنْ هُوَ اِلَّا اَنْ ضَرَبَ الْبَابَ وَسَمِعْتُ صَوْتَهٗ فَمُلِئْتُ مِنْهُ رُعْبًا فَخَرَجْتُ اِلَيْهِ وَاِنَّ فَوْقَ رَاْسِهٖ لَفَحْلًا مِنَ الْاِبِلِ مَا رَاَيْتُ مِثْلَ هَامَتِهٖ وَلَا قَصَرَتِهٖ وَلَا اَنْيَابِهٖ لِفَحْلٍ قَطُّ وَاللهِ لَوْ اَبَيْتُ لَاَكَلَنِيْ۔

ترجمہ: تم لوگوں کی خرابی ہو، جب انھوں نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا تو اس کی آواز سن کر میں بہت ہی مرعوب ہو گیا۔ جب میں نے نکل کر دیکھا تو ان کے سر پر ایک اونٹ ہے کہ جس کے جیسی گردن، کھوپڑی اور دانت میں نے کسی اونٹ کے نہیں دیکھے۔ خدا کی قسم! اگر میں انکار کرتا تو وہ اونٹ ضرور مجھے کھا جاتا۔ (دلائل النبوۃ، حصہ اول، ص: ۲۱۰)

اس واقعے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پیغمبرِ امن صلی اللہ علیہ وسلم کو مظلوموں کے سلسلے میں کس قدر زیادہ فکر ہوتی تھی۔ مکے کے اُس دور میں جب آپ اپنے ساتھ کیے جانے والے مظالم کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھتے تھے، مظلوموں کا حق ظالموں سے دلانے کے لیے ہمیشہ کمر بستہ رہتے۔

رسول رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مریضوں پر خاص توجہ فرمائی

کوئی شخص بیمار ہو جائے تو اس کی تکلیف تو اسی کو ہوتی ہے، کوئی شخص اس کی تکلیف کو اپنے ذمے لے نہیں سکتا لیکن کسی مریض کی عیادت کرنے، اس کے ساتھ چند میٹھی باتیں کر لینے، اس کو تسلی دینے اور اس کے لیے صحت وعافیت کی دعا کر دینے سے اس کے دل کو تسلی ضرور ملتی ہے جس کا اس کی صحت پر گہرا اثر پڑتا ہے۔

سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مریضوں کی عیادت کا حکم فرمایا ہے، تاکید فرمائی ہے اور خود بھی اس کارِ خیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔

بیماروں کو اسلامی عبادتوں میں سہولت اور آسانی دی گئی ہے۔ قرآنِ مقدس کی متعدد آیتوں اور متعدد احادیث مبارکہ میں ان آسانیوں کا ذکر ہے۔

مریض کو وضو کرنے میں تکلیف ہو تو تیمم کر کے نماز پڑھ سکتا ہے

نماز کسی حالت میں معاف نہیں ہے لیکن یہ بیماروں پر غایتِ کرم ہے کہ اگر انھیں انھیں وضو یا غسل کرنے میں تکلیف بڑھنے کا اندیشہ ہو تو ان کے لیے پانی استعمال نہ کرتے ہوئے تیمم کرنے کی گنجائش ہے۔ فرمانِ قرآن ہے:

وَإِنْ كُنْتُمْ مَّرْضَىٰٓ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ أَوْ جَآءَ أَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ أَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَأَيْدِيْكُمْ۔ (سورۂ نساء، آیت: ۴۳)

ترجمہ: اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں یا تم میں سے کوئی قضاے حاجت سے آیا یا تم نے عورتوں کو چھوا اور پانی نہ پایا تو پاک مٹی سے تیمم کرو تو اپنے منہ اور ہاتھوں کا مسح کرو۔

واضح رہے کہ بیماری میں تیمم کی اجازت اس وقت ہے جب پانی سے ضرر ہو۔

جہاد فرض بھی ہو تب بھی مریضوں کے لیے رخصت ہے

فرمانِ قرآن ہے:

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ۔ (سورۂ توبہ، آیت:۹۱)

ترجمہ: ضعیفوں پر کچھ حرج نہیں اور نہ بیماروں پر اور نہ ان پر جنھیں خرچ کا مقدور نہ ہو جب کہ اللہ و رسول کے خیر خواہ رہیں۔ (کنزالایمان)

اس لیے کہ جس کے اندر جس کام کی طاقت ہے اسی کو اس کام کا مکلّف بنایا گیا ہے، جس کو کسی کام کی طاقت نہیں اس کو اس کام میں رخصت مل جاتی ہے۔ مریض کے لیے جہاد میں جانا اور دشمنوں سے مقابلہ کرنا دشوار کام ہے اس لیے اسے رخصت دی گئی ہے۔

بیمار رمضان کے روزوں کو مؤخر کر سکتے ہیں

اگر کوئی شخص اس قدر بیمار ہے کہ روزہ رکھنے سے اس کی بیماری کے بڑھ جانے کا قوی اندیشہ ہے تو اس کے لیے جائز ہے کہ روزے کو ماہِ رمضان میں نہ رکھتے ہوئے جب صحت حاصل ہو جائے تو بعد میں رکھ لے۔ ارشادِ قرآن ہے:

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ۔

(سورۂ بقرہ، آیت: ۱۸۴)

ترجمہ: تو تم میں جو کوئی بیمار یا سفر میں ہو تو اتنے روزے اور دنوں میں۔

بیماریاں گناہوں کا کفارہ ہوتی ہیں

مسلمان کو کسی بھی طرح سے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ تکلیف پہنچنا اس کے گناہوں کا کفارہ ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص بیمار ہو جائے تو اس پر جزع و فزع نہ کرے بلکہ صبر کرے اس لیے کہ اس کی وہ تکلیف اس کے گناہوں کا کفارہ بن رہی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آقائے کون ومکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَا يُصِيبُ الْمُسْلِمَ مِنْ نَّصَبٍ وَّلَا وَصَبٍ وَّلَا هَمٍّ وَّلَا حُزْنٍ وَّلَا اَذًى وَّلَا غَمٍّ حَتَّى الشَّوْكَةُ يُشَاكُهَا اِلَّا كَفَّرَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ خَطَايَاهُ۔

(صحیح البخاری، حصہ ہفتم، ص: ۱۱۴)

ترجمہ: مسلمان کو جو بھی تھکان، بیماری، رنج وغم، تکلیف یا پریشانی پہنچتی ہے، یہاں تک کہ اسے ایک کانٹا بھی چبھ جاتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے عوض اس کے گناہ مٹاتا ہے۔

اس حدیث میں اور اس طرح کی جس حدیث میں بھی کسی نیک عمل کے بدلے میں گناہوں کے مٹنے کا ذکر ہے اس سے مراد صغیرہ گناہ ہیں۔ یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ صغیرہ گناہوں کو مٹاتا ہے۔ کبیرہ گناہ توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوتے اور اگر وہ کبائر کسی کے حقوق سے متعلق ہیں تو جب تک حقوق ادا نہ کر دیے جائیں یا صاحبِ حق سے معاف نہ کرا لیے جائیں تب تک معاف نہیں ہوں گے۔

بیمار کے لیے معمولات کے برابر نیکیاں

اگر کسی شخص کے معمولات میں سے ہے کہ وہ نوافل، تلاوتِ قرآن، ذکر واذکار وغیرہ میں مصروف رہا کرتا تھا، اب بیمار ہونے کی وجہ سے وہ شخص ان معمولات کی تکمیل نہیں کر پا رہا ہے تب بھی اسے ان کے کرنے کا ثواب ملتا رہے گا۔

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ سرکارِ ابد قرار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اِذَا مَرِضَ الْعَبْدُ، اَوْ سَافَرَ، كُتِبَ لَهُ مِثْلُ مَا كَانَ يَعْمَلُ

مُقِيمًا صَحِيحًا۔ (صحیح البخاری، حصہ چہارم، ص: ۵۷)

ترجمہ: جب کوئی بندہ بیمار ہو جاتا ہے یا سفر میں نکل جاتا ہے تو اس کے لیے اسی قدر ثواب لکھا جاتا ہے جو وہ اقامت اور صحت کی حالت میں کرتا تھا۔

یہ مریضوں اور مسافروں پر مولائے کریم کا غایتِ کرم ہے کہ مرض یا سفر کی وجہ سے اگر روزانہ کی عبادات ونوافل کے ادا کرنے میں دشواری ہے تب بھی معمولات کی پابندی کی بنیاد پر ثواب میں کمی نہیں ہوگی بلکہ ثواب لکھا جاتا رہے گا۔

بیمار کی عیادت مسلمانوں کا حق ہے

کوئی شخص بیمار ہو جائے تو اس کی عیادت کے لیے جانا ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آقائے نعمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

حَقُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ خَمْسٌ: رَدُّ السَّلَامِ وَعِيَادَةُ الْمَرِيْضِ وَاتِّبَاعُ الْجَنَائِزِ وَإِجَابَةُ الدَّعْوَةِ وَتَشْمِيْتُ الْعَاطِسِ۔ (صحیح البخاری، حصہ دوم، ص: ۷۱)

ترجمہ: ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر پانچ حقوق ہیں۔ (۱) سلام کا جواب دینا۔ (۲) مریض کی عیادت کرنا۔ (۳) جنازے میں شرکت کرنا۔ (۴) دعوت قبول کرنا۔ (۵) چھینک کا جواب دینا۔

لیکن عیادت کے لیے جو شخص جا رہا ہے اسے اس بات کا خیال کرنا ضروری ہے کہ اس کی عیادت مریض کے لیے تسلی کا باعث بنے، اس کے دل برداشتہ ہونے کا سبب نہ بنے۔ اسی لیے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے عیادت کے لیے بھی آداب بیان فرمائے ہیں۔

یہ عیادت دنیا میں اس مریض کے لیے تسلی کا سامان بنے گی تو آخرت میں اللہ تعالیٰ

اس عیادت کرنے والے پر جنت کے پھل نچھاور فرمائے گا۔

فرمانِ رسول ہے: إِنَّ الْمُسْلِمَ إِذَا عَادَ أَخَاهُ الْمُسْلِمَ لَمْ يَزَلْ فِي خُرْفَةِ الْجَنَّةِ حَتَّى يَرْجِعَ۔ (صحیح مسلم، حصہ چہارم، ص:۱۹۸۹)

ترجمہ: مسلمان جب اپنے مسلمان بھائی کی عیادت کرتا ہے تو وہ جنت کے پھل کھانے میں مصروف ہوتا ہے یہاں تک کہ واپس لوٹ آئے۔

خلاصہ یہ کہ مریض کی عیادت مسلمانوں پر اس کا حق ہے، لہٰذا مسلمانوں پر عیادت کرنا واجب ہے اور اگر مریض سے قرابت یا ہمسایگی ہو تو عیادت اور زیادہ ضروری ہو جاتی ہے۔ عیادت مریض کے حال کے مطابق ہونی چاہیے۔ کبھی حالات کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ بار بار عیادت کے لیے آتا رہے۔ جو شخص مریض کی عیادت کرے، اس کے لیے سنت طریقہ یہ ہے کہ وہ اس کا حال پوچھے، اس کے لیے دعا کرے اور اسے صحت و عافیت کی اُمید دلائے۔ کیونکہ یہ صحت اور شفا کے بڑے اسباب میں سے ایک سبب ہے۔

پیغمبرِ رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میت کے حقوق و فرائض متعین کیے

اسلام وہ واحد مذہب ہے جس میں ہر جان دار اور غیر جان دار کے حقوق متعین فرمائے گئے ہیں بالخصوص انسان جو اشرف المخلوقات ہے، اس کے حقوق نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ پیغمبر اسلام نے زندوں کے حقوق کے ساتھ ساتھ مرنے والوں کے حقوق بھی متعین فرمائے ہیں، اس تعلق سے آپ کی تعلیمات ملاحظہ کیجیے:

مرنے والے کی امن کے ساتھ رحلت کے لیے کلمۂ طیبہ کی تلقین

مرنے والا کلمہ پڑھ کر مرے تو کلمۂ طیبہ کے فضائل کے مطابق اسے قیامت کے

دن سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شفاعت نصیب ہوگی اور جنت میں داخل ہوگا۔اسی لیے جو شخص نزع کی حالت میں ہو سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مسلمانوں پر اس شخص کا یہ حق قرار دیا کہ مرتے وقت اسے کلمے کی تلقین کریں۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ آقاے رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لَقِّنُوْا مَوْتَاكُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ (صحیح مسلم، حصہ دوم، ص:۶۳۱)

ترجمہ: مرنے والے کو کلمۂ طیبہ کی تلقین کیا کرو۔

جاں کنی کی حالت میں جب تک روح گلے کو نہ آئی اسے تلقین کریں، یعنی اس کے پاس بلند آواز سے پڑھیں اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ، مگر اسے اس کے کہنے کا حکم نہ کریں۔ جب اس نے کلمہ پڑھ لیا تو تلقین موقوف کر دیں، ہاں اگر کلمہ پڑھنے کے بعد اس نے کوئی بات کی تو پھر تلقین کریں کہ اس کا آخر کلام لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ہو۔ تلقین کرنے والا کوئی نیک شخص ہو۔ (بہار شریعت، حصہ چہارم، ص:۸۰۸)

تلقین کا حکم اسی لیے دیا گیا ہے تا کہ میت کا آخرِ کلام کلمۂ طیبہ ہو۔ جس شخص کا آخر کلام کلمۂ طیبہ ہو اس کے تعلق سے حدیث پاک میں فضیلت مروی ہے۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مَنْ كَانَ اٰخِرُ كَلَامِهٖ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ۔

(سنن ابی داؤد، حصہ سوم، ص:۱۹۰)

ترجمہ: جس کی آخری بات کلمۂ طیبہ ہو وہ جنت میں داخل ہوگا۔

میت کے پاس سورۂ یٰسین پڑھا جائے

قرآن مقدس کی جہاں تلاوت ہو وہ نزولِ رحمت کی جگہ بن جاتی ہے۔ خصوصیت

کے ساتھ سورۂ یٰسین شریف کا پڑھنا بے شمار فضیلتوں کا باعث ہے۔ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اسے قرآن کا دل قرار دیا اور اس کی ایک بار تلاوت کو دس مرتبہ ختمِ قرآن کے برابر قرار دیا۔

جس جگہ پر کوئی شخص جاں کنی کے عالم میں ہو سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس جگہ پر سورۂ یٰسین شریف کی تلاوت کا حکم فرمایا تاکہ وہاں رحمتوں کا نزول ہو اور یہ مرنے والا امن وامان کے ساتھ دنیا سے جائے۔

حضرت معقِل بن یسار رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اِقْرَءُوْا یٰسٓ عَلٰی مَوْتَاکُمْ۔ (سنن ابی داؤد، حصہ سوم، ص:۱۹۱)

ترجمہ: اپنے مُردوں پر سورۂ یٰسین پڑھا کرو۔

یہ کام وہاں موجود مسلمانوں سے ہی ہوسکتا ہے اس لیے اس کا التزام کرنا مسلمانوں کی ذمے داری ہے۔ اس لیے وہاں موجود لوگوں کو چاہیے کہ اس بات کی طرف توجہ دیں تاکہ مرنے والے کے لیے باعثِ رحمت بنے۔

موت کی خبر ملنے پر ''اِنَّا لِلّٰہِ'' پڑھا جائے

جس کسی مسلمان کی موت کی خبر ملے تو انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھنا چاہیے اس سے اس مرنے والے اور اس کے گھر والوں کے ساتھ جہاں ہمدردی کا اظہار ہے اسی کے ساتھ ساتھ خود پڑھنے والے کا بھی اجر وثواب میں حصہ ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اِنَّ لِلْمَوْتِ فَزَعًا فَاِذَا اَتٰی اَحَدَکُمْ وَفَاۃُ اَخِیْہِ فَلْیَقُلْ: اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ

اِلَيْهِ رَاجِعُونَ وَ اِنَّا اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُونَ، اَللّٰهُمَّ اكْتُبْهُ فِي الْمُحْسِنِيْنَ وَاجْعَلْ كِتَابَهٗ فِيْ عِلِّيِّيْنَ وَاخْلُفْ عَقِبَهٗ فِي الْاٰخِرِيْنَ، اَللّٰهُمَّ لَا تَحْرِمْنَا اَجْرَهٗ وَلَا تَفْتِنَّا بَعْدَهٗ۔ (المعجم الکبیر للطبرانی، حصہ دوازدہم، ص:۵۹)

ترجمہ: بے شک موت بڑی خوف ناک چیز ہے تو جب کسی کے پاس اس کے بھائی کی وفات کی خبر پہنچے تو کہے: بے شک ہم اللہ کے ہیں اور بے شک ہمیں اسی کی طرف لوٹنا ہے، ہم اپنے رب کی طرف پلٹنے والے ہیں۔ اے اللہ! اسے نیکوکاروں میں لکھ دے، اس کا نامۂ اعمال علیین میں کر دے اور اس کے بعد والوں میں اس کا جانشیں بنا دے۔ اے اللہ! ہمیں اس کے اجر سے محروم نہ کر اور ہمیں اس کے بعد آزمائش میں مت ڈال۔

اس کا فائدہ کیا حاصل ہوگا اس تعلق سے حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مَنِ اسْتَرْجَعَ عِنْدَ الْمُصِيْبَةِ جَبَرَ اللّٰهُ مُصِيبَتَهٗ وَاَحْسَنَ عُقْبَاهُ وَجَعَلَ لَهٗ خَلَفًا صَالِحًا يَرْضَاهُ۔ (المعجم الکبیر للطبرانی، حصہ دوازدہم، ص:۲۵۵)

ترجمہ: جو شخص مصیبت کے وقت "اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ" پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی مصیبت دور کرتا ہے، اس کا انجام بہتر کرتا ہے اور اس کے بعد اسے ایسی چیز عطا فرماتا ہے جس سے یہ راضی ہو۔

میت کی فقط خوبیاں بیان کی جائیں

سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مرنے والے کی نیکیوں کے ذکر کرنے کا حکم دیا اور اگر خوانخواستہ وہ کسی گناہ کا مرتکب تھا تو اس کے گناہوں اور برائیوں کے بیان کرنے سے اپنی زبان کو روکنے کا حکم فرمایا۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اُذْکُرُوْا مَحَاسِنَ مَوْتَاکُمْ وَکُفُّوْا عَنْ مَسَاوِیْھِمْ۔
(سنن ابوداؤد، حصہ چہارم، ص: ۲۷۵)

ترجمہ: اپنے مُردوں کی خوبیاں بیان کیا کرو اور ان کی برائیوں سے اپنی زبان کو بند رکھا کرو۔

اس کا فائدہ یہ حاصل ہوگا کہ یہ خوبیاں بیان کرنا اس کی بخشش اور نجات کا ذریعہ بن سکتا ہے، ساتھ ہی مرنے والے کی برائیاں بیان کرنے سے لڑائی جھگڑے کی نوبت آسکتی ہے اور جس کی برائی بیان کی جارہی ہے اس کی اصلاح کا راستہ بند ہو چکا ہے اسی لیے آقاے رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے مردے کی برائیوں کو بیان کرنے سے منع فرمایا ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مَا مِنْ مُسْلِمٍ یَمُوْتُ فَیَشْھَدُ لَہٗ اَرْبَعَۃُ اَھْلِ اَبْیَاتٍ مِنْ جِیْرَتِہٖ الْاَدْنَیْنَ اَنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ اِلَّا خَیْرًا اِلَّا قَالَ اللہُ جَلَّ وَ عَلَا قَدْ قَبِلْتُ عِلْمَکُمْ فِیْہِ وَغَفَرْتُ لَہٗ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔ (صحیح ابن حبان، حصہ ہفتم، ص: ۲۹۵)

ترجمہ: جب کسی مسلمان کا انتقال ہو جائے اور اس کے چار قریبی پڑوسی اس کے بارے میں کہیں کہ ہم تو اس کے بارے میں صرف بھلائی جانتے ہیں تو اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے: تم جو جانتے ہو میں نے اس کے بارے میں اس کی گواہی قبول کر لی اور جو تم نہیں جانتے میں نے اس کی وہ باتیں معاف کر دیں۔

کسی کا انتقال ہو گیا اور اس کے اندر خدانخواستہ کوئی برائی یا قباحت تھی تو انھیں ذکر کرنے سے آقاے کون ومکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لَا تَسُبُّوا الْاَمْوَاتَ فَاِنَّهُمْ قَدْ اَفْضَوْا اِلٰی مَا قَدَّمُوْا۔ (صحیح البخاری، حصہ دوم، ص: ۱۰۴)

ترجمہ: مرنے والوں کو برے الفاظ میں نہ یاد کرو اس لیے کہ انھیں جہاں پہنچنا تھا وہ پہنچ چکے ہیں۔

جنازے میں شرکت مسلمانوں کی ذمے داری ہے

کسی مسلمان کا انتقال ہو جائے تو اس کے کفن دفن، اس کی نماز جنازہ اور تجہیز وتکفین میں شریک رہنا چاہیے۔ حدیث پاک میں اس کو ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق قرر دیا گیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لِلْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ سِتَّةٌ بِالْمَعْرُوفِ: يُسَلِّمُ عَلَيْهِ إِذَا لَقِيَهُ، وَيُجِيبُهُ إِذَا دَعَاهُ، وَيُشَمِّتُهُ إِذَا عَطَسَ، وَيَعُودُهُ إِذَا مَرِضَ، وَيَتْبَعُ جِنَازَتَهُ إِذَا مَاتَ، وَيُحِبُّ لَهُ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ۔ (سنن ابن ماجہ، حصہ اول، ص: ۴۶۱)

ترجمہ: ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چھ حقوق ہیں۔ (۱) جب اس سے ملاقات ہو تو سلام کرے۔ (۲) جب دعوت دے تو قبول کرے۔ (۳) چھینکے تو جواب دے۔ (۴) بیمار ہو تو مزاج پرسی کرے۔ (۵) جب اس کا انتقال ہو تو اس کے جنازے میں شرکت کرے۔ (۶) جو چیز اپنے لیے پسند کرتا ہے وہ اس کے لیے بھی پسند کرے۔

ان چھ حقوق میں سے ایک حق یہ بھی ہے کہ کسی مسلمان کا انتقال ہو جائے تو اس کے جنازے میں شرکت کی جائے۔

میت کو غسل، کفن اور کاندھا دینے والے کے گناہ دھل جاتے ہیں

کسی کے انتقال کے بعد سے لے کر اس کے دفن ہونے تک اس کے کفن دفن میں شریک رہنا اور اس کے دفن ہونے کے بعد اس کے لیے ایصالِ ثواب کا اہتمام کرنا میت کے لیے بہت سود مند ہے۔ اسی لیے ان کاموں کو سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق قرار دیا اور جو شخص ان کاموں میں حصہ لیتا ہے اس کے لیے سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بڑے اجر وثواب کا وعدہ فرمایا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آقائے کون ومکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مَنْ غَسَّلَ مَيِّتًا وَ كَفَّنَهُ وَحَنَّطَهُ وَحَمَلَهُ وَصَلّٰى عَلَيْهِ وَلَمْ يُفْشِ عَلَيْهِ مَا رَاٰى خَرَجَ مِنْ خَطِيْئَتِهٖ مِثْلَ يَوْمِ وَلَدَتْهُ اُمُّهٗ۔

(سنن ابن ماجہ، حصہ اول، ص: ۴۶۹)

ترجمہ: جس نے میت کو غسل دیا، اسے کفن دیا، اس کو خوشبو لگائی، اسے اٹھایا، اس کی نماز جنازہ پڑھی اور اس کی جو راز کی باتیں دیکھیں انھیں کسی پر ظاہر نہیں کیا، وہ گناہوں سے ایسے پاک ہو جائے گا جیسے آج ہی اسے اس کی ماں نے جنا ہے۔

راز کی بات سے مراد یہ ہے کہ کفن دفن کے دوران کوئی ایسی بات دیکھی جسے بیان کرنے سے میت کا وقار مجروح ہوگا تو ان باتوں کو چھپانا ضروری ہے۔ اگر کوئی ایسی بات دیکھی جن کے بیان کرنے سے میت کا وقار بڑھے گا تو ان باتوں کو بیان کرنا چاہیے۔

جنازے کی تعظیم کی جائے

مسلم کا جنازہ قابلِ تعظیم ہے اس لیے جہاں سے جنازہ گزرے اگر وہاں پر لوگ

بیٹھے ہوں تو انھیں حکم ہے کہ کھڑے ہو جائیں اور جب تک جنازہ وہاں سے گزر نہ جائے تب تک کھڑے رہیں۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اِذَا رَاَیْتُمُ الْجِنَازَۃَ فَقُوْمُوْا فَمَنْ تَبِعَھَا فَلَا یَقْعُدْ حَتّٰی تُوْضَعَ۔ (صحیح البخاری، حصہ دوم، ص: ۸۵)

ترجمہ: جب تم جنازے کو دیکھو تو کھڑے ہو جاؤ، تو جو اس کے پیچھا گیا تو اس وقت تک نہ بیٹھے جب تک کہ جنازہ رکھ نہ دیا جائے۔

اس حدیث میں دو باتوں کا حکم فرمایا گیا۔ ایک یہ کہ جس کے سامنے سے جنازہ گزرے اسے چاہیے کہ کھڑا ہو جائے اور دوسری بات یہ کہ جو شخص جنازے کے ساتھ چل رہا ہے وہ اس وقت تک نہ بیٹھے جب تک کہ جنازہ رکھ نہ دیا جائے۔

یہ خاصیت ہے کہ رحمتِ تمام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لائے ہوئے نظام کی کہ اس میں ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک، چھوٹے سے لے کر بڑے تک، زندے سے لے کر مردے تک ہر کسی کے لیے حقوق متعین کیے گئے ہیں۔ حقوق بھی کیسے کہ ہر دہر اور زمانے میں جامع اور ہر ملک و خطۂ ارض کے لیے مساوی۔

حقوق کا ایسا نظام سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بنایا، قائم فرمایا اور اس کی تعلیم فرمائی جس پر عمل پیرا ہونا ہر فردِ بشر کے لیے کامیابی کا منارۂ نور ہے۔ جس دور میں بھی نظامِ مصطفیٰ کی پابندی کی گئی اور ہر صاحبِ حق تک اس کا حق پہنچایا گیا اس دور میں غریبی، مفلسی، لڑائی، جھگڑا، ظلم، حق تلفی اور اس طرح کے سارے ناسوروں کا خاتمہ ہو گیا۔

آج بھی ضرورت ہے کہ ہم سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعلیمات کو

سمجھیں، ان کی جامعیت اور معنویت کے تعلق سے غور کریں، ان کی عظمتوں کو اپنے دلوں میں بٹھائیں اور ان پر عمل پیرا ہو کر جنت کی طرف کشاں کشاں چل دیں۔

آٹھواں باب

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عام انسانی حقوق متعین فرما کر عالمی امن وسکون کا انتظام فرمایا اور عالم کو عدل سے بھر دیا

آج ہر طرف انسانی حقوق کا چرچا ہے اور حقوقِ انسانی کا موضوع ہر شخص کی زبان کا وِرد، وقت کی آواز اور عالمی دلچسپی اور توجہ کا مرکز بن گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ملکی اور بین الاقوامی سطح پر انسانی حقوق کے نام پر بڑی بڑی کانفرنسیں منعقد ہوتی ہیں، اور قراردادیں

پاس ہو رہی ہیں، حتّٰی کہ حقوقِ انسانی کا نفاذ اس امر کو جانچنے کا معیار سمجھا جانے لگا ہے کہ ایک حکومت کس حد تک عدل وانصاف کے اُصولوں کا التزام کرتی ہے اور اپنے باشندوں کے حقوق کی حفاظت اور ان کی آزادی کا پاس رکھتی ہے۔

اگر سوال کیا جائے کہ کیا دنیا حقوقِ انسانی متعین کرنے اور ہر فردِ انسان کو اس کا حق پہنچانے میں کامیاب ہے تو جواب نفی میں ہوگا۔ اس لیے کہ نظام بنانے والے لوگ کسی نہ کسی طور پر عصبیت کے شکار ہیں اور جہاں کہیں عصبیت ہوگی وہاں حقوق کی رعایت میں عدل وانصاف ضرور ناپید ہوگا۔

اب تک انسانی حقوق کے تعلق سے جس نے سب سے جامع قوانین کی تشکیل دی ہے وہ ذات سرورِ کائنات انیسِ بےکساں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ہے۔ آپ دنیا میں امن وامان کی بحالی کے لیے تشریف لائے تھے اس لیے آپ نے اپنے نظام میں امن کو غارت کرنے والے ہر کام پر پابندی لگائی اور ہر صاحبِ حق کو اس کا حق دلایا۔

دنیا کا امن بحال کرنے کے لیے عام انسانی حقوق کا نفاذ ضروری تھا اس لیے آقائے نعمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا مرتب کردہ قانون ہر طبقے کے انسان تک اس کے حقوق پہنچانے میں انتہائی مؤثر ہے۔ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا مرتب کردہ قانون دنیا کا وہ واحد قانون ہے جس نے بلا امتیاز رنگ ونسل سب کے حقوق برابر برابر متعین فرمائے۔ معاشرے میں پر امن زندگی گزارنے کے لیے جان، عزت وآبرو، مال واولاد، روزگار، عقیدے اور مذہب کا تحفظ بنیادی ضرورتوں میں سے ہے۔ عصبیت پسند قوموں کے بنائے ہوئے قانون میں ان بنیادی ضرورتوں میں کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی طور پر حق تلفی ضرور پائی جاتی ہے۔ مگر سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لائے ہوئے قانون میں کسی طور پر بھی کسی کی

حق تلفی نہیں ہے۔

پیغمبر امن صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے انسانوں کو ان کا مقام ومرتبہ بتایا

اپنی قدر ومنزلت سے واقف ہونا ہر شخص کے لیے ضروری ہوتا ہے اس لیے کہ جو شخص اپنا مقام ومرتبہ جانتا ہے اور اپنی قدر ومنزلت سے واقف ہوتا ہے وہ اس کے خلاف کوئی کام کرنے سے ہمیشہ گریز کرتا ہے۔

سرورِ کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی جلوہ گری سے قبل لوگ اپنے اقدار سے ناواقف تھے، یہی سبب ہے کہ لوگ کفر والحاد، شرک وبت پرستی میں مبتلا تھے، اپنی تخلیق کا نہ تو کوئی مقصد جانتے تھے اور نہ انھیں اپنے حقیقی خالق ومالک کی معرفت ہی حاصل تھی، لوگ صحیح اور غلط میں تمیز کرنے سے قاصر تھے، قبائلی نظام رائج تھا، وہ ہر حال میں اپنے گھر، خاندان اور قبیلے والوں کی مدد کرتے خواہ وہ ظالم ہوں یا مظلوم۔

ہر جگہ طاقتور کمزور پر حاوی تھا، معمولی معمولی بات پر لڑائی کی آگ بھڑک اٹھتی جو برسوں چلتی رہتی، ایک آدمی کے قتل کے بدلے صرف قاتل کو قتل کرنے کے بجائے پورے خاندان اور قبیلے کو تہس نہس کر دیا جاتا، سیکڑوں بے گناہ موت کے گھاٹ اتار دیے جاتے۔ کوئی ایسا سیاسی نظام نہیں تھا جس سے دنیا میں امن وسکون قائم ہو اور بھائی چارگی اور انسانیت پروان چڑھے۔ کوئی ایسا قانون نہیں تھا جس میں مجرموں کو سزا دی جائے، مظلوموں کو ان کا حق دلایا جائے اور ظالم کی گرفت کی جائے۔

ان حالات میں پیغمبرِ امن صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ایک نعمتِ عظمیٰ بن کر دنیا میں بسنے والے انسانوں کے لیے جلوہ گر ہوئے۔ آپ نے لوگوں کو ان کی زندگی کا اصل مقصد بتایا، ان کو ان کے حقیقی خالق ومالک سے آشنا کرایا، انھیں دنیا کے آغاز وانجام سے باخبر کیا اور

سارے انسانوں کو ان کے اقدار سے واقف کرا کے یہ اعلان کر دیا:

اَلَا كُلُّكُمْ رَاعٍ وَّ كُلُّكُمْ مَّسْؤُوْلٌ عَنْ رَّعِيَّتِهٖ۔ (صحیح البخاری، حصہ:۲، ص:۵)

ترجمہ: آگاہ ہو جاؤ، تم میں سے ہر کوئی ذمے دار ہے اور ہر کسی سے اس کی ذمے داری کے بارے میں باز پرس ہونی ہے۔

انسانوں کو زمین میں خلیفہ بنایا گیا

جو افراد یا قومیں کسی اعتبار سے برتر تھیں وہ یہ سمجھتی تھیں کہ یہ ان کا ذاتی حق ہے اور اس کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ اپنے سے کم درجے والوں کو ذلیل سمجھتی تھیں اور انھیں اپنے ظلم وستم کا شکار بناتی تھیں۔ نتیجے میں زمین میں ظلم وزیادتی کا رواج بڑھتا جاتا تھا اور امن وسکون کا خاتمہ ہوتا چلا جاتا تھا۔

مظلوم طبقہ یہ سمجھتا تھا کہ ان کا یہی مقدر ہے کہ وہ ظلم وستم برداشت کریں، ان کا یہی حق ہے کہ مظلومی کی زندگی گزاریں۔ سرورِ کائنات محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دونوں کے اذہان سے یہ تصور ختم فرمایا اور قرآنِ مقدس کی آیۂ مقدسہ سنائی:

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ ؕ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ۔

(سورۂ انعام، آیت:۱۶۵)

ترجمہ: اور وہی ہے جس نے زمین میں تمھیں نائب کیا اور تم میں ایک کو دوسرے پر درجوں بلندی دی کہ تمھیں آزمائے اس چیز میں جو تمھیں عطا کی۔ بے شک تمھارے رب کو عذاب کرتے دیر نہیں لگتی۔ (کنز الایمان)

اس میں ہر طبقۂ انسانی کو بتا دیا گیا کہ اسے جو بھی مقام ومرتبہ ملا ہے اور اگر کسی

اعتبار سے کوئی بلندیِ درجہ ملا ہے تو یہ اللہ کا عطا کردہ ہے۔ اس کے نتیجے میں کسی کو حقیر سمجھنا یا ظلم و زیادتی کا بازار گرم کرنا اللہ کے عذاب کو دعوت دے سکتا ہے۔

اس نیابت سے کیا مراد ہے اس کی وضاحت تفسیر ضیاء القرآن میں نہایت نفیس انداز میں کی گئی ہے:

> قدرت کے قانون اٹل اور یکساں ہیں۔ جب تک کوئی قوم اپنی افادیت اور نفع رسانی کا ثبوت بہم پہنچاتی رہتی ہے وہ زندہ اور سلامت رہتی ہے اور اس کا آفتابِ اقبال درخشاں و تاباں رہتا ہے۔ لیکن جب وہ اپنے اقتدار اور طاقت کو لذت کوشی اور عیش طلبی کے لیے وقف کر دیتی ہے اور اپنی ذمے داریوں کو بجالانے میں غفلت برتتی ہے تو سمجھ لو کہ اس کی موت کی گھڑی آ پہنچی۔ اسے راہ سے ہٹا دیا جاتا ہے اور دوسری قوم کو آگے بڑھا دیا جاتا ہے تاکہ وہ اپنی نوخیز قوتوں اور جوان صلاحیتوں کو بروے کار لا کر علم و فن اور حکمت و دانش کے کارواں کی قیادت سنبھال لے۔ اے مخاطبین! تم بھی ان گزری ہوئی اور بسری ہوئی قوموں کے جانشین ہو۔ قدرت کی نگاہ ہر وقت تمھاری کڑی نگرانی کر رہی ہے۔ اگر تم نے راست بازی اور عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کیا، نیکی کو فروغ دینے اور بدی کا قلع قمع کرنے میں مقدور بھر سعی کی، اپنے مالک و خالق کے سامنے اپنی جبینِ نیاز کو جھکائے رکھا اور نوعِ انسانی کی خدمت میں اپنے وسائل اور اپنی قوتوں کو استعمال کرتے رہے تو تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی اور اگر تم نے بھی اپنے مقصد سے کوتاہی برتی تو یاد رکھو تمھیں بھی ٹھکرا دیا جائے گا۔ (جلد دوم، ص: ۵)

تکریم میں ہر انسان ہم پلہ ہے

انسانی حقوق کے بارے میں سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مرتب کردہ قانون کا تصور بنیادی طور پر بنی نوع انسان کے احترام، وقار اور مساوات پر مبنی ہے۔ انسانوں کو بحیثیت انسان بلا تفریق عزت و کرم سے نوازا گیا ہے۔ فرمانِ قرآن ہے:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا۝ (بنی اسرائیل، آیت: ۷۰)

ترجمہ: اور بے شک ہم نے اولادِ آدم کو عزت دی اور ان کو خشکی اور تری میں سوار کیا اور ان کو ستھری چیزیں روزی دیں اور ان کو اپنی بہت مخلوق سے افضل کیا۔ (کنز الایمان)

اسی طرح خطبۂ حجۃ الوداع کے موقع پر سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جو درسِ مساوات دیا اس کی جامعیت دیکھیں:

اَيُّهَا النَّاسُ اَلَا اِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ، اَلَا وَاِنَّ اَبَاكُمْ وَاحِدٌ، اَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى عَجَمِيٍّ، وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ، وَلَا لِاَسْوَدَ عَلٰى اَحْمَرَ، وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰى اَسْوَدَ اِلَّا بِالتَّقْوٰى۔ (سبل الہدی والرشاد فی سیرۃ خیر العباد، حصہ ہشتم، ص: ۴۸۲)

ترجمہ: اے لوگو! آگاہ ہو جاؤ تمھارا رب ایک ہے۔ آگاہ ہو جاؤ تمھارے والد ایک ہیں۔ کسی عربی کو کسی عجمی پر، کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی کالے کو کسی گورے پر، کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی فضیلت نہیں ہے سوائے تقویٰ کی وجہ سے۔

اس طرح سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تمام قسم کے امتیازات اور ذات پات، نسل، رنگ، جنس، زبان، حسب و نسب اور مال و دولت پر مبنی تعصّبات کو جڑ سے اکھاڑ دیا۔ تاریخ میں پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ تمام انسانوں کو ایک دوسرے کے ہم پلہ قرار دیا گیا، خواہ

وہ امیر ہوں یا غریب، سفید ہوں یا سیاہ، مشرق میں ہوں یا مغرب میں، مرد ہوں یا عورت اور چاہے وہ کسی بھی لسانی یا جغرافیائی علاقے سے تعلق رکھتے ہوں۔ پیغمبر امن صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا یہ خطبہ حقوقِ انسانی کا اولین اور ابدی منشور ہے جو کسی وقتی سیاسی مصلحت یا عارضی مقصد کے حصول کے لیے نہیں بلکہ بنی نوعِ انسان کی فلاح کے لیے تھا، جس دنیا میں وہ رہتے ہیں اس میں عدل وانصاف اور امن وسکون قائم کرنے کے لیے تھا۔

حضور ﷺ نے انسانی حقوق کو اہمیت اور تحفظ دیا

پیغمبرِ امن مصطفیٰ جانِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے تشکیل کردہ معاشرے کی سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ اس میں ہر چھوٹے بڑے کے حقوق کی تعیین ہے۔ ان حقوق کو اہمیت بھی دی گئی ہے اور انھیں تحفظ بھی فراہم کیا گیا ہے۔ قرآنی آیات اور احادیثِ مبارکہ میں بار بار حقوق کی ادائیگی کی تاکید کی گئی اور حق تلفی اور ظلم سے منع کیا گیا، حقوق کی ادائیگی پر مرتب ہونے والے ثواب کا ذکر ہوا اور حق تلفی پر ملنے والا عذاب بیان کیا گیا۔ تیئس سالہ تربیت میں آقائے کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ساری انسانیت کو حق شناس بنا دیا۔

ہر حقدار کا حق ادا کرو

پیغمبر امن صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حقوق کی ادائیگی کی حد درجہ تاکید فرمائی ہے اور ہمیں حکم فرمایا کہ ہے کہ ہر صاحبِ حق کو اس کا حق ادا کریں۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ آقائے رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اِنَّ لِرَبِّكَ عَلَيْكَ حَقًّا، وَلِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا، وَلِاَهْلِكَ عَلَيْكَ حَقًّا، فَاَعْطِ كُلَّ ذِيْ حَقٍّ حَقَّهٗ۔ (صحیح البخاری، حصہ سوم، ص: ۳۸)

ترجمہ: تیرے رب کا تجھ پر حق ہے، تیری ذات کا تجھ پر حق ہے اور تیرے گھر والوں کا تجھ پر حق ہے تو ہر حقدار کو اس کا حق دے۔

یہ حدیث حقوق کے باب میں نہایت جامع ہے۔ اس میں اس بات کا ذکر ہے کہ ہر انسان کے ساتھ حقوق متعلق ہوتے ہیں اسے چاہیے کہ ہر صاحبِ حق کے حقوق کا خیال کرے اور ان کے معاملے میں کوتاہی ہرگز نہ کرے۔

حق تلفی اور زیادتی حرام کر دی گئی

ہر وہ کام جس سے امنِ عالم متاثر ہو سکتا ہے، سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نظام میں وہ منہیات کے زمرے میں آتا ہے۔ انھی میں سے ایک کام کسی پر کسی بھی اعتبار سے زیادتی کرنا ہے کہ اسے بھی حرام قرار دیا گیا۔ فرمانِ قرآن ہے:

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوٰحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ۔ (سورۂ اعراف، آیت: ۳۳)

ترجمہ: تم فرماؤ میرے رب نے تو بے حیائیاں حرام فرمائی ہیں جو ان میں کھلی ہیں اور جو چھپی اور گناہ اور ناحق زیادتی۔ (کنزالایمان)

یہ زیادتی خواہ فردِ واحد پر ہو یا کسی جماعت پر یا کسی طبقے پر، ہر اعتبار سے حرام ہے، ہر وقت حرام ہے، ہر زمانے میں حرام ہے، خواہ کوئی فرد کرے یا کوئی حاکم، کوئی صاحبِ اقتدار کرے یا کوئی بے اقتدار سب کے لیے حرام ہے۔

حق تلفی کرنے والے اور فساد مچانے والے کا انجام

عام حقوق کی رعایت کرنے کی تاکید کی گئی اور باریک سے باریک معاملات جن سے لوگوں کے حقوق متعلق ہیں ان کی بھی رعایت کرنے کا حکم دیا گیا۔ فرمانِ قرآن ہے:

اَوۡفُوا الۡكَيۡلَ وَلَا تَكُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُخۡسِرِيۡنَ○ وَزِنُوۡا بِالۡقِسۡطَاسِ الۡمُسۡتَقِيۡمِ○ وَلَا تَبۡخَسُوا النَّاسَ اَشۡيَآءَهُمۡ وَلَا تَعۡثَوۡا فِى الۡاَرۡضِ مُفۡسِدِيۡنَ○ (سورۂ شعراء، آیت: ۱۸۱ تا ۱۸۳)

ترجمہ: ناپ پورا کرو اور گھٹانے والوں میں نہ ہو اور سیدھی ترازو سے تولو اور لوگوں کی چیزیں کم کر کے نہ دو اور زمین میں فساد پھیلاتے نہ پھرو۔ (کنزالایمان)

ظلم و زیادتی کو حرام قرار دیا گیا اور اس سے روکنے کی ہر ممکن سعی کی گئی تاکہ زمین فساد سے پاک ہو اور امن کا گہوارہ بن جائے۔ اس کے باوجود اگر کوئی ظلم و زیادتی کر کے زمین کو فساد زدہ کرنا چاہے تو اس کا انجام بھی بیان کر دیا گیا:

وَالَّذِيۡنَ يَنۡقُضُوۡنَ عَهۡدَ اللّٰهِ مِنۡۢ بَعۡدِ مِيۡثٰقِهٖ وَيَقۡطَعُوۡنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنۡ يُّوۡصَلَ وَيُفۡسِدُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ‌ ۙ اُولٰۤـئِكَ لَهُمُ اللَّعۡنَةُ وَلَهُمۡ سُوۡۤءُ الدَّارِ○ (سورۂ رعد، آیت: ۲۵)

ترجمہ: اور وہ جو اللہ کا عہد اس کے پکّے ہونے کے بعد توڑتے اور جس کے جوڑنے کو اللہ نے فرمایا اسے قطع کرتے اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں ان کا حصّہ لعنت ہی ہے اور ان کا نصیبہ برا گھر۔ (کنزالایمان)

قیامت کے دن ہر حق تلفی کا سخت حساب ہوگا

اگر کسی نے اپنی قوتِ بازو کی بنیاد پر کسی کی حق تلفی کی ہے اور کسی صورت سے وہ دنیا میں مواخذے سے بچ گیا ہے جس کی بنیاد پر سمجھتا ہے کہ وہ کامیاب ہو گیا ہے تو اسے اپنے ذہن سے یہ خام خیالی نکال دینی چاہیے۔ دنیا میں کوئی شخص لاکھ کسی پر ظلم کر لے قیامت کے دن تو ہر کسی کو ایک ایک ذرے کا حساب دینا ہوگا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس کے ذمے اپنے بھائی کی حق تلفی کا کوئی معاملہ ہو اسے چاہیے کہ یہیں دنیا میں اس سے معافی تلافی کر لے، اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جہاں روپیہ پیسہ نہیں ہوگا۔ اگر اس کے پاس کچھ نیکیاں ہوں گی تو اس کے حق کے اعتبار سے صاحبِ حق کو دے دی جائیں گی ورنہ اس کے گناہ اس پر ڈال دیے جائیں گے۔ (صحیح البخاری، حصہ سوم، ص:۱۲۹)

وہ دن تو ایسا ہوگا کہ ہر کسی کو انصاف دلایا جائے گا، ہر ظالم کو اس کے ظلم کا بدلہ ملے گا اور زمین میں ہر فساد مچانے والا شخص اپنے اعمال کا مزا چکھے گا۔ عدل وانصاف اور حقوق کی ادائیگی کے جلوے اس طرح بھی دکھائے جائیں گے کہ اگر کسی سینگ والی بکری نے بغیر سینگ والی بکری کو دنیا میں مارا ہے تو دونوں کو لایا جائے گا اور بغیر سینگ والی بکری اس سینگ والی بکری سے اپنا بدلہ لے گی اور پھر دونوں کو فنا کر دیا جائے گا۔ بلکہ ایک روایت میں تو یہاں تک ملتا ہے کہ کسی چیونٹی کی وجہ سے کسی چیونٹی کو تکلیف پہنچی ہوگی تو اسے بھی قیامت کے دن زندہ کر کے انصاف دلایا جائے گا پھر فنا کر دیا جائے گا۔ تو انسان جو ان اوامر ونواہی کے مکلف ہیں انھیں بھی ضرور حق تلفی کا بدلہ ملے گا۔

قیامت میں اپنا حق والدین بھی معاف نہیں کریں گے

بچوں کے لیے دنیا میں والدین کس قدر تکلیف برداشت کر لیتے ہیں اس کا اندازہ ہر کسی کو ہے۔ باپ اپنے بچوں کے اخراجات کا انتظام کرنے کے لیے صبح گھر سے نکلتا ہے، دھوپ، برسات، ٹھنڈی ہر طرح کی پریشانیاں برداشت کرتا ہے، کام کرتا ہے، محنت کرتا ہے، ذہنی اور جسمانی تکلیفیں برداشت کرتا ہے۔ ماں نو ماہ تک بچے کو پیٹ میں رکھتی ہے، مصیبت پر مصیبت اور درد پر درد برداشت کرتی ہے، ولادت کے وقت تکلیف جھیلتی ہے، اپنا

خونِ جگر پلا کر غذا فراہم کرتی ہے، ناز ونعم برداشت کرتی ہے۔

لیکن اگر کسی نے والدین کے حقوق ادا نہیں کیے ہیں اور قیامت کے دن جب حقوق کے معاملے میں اس کا حساب لیا جائے گا تو والدین بھی اس پر کچھ رحم نہیں کھائیں گے اور اپنا حق اس سے حاصل کریں گے۔

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے سنا:

اِنَّهٗ يَكُوْنُ لِلْوَالِدَيْنِ عَلٰى وَلَدِهِمَا دَيْنٌ فَاِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ يَتَعَلَّقَانِ بِهٖ، فَيَقُوْلُ: اَنَا وَلَدُكُمَا، فَيَوَدَّانِ، اَوْ يَتَمَنَّيَانِ لَوْ كَانَ اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ۔ (المعجم الکبیر للطبرانی، حصہ دہم، ص:۲۱۹)

ترجمہ: ماں باپ کا بیٹے پر کچھ دین آتا ہوگا، تو قیامت کے دن وہ اس سے مطالبہ کریں گے کہ ہمارا دین دے، وہ کہے گا کہ میں تمھارا بچہ ہوں۔ وہ تمنا کریں گے کہ کاش اور زیادہ ہوتا۔

قیامت کے دن حقوق کی ادائیگی کی یہی صورت ہوگی کہ ایک شخص کی نیکیاں حقوق کے بدلے میں اٹھا کر دوسرے کو دے دی جائیں گی۔ اگر اس کے پاس نیکیاں نہیں ہوں گی تو پھر صاحبِ حق کے گناہ اٹھا کر اس کے کاندھے پر ڈال دیے جائیں گے۔ ایسے میں والدین جو کہ دنیا میں بچوں کے لیے ہر طرح کی مصیبت برداشت کرلیا کرتے تھے، آخرت میں حقوق کی معافی وہ بھی نہیں کریں گے بلکہ ہر ایک کو دوسرے کے حقوق قیامت کے دن ادا ہی کرنے ہوں گے۔

ان آیات وروایت سے یہ بات اچھی طرح عیاں ہوگئی کہ پیغمبر امن صلی اللہ تعالیٰ

علیہ وسلم کے دینِ امن میں حقوق کی رعایت اور ان کی ادائیگی کا خیال اشد ضروری ہے۔ آپ نے حقوق کی ادائیگی کا جو نظام قائم فرمایا اور ان کی پامالی پر جو وعیدیں بیان فرمائیں اس کی وجہ سے حقوق کے معاملے میں بہترین ماحول قائم ہوا۔ ہر کسی کو فکرِ آخرت تھی اس لیے دنیا میں حقوق ادا کر دینے ہی کو ہر کوئی غنیمت سمجھتا تھا۔

نظامِ مصطفی میں انسانی جان و مال کا تحفظ یقینی

کسی بھی سوسائٹی میں زندگی گزارنے کے لیے جان و مال کے تحفظ کی ضمانت اولین شرائط میں سے ہوتی ہے۔ ایک پُرامن معاشرہ وہی کہلائے گا جس میں رہنے والے انسان کو اپنی جان اور اپنے مال کے تعلق سے اطمینان ہو۔ قتل وقتال، رہزنی اور لوٹ مار دورِ جاہلیت کے امتیازات میں سے تھے۔ ایک شخص گھر سے نکلا، واپس لوٹ کر آئے گا یا نہیں اس کی کوئی ضمانت نہیں ہوتی تھی۔ اگر کوئی صاحبِ اثر کسی کے ظلم کا شکار ہوتا تو اس کا قصاص تین کے بدلے میں تیرہ سے لے بھی لیا جاتا لیکن اگر کوئی عام انسان ظلم کا شکار ہوتا تو اسے انصاف دلانے والا کوئی نہ ہوتا۔

سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بلاتفریق مذہب وملت سب کی جان و مال کے تحفظ کو یقینی بنایا اور ایسے معاشرے کی بنیاد رکھی جس سے منسلک ہونے والا ہر شخص اپنے آپ کو پُرامن محسوس کرنے لگا۔

قتلِ ناحق پر سخت پابندی

زندگی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ عظیم نعمت ہے اور کسی بھی معاشرے اور ریاست کی طرف سے فرد کو دیے جانے والے جملہ حقوق زندگی ہی پر منحصر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نظام میں زندگی کے تحفظ کا حق

اساسی نوعیت رکھتا ہے۔

قرآنِ مقدس نے بے شمار مقامات پر انسانی زندگی کی اہمیت اور تقدس کو بیان کیا ہے۔ چند آیتیں ملاحظہ کریں:

(۱) ایک انسان کا قتلِ ناحق ساری انسانیت کے قتل کے برابر ہے اور ایک انسان کی زندگی بچانا ساری انسانیت کو بچانے کے برابر ہے:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ۔ (سورۂ مائدہ، آیت: ۳۲)

ترجمہ: جس نے کوئی جان قتل کی بغیر جان کے بدلے یا زمین میں فساد کیے تو گویا اس نے سب لوگوں کو قتل کیا اور جس نے ایک جان کو جِلا لیا اس نے گویا سب لوگوں کو جِلا لیا۔

(۲) اگر قصاصًا بھی قتل کرنا ہے تو اس کے لیے بھی نظام کی پابندی ضروری ہے اور اس میں بھی ظلم سے اجتناب ضروری ہے:

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ۝

(سورۂ بنی اسرائیل، آیت: ۳۳)

ترجمہ: اور کوئی جان جس کی حرمت اللہ نے رکھی ہے ناحق نہ مارو اور جو ناحق مارا جائے تو بے شک ہم نے اس کے وارث کو قابو دیا ہے تو وہ قتل میں حد سے نہ بڑھے ضرور اس کی مدد ہونی ہے۔ (کنزالایمان)

(۳) تنگ دستی کے خوف سے اولاد کو قتل کرنے سے منع کیا گیا:

وَلَا تَقْتُلُوْۤا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۔

(سورۂ بنی اسرائیل، آیت: ۳۱)

ترجمہ: اور اپنی اولاد کو قتل نہ کرو مفلسی کے ڈر سے ہم تمھیں بھی اور انھیں بھی روزی دیں گے۔ (کنز الایمان)

ان آیات میں دیکھیں کہ جن جن اسباب کی بنیاد پر کسی انسان کو زندگی سے محروم کیا جاتا تھا ان کا ذکر کرتے ہوئے تاکید کی گئی کہ سبب جو بھی ہو کسی انسان کا کوئی حق نہیں بنتا کہ وہ کسی انسان سے جینے کا حق چھین لے۔

اسی طرح احادیث مبارکہ میں بھی انسانی جانوں کی حفاظت کے تعلق سے کئی مقامات پر تاکیدیں موجود ہیں۔ اس کتاب کے متعدد مقامات پر حسبِ مناسبت بہت سی حدیثیں مذکور ہیں اس لیے یہاں صرف ایک حدیث کے ذکر پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لَا يَحِلُّ دَمُ امْرِءٍ مُّسْلِمٍ اِلَّا فِي اِحْدٰى ثَلَاثٍ: رَجُلٌ زَنٰى وَهُوَ مُحْصَنٌ فَرُجِمَ، اَوْ رَجُلٌ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ، اَوْ رَجُلٌ ارْتَدَّ بَعْدَ اِسْلَامِهٖ۔

(سنن ابن ماجہ، حصہ دوم، ص: ۸۴۷)

ترجمہ: کسی مسلمان کا خون صرف تین صورتوں میں جائز ہوتا ہے۔ (۱) کسی نے زنا کیا اور وہ شادی شدہ ہے تو اسے سنگسار کر کے ہلاک کیا جائے گا۔ (۲) کسی شخص نے کسی جان کو ناحق قتل کر دیا تو اسے بطورِ قصاص قتل کیا جائے گا۔ (۳) کوئی شخص مسلمان ہونے کے بعد مرتد ہو گیا۔

یہ قتل بھی اسلامی حکومت میں خلیفۃ المسلمین یا بادشاہِ اسلام کے حکم سے ہوگا اور اس

کے لیے بھی متعدد شرطیں ہیں۔

اموال کا تحفظ

اسی طرح اموال کے تحفظ کا بھی پورا پورا بندوبست کیا گیا۔ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نظام میں اموال کے تعلق سے درجِ ذیل قوانین دیکھیں جو قرآنی آیات اور احادیثِ مبارکہ میں مختلف جگہوں پر بیان ہیں:

☆ کسی کا مال ناحق نہیں لے سکتے۔

☆ کسی پر حاکم کے یہاں جان بوجھ کر اموال کے تعلق سے اس لیے مقدمہ دائر کرنا کہ اس کے مال کا کچھ حصہ ناحق مل جائے، جائز نہیں ہے۔

☆ سود لینا جائز نہیں ہے، جو لے گا قیامت کے دن اس کا پیٹ بوجھل ہوگا اور ایسے کھڑا ہوگا جیسے کوئی آسیب زدہ کھڑا ہوتا ہے۔

☆ کفالت میں یتیم ہوں تو ان کا مال ناحق کھانا جائز نہیں۔

☆ یتیموں کا مال جو ظلمًا کھاتا ہے گویا وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتا ہے۔

☆ ایک دوسرے کا مال ناحق کھانے سے منع کرتے ہوئے تجارت کو فروغ دینے کا حکم فرمایا گیا ہے۔

☆ ناپنے اور وزن کرنے میں برابری کا خیال رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔

☆ کاروبار اور تجارت میں دھوکہ دہی سے سختی سے منع فرمایا گیا۔

☆ کسی کا مال ناحق کھانے والے کی دعا قبول نہیں ہوتی۔

☆ جو شخص کسی کا مال غصب کرے اس کے لیے جنت حرام ہے۔

☆ اگر کوئی شخص دنیا میں کسی کی زمین کا ایک بالشت حصہ غصب کرتا ہے تو قیامت کے دن

اس کو سات زمینوں کا طوق پہنایا جائے گا۔

☆ رشوت دینے اور لینے والوں پر لعنت ہے۔

مالی معاملات کے سارے احکام ایسے ہیں جن میں کسی کا ایک پیسہ بھی ناحق لے لینا جرم قرار دیا گیا اور ہر کسی کے مال کو تحفظ دیا گیا۔

جان و مال کے تحفظ کے یہ احکام صرف مسلمانوں کی جانوں اور اموال کے لیے نہیں ہیں بلکہ ذمی اور مستامن کافروں کی جانوں اور اموال کو بھی اسی طرح کا تحفظ فراہم کیا گیا ہے۔ انھیں بھی ناحق قتل نہیں کر سکتے اور ان کے اموال بھی دھوکے سے حاصل نہیں کر سکتے ہیں۔ عہدِ نبوی میں اہلِ نجران کے ساتھ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جو معاہدہ فرمایا وہ اس بات کا بانگِ دُہل اعلان کرتا ہے۔ اس معاہدے میں حضور نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہ فرمان جاری فرمایا:

اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم، اہلِ نجران اور ان کے حلیفوں کے لیے اُن کے خون، ان کی جانوں، ان کے مذہب، ان کی زمینوں، ان کے اموال، ان کے راہبوں اور پادریوں، ان کے موجود اور غیر موجود افراد، ان کے مویشیوں اور قافلوں اور اُن کے استھان (مذہبی ٹھکانے) وغیرہ کے ضامن اور ذمے دار ہیں۔

(کتاب الخراج للامام ابی یوسف، ص:۸۵)

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ غزوۂ خیبر کا واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ فتح یابی کے بعد مسلمان مجاہدین تیزی سے بڑھ کر یہودیوں کے اموال بطورِ غنیمت جمع کرنے لگے۔ نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حکم فرمایا کہ اذان دی جائے۔ نماز کے بعد آپ نے فرمایا: اَلَا لَا تَحِلُّ اَمْوَالُ الْمُعَاهِدِينَ اِلَّا بِحَقِّهَا۔ (سنن ابی داؤد، حصہ سوم، ص:۳۵۶)

ترجمہ: آگاہ ہو جاؤ، غیر مسلم شہریوں کے اموال بھی ناحق نہیں لے سکتے ہیں۔

دیکھیں سیدِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انسانی جان و مال کے تحفظ کو کس قدر یقینی بنایا کہ صرف مسلمانوں ہی کو نہیں بلکہ اسلامی حکومت کے تحت جو ذمی یا مستامن ہوں ان کی جانوں اور اموال کو بھی تحفظ دیا گیا ہے۔ انسانی جانوں اور مالوں کے تحفظ کو یقینی بنانے ہی کے لیے سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نظام میں قتلِ ناحق کی سزا قصاص ہے، قتلِ خطا کی سزا دیت ہے، چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے اور ہر وہ کام جس میں انسانی جان و مال کا تحفظ متاثر ہو اس کے پاداش میں ایسی عبرتناک سزائیں متعین کی گئیں کہ جس کے دل میں بھی ایسے کسی کام کا خیال آئے گا، اس کا انجامِ بد سوچ کر اس کی روح کانپ جائے گی۔

پھر اگر دنیا میں اسلامی حکومت کی گرفت میں آنے سے کسی طرح بچ بھی گیا تو آخرت کے محاسبے سے کون بچا سکتا ہے؟ وہاں تو لعنت، غضب اور عذابِ الیم کا سامنا ہی کرنا پڑے گا۔ پیغمبرِ امن صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جو تصورِ آخرت پیش فرمایا ہے اس میں بھی جرائم کے سدِ باب کو یقینی بنایا گیا ہے۔

نظام مصطفی میں ہر کسی کی عزت وآبرو محفوظ

پیغمبرِ امن صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قائم کردہ نظام میں رنگ و نسل، عقیدے، مال و دولت، سماجی مرتبے اور سیاسی عزت و وقار سے قطع نظر ہر شخص کو وہ عزت اور مقام حاصل ہے جسے کوئی فرد یا معاشرہ پامال نہیں کر سکتا۔ یہ اسلامی ریاست کی ذمے داری ہے کہ وہ اپنے شہریوں کی عزت اور وقار کی حفاظت کرے اور کوئی ایسا قانون لاگو نہ ہونے دے جس سے کسی بھی شہری کی عزت اور وقار کی پامالی کی راہ نکلتی ہو۔ اسلام نہ صرف حکومت کو اس فرض کا ذمے دار ٹھہراتا ہے بلکہ معاشرے کے ہر فرد کو اس بات ذمے دار ٹھہراتا ہے کہ وہ کوئی ایسا

کام سرانجام نہ دے جس سے معاشرے کے کسی بھی فرد کی عزت و وقار مجروح ہو۔

کسی کا مذاق اڑانے سے ممانعت

عموماً ہنسی مذاق میں لوگ کسی کی عزت کے ساتھ کھلواڑ کر بیٹھتے ہیں اور ایسی باتیں کہہ دیتے ہیں جن سے ان کی ہتکِ عزت ہو جاتی ہے۔ اس سے منع فرمایا گیا۔

قرآنِ مقدس میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ۔ (سورۂ حجرات، آیت:۱۱)

ترجمہ: اے ایمان والو! نہ مرد مَردوں سے ہنسیں عجب نہیں کہ وہ ان ہنسنے والوں سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں عورتوں سے دور نہیں کہ وہ ان ہنسے والیوں سے بہتر ہوں اور آپس میں طعنہ نہ کرو اور ایک دوسرے کے بُرے نام نہ رکھو۔ (کنزالایمان)

اس آیۂ مقدسہ میں کئی احکام دیے گئے:

کوئی مرد کسی مرد کا مذاق نہ اڑائے، کوئی عورت کسی عورت کا مذاق نہ اڑائے۔ کسی کو طعنہ نہ دیا جائے۔ کسی کو برے نام سے نہ پکارا جائے۔ ان سارے احکام کے نافذ کرنے میں انسانی عزت کی حفاظت کو یقینی بنانا ہے۔

کسی کی عیب جوئی مت کرو

کسی کا عیب تلاش کرنا شریعتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں جرم قرار دیا گیا اور اس سے منع کیا گیا۔ فرمانِ قرآن ہے:

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ

اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا۔ (سورۂ حجرات، آیت:۱۲)

ترجمہ: اے ایمان والو! بہت گمانوں سے بچو، بے شک کوئی گمان گناہ ہوجاتا ہے اور عیب نہ ڈھونڈو اور ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو۔ (کنزالایمان)

عیب اور نقص کس انسان میں نہیں ہے؟ لیکن کسی کے عیب اور نقص کی تلاش میں رہنا صرف اسی مقصد سے ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص اس کی عزت کے ساتھ کھلواڑ کرے۔ اس لیے اس بات پر پابندی لگائی گئی ہے۔ اسی طرح اس آیۂ مقدسہ میں غیبت سے بھی منع کیا گیا، اس لیے کہ غیبت سے ایک انسان کی ہتکِ عزت ہوتی ہے۔ غیبت کو تو اتنا عظیم جرم قرار دیا گیا کہ اسے اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانے کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ فرمانِ قرآن دیکھیں: اَیُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ یَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ۔ (ایضًا)

ترجمہ: کیا تم میں کوئی پسند رکھے گا کہ اپنے مرے بھائی کا گوشت کھائے تو یہ تمھیں گوارا نہ ہوگا۔

جس طرح اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا کوئی انسان پسند نہیں کرے گا اسی طرح کسی کی غیبت سے بھی نفرت اور گریز ضروری ہے۔

جھوٹے الزامات اور بہتان تراشی سے ممانعت

شخصی عزت و وقار کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے قرآنِ حکیم نے کسی پر جھوٹے الزامات اور بہتان تراشی کو بھی جرم اور گناہ قرار دیا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی پر الزام لگائے اور دلیل سے ثابت نہ کر سکے تو یہ خود مجرم قرار پائے گا اور اس پر شرعی حد نافذ ہوگی۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ

فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ (سورۂ نور، آیت: ۴)

ترجمہ: اور جو پارسا عورتوں کو عیب لگائیں پھر چار گواہ معائنہ کے نہ لائیں تو انھیں اسّی کوڑے لگاؤ اور ان کی کوئی گواہی کبھی نہ مانو اور وہی فاسق ہیں۔ (کنزالایمان)

ایسا قانون سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نظام کے علاوہ کسی اور نظام میں نہیں ہے کہ اگر کسی نے کسی پر زنا کاری کا الزام لگا کر اس کی عزت کے ساتھ کھلواڑ کیا تو اس کے لیے ضروری ہے کہ چار گواہ پیش کرے۔ ان چاروں کے لیے بھی ضروری ہے کہ ظن اور تخمینے سے گواہی نہ دیں بلکہ انھوں نے زنا کرتے ہوئے اس طرح دیکھا ہو جیسے سوئی میں دھاگا ہوتا ہے، تب وہ گواہی دے سکتے ہیں۔ اگر کسی نے دعویٰ کیا اور ثابت نہ کر سکا تو وہ خود مجرم ٹھہرے گا اور اسے اسی (۸۰) کوڑے لگائے جائیں گے۔

عزت اور ناموس کی حفاظت کو نظامِ مصطفی میں اس قدر محفوظ کیا گیا ہے۔ یہ نظامِ رحمت کسی اور قانون میں نہیں پایا جاتا ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر کسی کو حقِ دفاع عطا کیا

قتل و غارت گری کی ممانعت پر آقائے رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دین میں حد درجہ تاکید ہے۔ اس سے کوئی یہ نتیجہ نہ نکالے کہ کسی کو حقِ دفاع بھی حاصل نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص کسی شخص پر حملہ آور ہوتا ہے یا اس کے مال یا اس کے اہلِ خانہ کو کسی سے خطرہ پہنچنے کا قوی اندیشہ ہے تو اسے پورا اختیار ہے کہ وہ اس کے ساتھ دفاعی کارروائی کر سکتا ہے۔ بلکہ اگر اسے جان کا خطرہ ہے اور اس نے دفاعی کارروائی میں اس کو قتل بھی کر دیا تو اس کی شرعی طور پر کوئی گرفت نہیں ہے۔

حقِ دفاع کا ذکر کرتے ہوئے قرآنِ مقدس نے فرمایا:

فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْہِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ۔

(سورۂ بقرہ، آیت: ۱۹۴)

ترجمہ: تو جو تم پر زیادتی کرے اس پر زیادتی کرو اتنی ہی جتنی اس نے کی۔

لیکن اس میں بھی مِثلِیَّت کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ اپنے دفاع میں بھی کسی پر ظلم اور زیادتی نہیں ہونی چاہیے۔

دفاع کرتے کرتے قتل ہونے والا شہید ہے

اپنی جان، مال یا اہل وعیال کے دفاع میں اگر کسی شخص کا قتل ہو گیا تو اسے شہادت کا درجہ ملے گا۔ حضرت سعید بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَالِہٖ فَھُوَ شَھِیْدٌ، وَمَنْ قُتِلَ دُوْنَ اَھْلِہٖ، اَوْ دُوْنَ دَمِہٖ، اَوْ دُوْنَ دِیْنِہٖ فَھُوَ شَھِیْدٌ۔ (سنن ابی داوٗد، حصہ چہارم، ص: ۲۴۶)

ترجمہ: اپنے مال کے دفاع میں جس کا قتل ہو گیا وہ شہید ہے، اسی طرح اپنے اہل وعیال، اپنی جان اور اپنے دین کے دفاع میں جس کا قتل ہوا وہ بھی شہید ہے۔

اس روایت سے یہ بات واضح ہو گئی کہ پیغمبرِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نہ یہ کہ صرف حقِ دفاع دیا بلکہ دفاعی کاروائی میں جسے موت مل جائے اس تعلق سے بشارت دی کہ اسے درجۂ شہادت میسر آئے گا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ہر کسی کو شخصی آزادی عطا فرمائی

پیغمبرِ امن صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نظام میں ہر کسی کو شخصی اور انفرادی طور پر

آزادی اور راز داری کا حق حاصل ہے۔ آپ نے دوسروں کے شخصی اور ذاتی معاملات کی بلا وجہ کھوج لگانے سے منع فرمایا ہے اور ایک دوسرے کے خفیہ اور نجی معاملات میں مداخلت نہ کرنے کا حکم فرمایا ہے۔ کیوں کہ جس معاشرے میں شخصی راز داری کے حق کا احترام موجود نہ ہو وہاں سماجی اور معاشرتی فتنے پیدا ہونے کا اندیشہ موجود رہتا ہے۔

بے اجازت کسی کے گھر میں داخل نہ ہو

آقائے رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعلیمات میں سے یہ بھی ہے کہ کسی کے گھر میں اس وقت تک نہ داخل ہوا جائے جب تک کہ اجازت نہ مل جائے۔ اس کا طریقہ قرآنی آیات اور احادیث مبارکہ میں بالتفصیل بیان کیا گیا ہے۔ ارشادِ قرآن ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ۔ (سورۂ نور، آیت: ۲۷)

ترجمہ: اے ایمان والو! اپنے گھروں کے سوا اور گھروں میں نہ جاؤ جب تک اجازت نہ لے لو اور ان کے ساکنوں پر سلام نہ کرلو۔ (کنزالایمان)

شخصی آزادی ہر انسان کا ذاتی حق ہے اور وہ حق تلف نہ ہو اس لیے کسی کے گھر میں کسی کو بلا اجازت داخل ہونے پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ اگر کسی کے یہاں جانا ہے تو دروازے پر کھڑے ہو کر اپنی پہچان بتاؤ، اجازت لو، سلام کرو، پھر داخل ہو سکتے ہو۔ اس اجازت لینے کے تعلق سے احادیثِ مبارکہ میں تفصیل سے احکام ملتے ہیں۔ سنن ابن ماجہ کے باب الاستئذان کی احادیث کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے:

☆ تین بار اجازت لے، اجازت ملے تو اندر آئے ورنہ واپس لوٹ جائے۔

☆ دروازے پر کھڑے ہو کر سلام کرے۔

☆ اجازت لینے کے لیے تسبیح، تکبیر یا تحمید کہے یا پھر کھنکھارے۔

☆ اپنی پہچان واضح طور پر بتائے تا کہ صاحبِ خانہ اسے پہچان سکے۔

خادم بھی بے اجازت ہر وقت گھر میں نہیں آ سکتا

شخصی آزادی کا حق اس قدر ہے کہ خدام کو بھی مخصوص اوقات میں گھر کے اندر داخل ہونے کے لیے اجازت لینے کا حکم ہوا ہے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لِيَسْتَـْٔذِنكُمُ ٱلَّذِينَ مَلَكَتْ أَيْمَٰنُكُمْ وَٱلَّذِينَ لَمْ يَبْلُغُوا۟ ٱلْحُلُمَ مِنكُمْ ثَلَٰثَ مَرَّٰتٍ ۚ مِّن قَبْلِ صَلَوٰةِ ٱلْفَجْرِ وَحِينَ تَضَعُونَ ثِيَابَكُم مِّنَ ٱلظَّهِيرَةِ وَمِنۢ بَعْدِ صَلَوٰةِ ٱلْعِشَآءِ ۚ ثَلَٰثُ عَوْرَٰتٍ لَّكُمْ ۚ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ ۚ طَوَّٰفُونَ عَلَيْكُم بَعْضُكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ۔ (سورۂ نور، آیت:۵۸)

ترجمہ: اے ایمان والو! چاہیے کہ تم سے اذن لیں تمھارے ہاتھ کے مال غلام اور وہ جو تم میں ابھی جوانی کو نہ پہنچے تین وقت، نمازِ صبح سے پہلے اور جب تم اپنے کپڑے اتار رکھتے ہو دوپہر کو اور نمازِ عشا کے بعد۔ یہ تین وقت تمھاری شرم کے ہیں۔ ان تین کے بعد کچھ گناہ نہیں تم پر نہ اُن پر۔ آمدورفت رکھتے ہیں تمھارے یہاں ایک دوسرے کے پاس۔

خدام، خادمائیں اور نابالغ بچے جن کا گھروں میں عام طور پر آنا جانا ہوتا ہے انھیں بھی اس بات کا پابند کیا گیا کہ تین مخصوص اوقات جو عموماً لوگوں کے لیے بے تکلفی کے ہوتے ہیں، ان میں اگر انھیں گھر کے اندر جانا ہو تو اجازت لے کر جائیں۔ اس لیے کہ اگر بلا اجازت آئیں گے تو ممکن ہے کہ بے تکلفی کی وجہ سے صاحبِ خانہ کے جسم کا کوئی ایسا حصہ کھلا ہو جس کی وجہ سے اس کے دل کو ناگوار معلوم ہو۔

کسی کی عیب پوشی اس کی شخصی آزادی کا حصہ ہے

ہر انسان کے اندر کچھ نجی معاملات ہوتے ہیں، بعض تو دینی یا دنیوی اعتبار سے عیب میں شمار ہوتے ہیں۔ اگر ہمیں کسی کا کوئی ایسا عیب معلوم ہے تو حکم یہ ہے کہ ہم اس کی پرائیویسی (Privacy) کا خیال رکھتے ہوئے چھپا لیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مَنْ سَتَرَ عَوْرَةَ أَخِيهِ الْمُسْلِمِ، سَتَرَ اللّٰهُ عَوْرَتَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَمَنْ كَشَفَ عَوْرَةَ أَخِيهِ الْمُسْلِمِ، كَشَفَ اللّٰهُ عَوْرَتَهُ، حَتّٰى يَفْضَحَهُ بِهَا فِي بَيْتِهِ۔

(سنن ابن ماجہ، حصہ دوم، ص: ۸۵۰)

ترجمہ: جس کسی نے اپنے مسلمان بھائی کی عیب پوشی کی اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت کے دن اس کی عیب پوشی فرمائے گا اور جس کسی نے اپنے مسلمان بھائی کے عیوب بیان کیے اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے عیوب بھی کھول دے گا یہاں تک کہ اسے خود اس کے گھر والوں کے سامنے رسوا فرمائے گا۔

اندازہ کریں کہ کسی کی شخصی آزادی کو پامال کرنا آقائے کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نظام میں کتنا بڑا جرم ہے کہ اس کی وجہ سے اسے فضیحت اور رسوائی کا منہ دنیا ہی میں دیکھنا پڑتا ہے اور اللہ تعالیٰ اسے اس کے گھر والوں کی نظر میں بھی ذلیل ورسوا فرما دیتا ہے۔

گرفتاری کا نظام

سیدِ کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا قائم کردہ نظام یہ ہے کہ کسی شخص کو اس کا جرم عدالت میں اور وہ بھی کھلی عدالت میں ثابت کیے بغیر قید نہیں کیا جا سکتا۔ محض شبہہ کی بنا پر

پکڑنا اور کسی عدالتی کاروائی کے بغیر اور صفائی کا موقع دیے بغیر قید کر دینا اسلام میں جائز نہیں ہے۔ موجودہ دور میں عام حکومتوں کے قانون اور سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قانون میں یہ بہت بڑا فرق ہے۔

حضرت مؤمل رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں: نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خطبہ ارشاد فرما رہے تھے، اسی دوران میں نے کھڑے ہو کر عرض کی: میرے پڑوسی کیوں گرفتار کیے گئے ہیں؟ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کچھ جواب نہیں دیا۔ میں نے پھر سے کہا۔ آپ نے پھر کچھ جواب نہیں دیا۔ پھر کچھ دیر کے بعد نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: ان کے پڑوسیوں کو چھوڑ دیا جائے۔ (سنن ابی داؤد، حصہ سوم، ص: ۳۱۴)

دو مرتبہ سن کر خاموش رہنے کی وجہ یہ تھی کہ کوتوال مسجد میں موجود تھا۔ اگر اس شخص کے پڑوسیوں کو گرفتار کرنے کی کوئی خاص وجہ ہوتی تو وہ اٹھ کر اسے بیان کرتا۔ جب اس نے کوئی وجہ بیان نہ کی تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حکم دے دیا کہ جن لوگوں کو گرفتار کیا گیا ہے انھیں چھوڑ دیا جائے۔ اندازہ کریں کہ آج حکومتیں کسی کو بے گناہ گرفتار کر لیتی ہیں اور پھر اپنی بے گناہی ثابت کرتے کرتے اس کی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ جب اس کی بے گناہی کا فیصلہ ہوتا ہے تب تک وہ اپنی حیات کا ایک بڑا قیمتی حصہ کھو چکا ہوتا ہے۔ نظامِ مصطفی میں دی گئی شخصی آزادی کا یہ عظیم حصہ ہے کہ کسی کو صرف شبہہ کی بنیاد پر ہرگز گرفتار نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اگر کسی نے کسی شخص پر الزام لگایا اور ثابت نہ کر سکا تو خود الزام لگانے والا سزا کا مستحق ہوگا اور اسی کو درّے لگائے جائیں گے۔

مذہبی آزادی نظام مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خاصہ

پیغمبرِ امن صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا لایا ہوا نظام ساری کائنات کے لیے امن

ورحمت ہے اور آپ کا دین ساری انسانیت کی فلاح و بہبود کا ضامن ہے۔اس کے باوجود کسی شخص کو جبراً اس دین میں داخل کرنا یا اسے اسلام قبول کرنے پر مجبور کرنا آقائے نعمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعلیمات کے خلاف ہے۔اگر کوئی شخص یہ چاہتا ہے کہ اپنے دین پر قائم رہتے ہوئے اسلامی سلطنت یا ریاست میں رہے اور جزیہ ادا کر رہا ہے تو اسے اس سلطنت کے شہری کے پورے حقوق دیے جائیں گے۔

اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کبھی دین کے معاملے میں کسی بھی قسم کی زیادتی نہیں فرمائی بلکہ ہمیشہ دین کی دعوت ایک مثبت انداز میں دی پھر اگر کوئی قبول کرتا تو ٹھیک ورنہ آپ نے کبھی کسی کو دین اسلام قبول کرنے پر مجبور نہ کیا۔آنے والے مضامین سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جائے گی۔ان شاء اللہ

دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں

کہتے ہیں: مشک آں کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید۔مشک اپنی خوشبو سے پہچان لیا جاتا ہے، عطار کے کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی ہے کہ یہ مشک ہے۔پیغمبرِ امن صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کی یہی خصوصیت ہے کہ اس کی تعلیماتِ امن ورحمت اسے ہر زمانے میں نمایاں کیے ہوئے ہیں۔اسلام کی حقانیت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے، اب جو دنیا اور آخرت میں اپنی بھلائی چاہتا ہے وہ اس کے دامن سے وابستہ ہو جاتا ہے اور جس کی قسمت میں ابدی شقاوت ہے وہ اس سے منحرف ہو جاتا ہے۔البتہ کسی کو جور و زبردستی کے ساتھ اسلام میں داخل ہونے پر مجبور کرنا درست نہیں ہے۔قرآنِ مقدس میں ارشاد ہوا:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى *لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ

عَلِيْمٌ○ (سورۂ بقرہ، آیت:۲۵۶)

ترجمہ: کچھ زبردستی نہیں دین میں بے شک خوب جدا ہوگئی ہے نیک راہ گمراہی سے تو جو شیطان کو نہ مانے اور اللہ پر ایمان لائے اس نے بڑی محکم گرہ تھامی جسے کبھی کھلنا نہیں اور اللہ سنتا جانتا ہے۔ (کنزالایمان)

کسی کو مجبور کر کے دینِ اسلام قبول کرانا پیغامِ امن کے سراسر خلاف ہے، اس لیے سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہر شخص کو مذہب کے معاملے میں آزادی دی ہے۔

مذہبی آزادی میں انسانوں کی آزمائش ہے

اگر اللہ کی منشا یہی ہوتی کہ ہر کوئی اسلام کا ماننے والا ہو تو وہ ہر کسی کے دل کو ایمان کی طرف مائل فرما دیتا۔ پھر کسی شخص کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کرنے کی ضرورت ہی نہیں پیش آتی۔ لیکن ہر انسان کو مذہبی آزادی دی گئی ہے، اس کی وجہ کیا ہے اس کا ذکر قرآنِ مقدس نے واضح انداز میں فرمایا:

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَلَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ○ (سورۂ نحل، آیت:۹۳)

ترجمہ: اور اللہ چاہتا تو تم کو ایک ہی امّت کرتا لیکن اللہ گمراہ کرتا ہے جسے چاہے اور راہ دیتا ہے جسے چاہے اور ضرور تم سے تمھارے کام پوچھے جائیں گے۔ (کنزالایمان)

اس کی غرض بیان فرماتے ہوئے ایک مقام پر فرمایا:

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ۔

(سورۂ مائدہ، آیت:۴۸)

ترجمہ: اور اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی اُمت کر دیتا مگر منظور یہ ہے کہ جو کچھ

تمھیں دیا اس میں تمھیں آزمائے۔ (کنزالایمان)

یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہدایت اور گمرہی دونوں کے راستوں کو واضح فرمادیا ہے اور انسان کو اختیار دیا ہے کہ جو راستہ چاہے اختیار کرلے۔ البتہ دنیا میں آزادی ملنے کا مطلب یہ نہیں کہ اس پر کوئی محاسبہ نہیں ہے بلکہ آخرت میں اس پر محاسبہ بھی کیا جائے گا۔ اختیار دینے کے ساتھ اللہ نے عقل کی دولت عطا فرمائی، جس طرح ایک انسان کے سامنے آگ اور پھول ہو تو آگ کو چھوڑ کر پھول کو پکڑتا ہے، اس طرح گمرہی کو چھوڑ کر راہِ حق پر چلنا چاہیے۔

اہلِ نجران سے معاہدہ

عہدِ نبوی میں اہلِ نجران سے ہونے والا معاہدہ مذہبی تحفظ اور آزادی کے تصور کی عملی وضاحت کرتا ہے۔ اِس میں حضور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہ تحریری فرمان جاری فرمایا تھا:

> اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم، اہلِ نجران اور ان کے حلیفوں کے لیے اُن کے خون، ان کی جانوں، ان کے مذہب، ان کی زمینوں، ان کے اموال، ان کے راہبوں اور پادریوں، ان کے موجود اور غیر موجود افراد، ان کے مویشیوں اور قافلوں اور اُن کے مذہبی ٹھکانوں وغیرہ کے ضامن اور ذمے دار ہیں۔ جس دین پر وہ ہیں اس سے ان کو نہیں پھیرا جائے گا۔ ان کے حقوق اور اُن کی عبادت گاہوں کے حقوق میں کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔ نہ کسی پادری کو، نہ کسی راہب کو، نہ کسی سردار کو اور نہ کسی عبادت گاہ کے خادم کو، خواہ اس کا عہدہ معمولی ہو یا بڑا، اس سے نہیں ہٹایا جائے گا اور ان کو کوئی خوف اور خطرہ نہ ہوگا۔ (کتاب الخراج لابی یوسف:۸۵)

کیا مذہبی آزادی کی یہ مثال کوئی دوسری قوم یا کوئی دوسرا ملک دے سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ یہ سرکارِ ابد قرار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نظام رحمت کی یہ خاصیت ہے جس کی مثال دنیا کے کسی اور نظام میں مل ہی نہیں سکتی۔

ہر انسان کے لیے دینِ مصطفٰی میں حق مساوات ہے

''مساوات'' کا معنیٰ عموماً لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہر کسی کو برابر برابر ملے۔ لیکن در حقیقت یہ مساوات نہیں ہے کیوں کہ ہر کسی کو برابر برابر دیا جانا عدل کے خلاف ہے۔ اس بات کو ایک مثال سے سمجھیں کہ ایک جماعت میں پچاس طلبہ ہیں، امتحان میں ہر طالب علم کو اس کی صلاحیت، قابلیت، محنت اور اس کے لکھے ہوئے جوابات کے مساوی نمبرات ملتے ہیں۔ یہی عدل کا تقاضا بھی ہے۔ اگر کوئی شخص یہ مطالبہ لے کر کھڑا ہو جائے کہ بحیثیت طالبِ علم سب کو برابر نمبرات ملنے چاہئیں تو اس کی عقلمندی پر کس قدر ماتم کیے جائیں گے یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔

یہی حال ہر معاملے میں مساوات کا ہے کہ ہر انسان کو اس کے اعتبار سے حقوق ملیں یہ اس کے لیے مساوی ہے، اگر کسی ادنیٰ درجے والے کو زیادہ دے دیا گیا یا کسی اعلیٰ درجے والے کو کم دے دیا گیا تو یہ مساوات نہیں بلکہ عدل کے خلاف کام ہوگا۔ سب کو برابر برابر حقوق دینے میں یہی خرابی لازم آئے گی کہ کسی کم درجے والے کو زیادہ مل جائے گا اور کسی اعلیٰ درجے والے کو کم ملے گا۔ البتہ بحیثیت انسان سارے انسان برابر ہیں کہ بغیر کسی وجہ اور باعث کے کسی کو کسی پر کوئی برتری اور بلندی نہیں ہے۔ سبب اور باعث بھی کیا خوب ہے کہ اسے تقویٰ کہا جاتا ہے۔

مرد اور عورت کے حقوق کی مساوات

مرد اور عورت کے حقوق میں مساوات کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے کہ مرد جن حقوق کے اہل ہیں انھیں ان کے وہ حقوق دیے گئے اور عورتیں جن حقوق کی اہل ہیں انھیں ان کے وہ حقوق دیے گئے ہیں۔ فرمانِ قرآن ہے:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ۔

(سورۂ بقرہ، آیت: ۲۲۸)

ترجمہ: اور عورتوں کا بھی حق ایسا ہی ہے جیسا ان پر ہے شرع کے موافق اور مردوں کو ان پر فضیلت ہے۔ (کنزالایمان)

مردوں اور عورتوں کی اپنی اپنی ذمے داریاں، کمزوریاں اور صلاحیتیں ہیں۔ انھی کی بنا پر ان میں حقوق وفرائض کی بھی تقسیم ہیں۔ عورتوں پر ان کی طاقت وقوت کے اعتبار سے ذمے داریاں ہیں اور مردوں پر ان کی طاقت وقوت کے اعتبار سے ذمے داریاں ہیں۔ بہت سے ایسے کام ہیں جو مرد انجام دیتے ہیں، عورتیں نہیں دے سکتی ہیں اور بہت سے ایسے کام ہیں جو عورتیں انجام دیتی ہیں لیکن مرد نہیں دے سکتے۔

بعض مواقع پر مردوں کے حقوق عورتوں سے بڑھ کر ہیں تو بعض مواقع پر عورتوں کے حقوق بھی مردوں سے بڑھ کر ہیں۔ وہ حدیثِ پاک جس میں باپ کے مقابل ماں کے حقوق کی تین مرتبہ تاکید آئی ہے اس میں عورت کا حق مرد سے زیادہ رکھا گیا ہے۔ یہ زیادتی مبنی بر عدل ہے اور مساوات کے تقاضے کے عین مطابق ہے۔

اسلام میں معاشی مساوات

اسی طرح معاشی مساوات کا معاملہ بھی ہے۔ ہر کسی کی روزی کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے ذمۂ کرم پر لیا ہے۔ وہ خود ارشاد فرماتا ہے:

وَمَا مِنۡ دَآبَّةٍ فِي الۡاَرۡضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزۡقُهَا ۔ (سورۂ ہود، آیت:٦)

ترجمہ: اور زمین پر چلنے والا کوئی ایسا نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمۂ کرم پر نہ ہو۔

اس آیۂ کریمہ میں واضح فرما دیا گیا کہ حقِ معاش ہر کسی کو ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ سب کو روزی پہنچاتا ہے۔ البتہ تقسیمِ رزق سب کے لیے مختلف ہے، کسی کو تھوڑی ملتی ہے اور کسی کو زیادہ ملتی ہے، یہی معاشی مساوات ہے اور تقاضاے عدل کے بالکل موافق ہے۔ قرآنِ مقدس کی ایک آیۂ مقدسہ میں اس کی وضاحت کی گئی ہے۔

وَلَوۡ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزۡقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوۡا فِي الۡاَرۡضِ وَلٰكِنۡ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ ۔ (سورۂ شوریٰ، آیت:۲۷)

ترجمہ: اور اگر اللہ اپنے سب بندوں کا رزق وسیع کر دیتا تو ضرور زمین میں فساد پھیلاتے لیکن وہ اندازے سے اتارتا ہے جتنا چاہے۔ (کنزالایمان)

اس آیۂ مقدسہ میں اس بات کو واضح کر دیا گیا کہ اگر دنیا میں ہر کسی کے لیے دولت کی ریل پیل ہوتی تو زمین میں جو امن وسکون قائم ہے وہ برقرار نہیں رہ پاتا۔ اس لیے روزی ہر کسی کو الگ الگ مقدار میں ملتی ہے۔ پھر اس میں بہت بڑی حکمت یہ ہے کہ اگر دنیا میں ہر کوئی مالدار ہوتا تو دنیا کی ترقی کا امکان ختم ہو جاتا۔ مزدور طبقہ جن سے چھوٹے موٹے کام لیے جاتے ہیں ان کاموں کو کرنے والا کون ہوتا؟ تعمیرات، گلکاریاں، صنعت وحرفت، کھیتی باڑی اور اس طرح کے عرق ریزی والے کام کون کرتا؟ پھر غذائی اشیا کی فراہمی کہاں سے ہوتی؟ جب اناج ہی نہ ہوتا تو پیسے سے کیا خرید کر کھاتے؟

اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہر انسان اس کی ضرورت کے اعتبار سے اسے روزی عطا فرمائی، کسی کو کم دیا تو یہ اس کے اعتبار سے مساوی ہے اور کسی کو زیادہ دیا تو وہ اس

کے اعتبار سے مساوی ہے اور اس کی تقسیم عدل پر مبنی ہے۔

ہر فردِ انسان کا حق ہے کہ اس کے ساتھ عدل ہو

دنیا میں امن وسکون کے قیام اور بقا کے لیے عدل وانصاف کی حد درجہ ضرورت ہے کہ اس کے بغیر امن بالکل ناپید ہوتا ہے۔ یہ قانونِ عدل بھی ہر فردِ انسان کے لیے یکساں ہونا ضروری ہے، جس نظام میں بھید بھاؤ پایا گیا پھر وہ اپنی معنویت کھو دیتا ہے اور اس میں کھوکھلا پن آجاتا ہے۔

نظامِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہر فردِ انسانی کے لیے عدل وانصاف کا پیامبر ہے اور اس میں ہر کسی کے لیے یکساں قوانین ہیں۔ یہ نظامِ مصطفیٰ کی خاصیت ہے کہ دشمن سے بدلہ لینے میں بھی عدل ومساوات کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

عدل وانصاف کی حد درجہ تاکید

قرآنِ مقدس اور احادیثِ مبارکہ میں عدل وانصاف پر قائم رہنے اور ہر حال میں عدل وانصاف کا خیال رکھنے کی حد درجہ تاکید کی گئی ہے۔ بے شمار آیات وآثار ہیں جن میں اس تعلق سے متعدد انداز میں تاکیدیں آئی ہیں۔ چند آیات کے خلاصے ملاحظہ کریں:

☆ عدل وانصاف میں اگر چہ اپنا ذاتی نقصان ہو یا والدین اور قریبی رشتے داروں کا نقصان ہو تب بھی عدل وانصاف پر قائم رہنے کی تاکید ہے۔

☆ کسی قوم سے دشمنی نبھانے میں بھی عدل کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

☆ عدل تقویٰ سے قریب کرنے والا ہے۔

☆ ناپ تول انصاف کے ساتھ ہونا چاہیے۔

☆ کسی بھی معاملے کا فیصلہ کیا جائے تو عدل کے ساتھ کیا جانا ضروری ہے۔

یہ آیاتِ مقدسہ ہر کسی کے ساتھ عدل وانصاف کی دعوت دے رہی ہیں اور واضح الفاظ میں تاکید کر رہی ہیں۔ یہاں تک کہ عدل وانصاف کرنے میں اگر اپنا ذاتی نقصان بھی ہو تب بھی حکم یہی ہے کہ عدل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنا چاہیے۔

نبیِ رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عدل وانصاف کو یقینی بنایا

عدل وانصاف سے محروم دنیا کو عدل وانصاف کا درس دینے والے اور سارے عالم کو عدل سکھانے والے سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہی ہیں۔ عدل وانصاف کا آپ نے کس حد تک خیال فرمایا اس کے تعلق سے اس کتاب کے متعدد مقامات پر احادیث مذکور ہوئی ہیں۔ یہاں چند احادیث کا خلاصہ ملاحظہ کرتے چلیں:

☆ کسی عربی کو کسی عجمی پر، کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی گورے کو کسی کالے پر، کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت نہیں ہے، سوائے تقویٰ کی وجہ سے۔

☆ عدل وانصاف کے معاملے میں کسی کے ساتھ کوئی بھید بھاؤ نہیں۔ اگر فاطمہ بنت محمد (علیہا وعلی ابیہا الصلوٰۃ والسلام) بھی (بالفرض) چوری کریں تو ان کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔

☆ غزوۂ بدر کے قیدیوں میں سرورِ عالم صلی اللہ کے چچا حضرت عباس بھی تھے، ان کے فدیے کی معافی کے تعلق سے لوگوں نے بات کی تو آقائے نعمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سختی سے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ ایک درہم بھی معاف نہیں کیا جائے گا۔

☆ یہودی اور (نام نہاد) مسلمان کے درمیان کھیتی میں پانی ڈالنے کے معاملے میں اختلاف ہوا تو چوں کہ یہودی حق پر تھا اس لیے آپ نے اسی کے حق میں فیصلہ فرمایا۔

دنیا کا کوئی ایسا نظام نہیں ہے جس میں عدل وانصاف کا اتنا اہم نظام ہو کہ اپنا ہو یا بے گانہ، دوست ہو یا دشمن، ہر کسی کو یہ حق دیا گیا ہو کہ اس پر ایک ذرے برابر بھی ظلم روا نہ رکھا

گیا ہو بلکہ ہر حال میں ہر کسی کے ساتھ عدل ہی کا معاملہ کیا جاتا ہو۔

ہر انسان کے لیے حقِ اجرت ہے

انسان اپنی روزی کمانے کے لیے دائرۂ شریعت میں رہ کر جیسی بھی محنت کرے خواہ وہ محنت جسمانی ہو یا دماغی، اسلام اس کی اجازت دیتا ہے، محنت کرنے پر ابھارتا ہے اور اس نے جس قدر جاں فشانی اس کام میں کی ہے اس کے مطابق اس محنت کش کو اجرت کا مستحق قرار دیتا ہے۔ اس تعلق سے ہر انسان برابر ہے، خواہ وہ کسی بھی مذہب وملت سے تعلق رکھتا ہو۔ اگر کسی شخص نے کسی شخص کی طاقت اور صلاحیت کو استعمال کیا ہے تو اس پر اس کا فرض بنتا ہے کہ اس کی محنت کے مطابق اجرت دے۔

پسینہ سوکھنے سے پہلے مزدور کو مزدوری دے دو

ایک مزدور صبح سے شام تک محنت کرتا ہے اور عرقِ جبین بہاتا ہے، اسے امید ہوتی ہے کہ شام میں اسے جو اجرت ملے گی اس کے ذریعے وہ اپنے لیے اور اپنے بچوں کے لیے دو وقت کی روٹی کا انتظام کرے گا۔ اسی لیے حکم ہوا کہ کام کی تکمیل کے فوراً بعد اس کی اجرت اس کے حوالے کر دی جائے کہ اس سے اس کا دل خوش ہوگا اور اس کی تھکان دور ہو جائے گی۔ پھر اگلے دن اسے کام کرنے میں نیا ذوق محسوس ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اَعْطُوا الْاَجِیْرَ اَجْرَہٗ قَبْلَ اَنْ یَّجِفَّ عَرَقُہٗ۔ (سنن ابن ماجہ، حصہ دوم، ص:۸۱۶)

ترجمہ: مزدور کا پسینہ سوکھنے سے پہلے اس کی مزوری دے دو۔

مزدور طبقہ عموماً ایسا ہی ہوتا ہے جو ایک دن کماتا ہے تو اگلے دن کے اخراجات کا

انتظام کرتا ہے۔ ایسے میں اگر اس کی ایک دو روز کی مزدوری روک دی گئی تو اس کے اور اس کے اہلِ خانہ کے اخراجات متأثر ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے حکم ہوا کہ مزدور نے جیسے ہی اپنا کام مکمل کیا اس کی مزدوری اس کے حوالے کر دی جائے۔

دنیا میں مزدوری نہیں دیا تو قیامت میں مطالبہ ہوگا

اجیر کی اجرت کی ادائیگی کو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قدر ضروری قرار دیا ہے کہ اگر کسی نے اس میں کوتاہی کی تو بروز قیامت اس سے اس کا مطالبہ کیا جائے گا اور یہ مطالبہ کرنے والا خود اللہ تبارک وتعالیٰ ہوگا۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

تین شخص وہ ہیں جن کے حق کا قیامت کے دن میں مطالبہ کرنے والا بنوں گا۔ ایک وہ جس نے میرا نام لے کر معاہدہ کیا پھر اُس عہد کو توڑ دیا۔ دوسرا وہ جس نے آزاد کو بیچا اور اُس کا ثمن کھایا۔ تیسرا وہ جس نے مزدور رکھا، اس سے کام پورا لیا اور اُس کی مزدوری نہیں دی۔

(صحیح البخاری، حصہ سوم، ص: ۸۲)

جب کسی اجیر کے حقِ اجرت کے مطالبے میں ذاتِ باری تعالیٰ ہوگی تو کیا کسی کے اندر طاقت ہے کہ اس کے سامنے کھڑا ہو سکے گا۔ پھر قیامت کے دن وہ اجرت مال و دولت سے نہیں ادا کرنی ہوگی بلکہ وہاں تو ہر حقدار کے حق کو ادا کرنے کا یہی دستور ہے کہ اِس کی نیکیاں اٹھا کر اُس کو دے دی جائیں گی اور اگر اِس کے پاس نیکیاں نہیں ہوں گی کہ تو اُس کے گناہ اٹھا کر اِس کو دے دیے جائیں گے۔

حقِ وقف اسلام کا امتیازی قانون

وقف اسلامی قانون کا ایک اہم جز اور مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا ایک روشن رخ

ہے۔مسلمانوں نے ہر دور اور ہر دیار میں اس کارِخیر اور فلاحی پروگرام کو رواج دیا ہے۔وقف صرف محتاجوں اور مفلسوں پر ہی نہیں ہوتا بلکہ سب کے لیے ہوتا ہے، اس میں امیر و غریب کی کوئی تخصیص نہیں ہوتی بلکہ ہر کسی کو اس سے فائدہ اٹھانے کا امکان ہوتا ہے۔

اسلام کے مالیاتی نظام میں وقف کو ایک بنیادی حیثیت حاصل ہے۔اسلامی تاریخ کے ہر دور میں غریبوں اور مسکینوں کی ضروریات کو پورا کرنے، انھیں معاشی طور پر خود کفیل بنانے، مسلمانوں کو علوم وفنون سے آراستہ کرنے، مریضوں اور پریشان حالوں کی حاجت روائی کرنے اور اہلِ علم وفضل کی معاشی کفالت میں اسلامی وقف کا بہت اہم رول رہا ہے۔

قرآن کی نگاہ میں اموال وقف کر کے نا صرف انسان اپنی جاویدانی زندگی حاصل کرتا ہے بلکہ اس نیک اور پرخلوص عمل کے ذریعے سے وہ ناداروں اور ضرورت مندوں کی مدد کر کے خدا کی خوشنودی بھی حاصل کر لیتا ہے۔

قرآنِ مجید میں وقف کا لفظ صراحت کے ساتھ تو نہیں آیا لیکن اس کے لیے صدقہ، خیر، نیکی، قرضِ حسن، تعاون، عملِ صالح، باقیاتِ صالحات، ایثار، انفاق اور احسان جیسی تعبیرات استعمال ہوئی ہیں۔البتہ مذکورہ تمام عناوین ایک لحاظ سے وقف کہلا سکتے ہیں کیوں کہ وقف صدقہ ہونے کے ساتھ ساتھ سب سے بڑی نیکی، ایثار، تعاون، خیر، انفاق اور باقیاتِ صالحات بھی ہے۔

اللہ کی رضا کے لیے کوئی شخص ایک روپیہ بھی خرچ کرے تو وہ اس کے لیے اجرِ عظیم کا باعث ہوتا ہے۔قرآنِ مقدس میں ارشاد ہوا:

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوٰلَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ۔

(سورۂ بقرہ، آیت: ۲۶۱)

ترجمہ: ان کی کہاوت جو اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اُس دانے کی طرح جس نے اوگائیں سات بالیں، ہر بال میں سو دانے اور اللہ اس سے بھی زیادہ بڑھائے جس کے لیے چاہے۔ (کنز الایمان)

اس آیۂ مقدسہ میں فرمایا گیا کہ اللہ کی رضا کے لیے کوئی شخص اس کی راہ میں تھوڑا مال بھی خرچ کرے تو اللہ کی بارگاہ سے اسے اس پر اجرِ عظیم دیا جاتا ہے جیسے کہ ایک حقیر دانہ جب زمین میں ڈال دیا جاتا ہے تو وہ سات بالیاں اگاتا ہے اور ہر بالی میں سو دانے ہوتے ہیں۔ اس طرح اس ایک دانے سے سات سو دانے نکلتے ہیں۔

وقف کو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب سے بہتر صدقہ قرار دیا

ویسے تو ہر صدقہ باعثِ اجر وثواب ہے لیکن عام مسلمانوں کے فائدے کے لیے کوئی چیز وقف کر دی جائے یہ سب افضل صدقہ ہے اور اس کا اجر وثواب دائمی ہے۔ ایک حدیث میں اسے سب سے افضل صدقہ قرار دیا گیا ہے اور ایک حدیث میں یہ فرمایا گیا ہے کہ مرنے کے بعد بھی وقف کی ہوئی چیز کا اجر وثواب وقف کرنے والے کو ملتا رہتا ہے۔

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی والدہ کا انتقال ہوا تو انھوں نے سرورِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہِ عالی میں عرض کی: میری والدہ کا انتقال ہو گیا ہے، ان کے لیے کون سا صدقہ کروں تو افضل ہے؟ آپ نے فرمایا: پانی۔ حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کنواں کھدوایا اور اسے اپنی والدہ کے نام سے وقف کر دیا۔

(سنن ابی داؤد، حصہ دوم، ص: ۱۳۰)

ایک روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہے کہ آقائے رحمت صلی اللہ

تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اِذَا مَاتَ الْاِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهٗ اِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ: اِلَّا مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ، اَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهٖ، اَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُوْ لَهٗ۔ (صحیح مسلم، حصہ سوم، ص:۱۲۵۵)

ترجمہ: جب کسی شخص کا انتقال ہو جاتا ہے تو اس کے تین اعمال کے علاوہ سارے اعمال منقطع ہو جاتے ہیں۔ (۱) صدقۂ جاریہ۔ (۲) علم جس سے فائدہ اٹھایا جائے۔ (۳) نیک لڑکا جو اس کے لیے دعا کرے۔

اس روایت میں صدقۂ جاریہ سے مراد وقف ہی ہے کہ کسی نے مسجد بنوا دی، مسافر خانہ بنوا دیا، پانی کی سبیل لگوا دی، پُل بنوا دیا یا کوئی بھی ایسا کام کیا جس سے عام انسانوں کو فائدہ پہنچے تو اس کا یہ کام صدقۂ جاریہ ہے کہ جب تک لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے اس کے نامۂ اعمال میں اس کا اجر و ثواب لکھا جاتا رہے گا۔

اس سے پتہ چلا کہ وقف کی کس قدر اہمیت ہے کہ جب تک وہ وقفی چیز باقی رہے گی ثوابِ عمل جاری و ساری رہے گا۔

حقِ کفالت بے سہاروں کے لیے امن و رحمت

بچوں کے لیے باپ، بیوی کے لیے شوہر اور بہن کے لیے بھائی سایہ دار درخت کی طرح ہوتا ہے۔ ان کے کھانے پینے، رہنے سہنے اور دیگر اخراجات و ضروریات کا خیال رکھنا ان کا فریضہ بھی ہے اور فطری طور پر بھی انسان ان کے اخراجات کو برداشت کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔

سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا نظام یتیموں، مسکینوں، بیواؤں، بے سہارا اور غریب طبقے کے لوگوں کو سہارا دینے، ان کی مکمل کفالت کرنے، ان سے پیار کرنے، انھیں

کھانا کھلانے، انھیں وسائل مہیا کرنے اور انھیں آسودگی فراہم کرنے کی نا صرف ترغیب دیتا ہے بلکہ معاشرے کے بے کس، محروم، نادار طبقے اور سوسائٹی کے محتاج، بے سہارا اور معصوم بچوں کی کفالت کے اہتمام کا حکم بھی دیتا ہے۔ معاشرے کے ایسے افراد جو وسائل رکھتے ہوئے بھی اپنے مال سے یتیموں اور محتاجوں کا حصہ نہیں نکالتے ان کی نمازیں، حج اور دیگر اعمال اللہ رب العزت ردفرما دیتا ہے۔

جب جنتی جنت میں اور جہنمی جہنم میں پہنچ جائیں گے تو اہلِ جنت جہنمیوں سے پوچھیں گے کہ تم جہنم میں کیسے پہنچ گئے؟ اس وقت جو ان کی باہمی گفتگو ہوگی وہ قرآنِ مقدس میں بیان کی گئی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ○ اِلَّاۤ اَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ ○ فِيْ جَنّٰتٍ ۛ يَتَسَآءَلُوْنَ ○ عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ ○ مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ○ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ○ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ○ (سورۂ فجر، آیت: ۳۸-۴۴)

ترجمہ: ہر جان اپنی کرنی میں گروی ہے، مگر دہنی طرف والے، باغوں میں پوچھتے ہیں مجرموں سے، تمھیں کیا بات دوزخ میں لے گئی؟ وہ بولے ہم نماز نہ پڑھتے تھے اور مسکین کو کھانا نہ دیتے تھے۔ (کنز الایمان)

پتہ چلا کہ یتیموں کی کفالت نہ کرنا جہنم میں جانے کا سبب بن سکتا ہے اس لیے کہ اگر کسی کے سر سے سہارا اٹھ گیا ہے تو اسے سہارا دینا اہلِ ثروت کی ذمے داری ہے۔

یتیموں، بیواؤں، مسکینوں اور بے سہارا لوگوں کی کفالت کے فضائل وفوائد اس کتاب کے مختلف حصوں میں حسبِ مناسبت ذکر کی گئی ہیں۔ یہاں صرف اتنا بتانا مقصود ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نظام میں بے سہارا لوگوں کی کفالت کو یقینی بنایا گیا

ہے اور انھیں بے یار و مددگار نہیں چھوڑا گیا ہے۔

وراثت میں حصوں کی تعیین

سرورِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے وراثت کا کوئی نظام نہیں تھا۔ کسی شخص کا انتقال ہوتا تو اس کی دولت پر جو جیسے چاہتا قبضہ کر لیتا۔ کہیں اگر وراثت کا نظام تھا بھی تو اس میں صرف بیٹوں کا حق تھا، بیویوں اور بچیوں کا کوئی حق نہیں تھا۔ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نظامِ رحمت نے ہر حقدار کے لیے وراثت کا حق متعین کیا ہے۔ قرآنِ مقدس میں سورۂ نساء کی آیت: نمبر ۱۱ میں وراثت کے احکام تفصیل کے ساتھ بیان کر دیے گئے۔ ان کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے:

☆ بیٹوں کا بیٹیوں کے مقابل میں دوگنا حصہ ہے۔

☆ اگر صرف بیٹیاں ہیں تو ان کے لیے دو تہائی حصہ ہے۔

☆ اگر صرف ایک بیٹی ہے تو اس کے لیے پورے مال کا آدھا حصہ ہے۔

☆ اگر میت کی اولاد ہو تو والدین میں سے ہر ایک کے لیے چھٹا حصہ ہے۔

☆ اگر میت کی اولاد نہ ہو اور وارث صرف والدین ہوں تو ماں کے لیے ایک تہائی ہے، البتہ اگر میت کے بھائی بہن ہوں تو اس صورت میں بھی ماں کا چھٹا حصہ ہے۔

☆ بیویوں کا انتقال ہو اور ان کی اولاد نہ ہو تو ان کے مال میں شوہروں کا نصف حصہ ہے اور اگر ان کی اولاد ہے تو شوہروں کا چوتھائی حصہ ہے۔

☆ شوہر کا انتقال ہوا اور اس کی اولاد نہیں ہیں تو اس کے مال میں بیویوں کے لیے چوتھائی حصہ ہے اور اولاد ہوں تو بیویوں کے لیے آٹھواں حصہ ہے۔

وراثت کا باب بہت طویل ہے اور اس کے مسائل بہت باریک ہیں۔ یہاں یہ ذکر

کرنا مقصود ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نظام میں مساوات کے ساتھ تقسیمِ وراثت کا حکم ہے کہ ہر حقدار تک اس کا حق پہنچ جائے۔

میراث سے محروم نہ کرو

معاشی اعتبار سے کوئی شخص کمزور نہ رہے بلکہ حسبِ استطاعت ووسعت اسے معاشی فراوانی میسر آئے اس بات کا خیال سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعلیمات کا حصہ ہے۔ اگر کوئی شخص قریبِ مرگ ہے اور اس کے پاس مال ودولت ہے تو اپنی اولاد کے لیے مال ودولت چھوڑ جانا ضروری ہے۔ ایسا نہ کرے کہ سب کچھ وقف کر دے یا کسی غیر وارث کو ہبہ کر دے کہ اس میں اولاد کی محرومی ہے۔ راہِ خدا میں خرچ کرنا بالیقین کارِ ثواب ہے لیکن اولاد کا خیال کرنا بھی تو جزوِ عبادت ہے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ فتحِ مکہ کے سال میری طبیعت خراب ہوگئی یہاں تک کہ مجھے ایسا لگنے لگا کہ اب میرا انتقال ہو جائے گا۔ رسولِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میری عیادت کے لیے تشریف لائے، میں نے عرض کی یا رسول اللہ! میرے پاس بہت مال ودولت ہے اور میرے وارثین میں صرف ایک بیٹا ہے تو کیا میں اپنے مال کے دو تہائی حصے صدقہ کر دوں؟ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے منع فرما دیا۔

میں نے عرض کی تو کیا نصف حصہ صدقہ کر دوں؟ آپ نے فرمایا: نہیں۔ میں نے عرض کی: تو کیا ایک تہائی حصہ صدقہ کر دوں؟ آپ نے فرمایا:

وَالثُّلُثُ كَثِيْرٌ اِنَّكَ اَنْ تَتْرُكَ وَرَثَتَكَ اَغْنِيَاءَ، خَيْرٌ مِّنْ اَنْ تَتْرُكَهُمْ عَالَةً يَتَكَفَّفُوْنَ النَّاسَ۔

ترجمہ: تہائی حصہ بھی کافی ہے۔ تم اپنے وارثین کو غنی چھوڑو یہ اس بات سے بہتر

ہے کہ انھیں محتاج چھوڑ واور وہ لوگوں سے بھیک مانگتے پھریں۔ (سنن ابن ماجہ، حصہ دوم، ص: ۹۰۳)

دنیا سے جانے والے بعض انسان سوچتے ہیں کہ نیکیوں کے انبار ساتھ لے کر جائیں لیکن ایسے میں بھی سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حکم فرمارہے ہیں کہ اپنے وارثین کے لیے مال ودولت چھوڑتے جاؤ تاکہ انھیں دنیا میں سہارا رہے۔

ہر شخص کو حقِ نکاح حاصل ہے

نکاح انسانی ضرورت ہے اور اسی سے نسلِ انسانی کی بقا ہے۔ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نظام میں مردوں اور عورتوں دونوں کو اپنی خواہش کے اعتبار سے نکاح کا حق حاصل ہے۔ شادی بیاہ کے نظام میں اسلام اور دیگر اقوام کے نظام میں چند نمایاں فرق ہیں۔ نظامِ اسلام ہر کسی کے لیے رحمت ہے جب کہ دیگر اقوام کے نظام بارہا زحمت بن جایا کرتے ہیں۔

☆ اسلام نے نکاح کے لیے کسی عمر کا تعین نہیں کیا ہے، اگر کوئی شخص چاہے تو کم سنی میں بھی نکاح کرسکتا ہے۔ دیگر اقوام میں عمر کا تعین ہے بلکہ خود ہندوستان میں اٹھارہ سال کی عمر سے پہلے نکاح کرنا اب قانونی طور پر جرم ہے۔ چاہے بھلے اس سے پہلے بدکاری اور زناکاری کے گھناونے جرائم کا ارتکاب کر بیٹھیں۔

☆ اسلام نے مردوں اور عورتوں دونوں کو اختیار دیا ہے کہ اپنی پسند سے نکاح کریں۔ اگر ان کے اولیا نے ان کی مرضی کے خلاف نکاح کرا دیا ہے تو انھیں حقِ فسخ حاصل ہے۔

☆ متعدد فوائد اور حکمتوں کے پیش نظر مردوں کو ایک سے زیادہ چار تک نکاح کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ البتہ اس حکم کو شرائط کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے۔ بہت سی اقوام میں اس کی قطعی اجازت نہیں ہے۔

☆ مطلقہ اور بیوہ عورتوں کو بھی نکاح کا اتنا ہی حق حاصل ہے جتنا باکرہ عورتوں کو ہے۔ دیگر اقوام میں اس تعلق سے کوئی اطمینان بخش نظام نہیں بلکہ بعض اقوام کے قوانین میں تو بیواؤں کو دوسرا نکاح کرنے کا کوئی حق نہیں۔

نکاح مفلسی کو دور کرنے کا ذریعہ ہے

عمومًا لوگوں کا یہ خیال ہوتا ہے کہ پہلے بچے اپنے آپ کو مالی اعتبار سے مضبوط کر لیں پھر ان کا نکاح کیا جائے۔ اس انتظار میں بچوں کی عمریں بڑھتی چلی جاتی ہیں اور نہ جانے کتنے گناہوں کی طرف مائل بھی ہو جاتے ہیں۔ نظامِ مصطفی میں ایسی کوئی قید نہیں لگائی گئی ہے، ایک شخص مہر کی ادائیگی اور عورت کے نان و نفقے کی ادائیگی پر قادر ہو تو نکاح کر سکتا ہے۔ فرمانِ قرآن ہے:

وَاَنۡكِحُوا الۡاَيَامٰى مِنۡكُمۡ وَالصّٰلِحِيۡنَ مِنۡ عِبَادِكُمۡ وَاِمَآئِكُمۡ ؕ اِنۡ يَّكُوۡنُوۡا فُقَرَآءَ يُغۡنِهِمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ ۔ (سورۂ نور، آیت:۳۲)

ترجمہ: اپنے یہاں کی بے شوہر والی عورتوں کا نکاح کر دو اور اپنے نیک غلاموں اور باندیوں کا۔ اگر وہ محتاج ہوں تو اللہ اپنے فضل کے سبب اُنھیں غنی کر دے گا۔ (کنزالایمان)

یعنی اس انتظار میں انھیں بٹھائے نہ رکھو کہ پہلے مال و دولت کما لیں پھر شادی کی جائے گی بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ بعدِ نکاح خود ان کے لیے وسعتِ رزق کا انتظام فرما دے گا۔ البتہ اگر کسی کے پاس اتنا بھی انتظام نہیں ہے کہ وہ مہر اور نفقے کا انتظام کر سکے تو اس کے لیے حکم ہوا کہ وہ اپنے دامن کو گناہوں سے بچائے، جلد ہی اللہ تبارک وتعالیٰ اسے بھی طاقت عطا فرما دے گا۔

فرمانِ قرآن ہے: وَلۡيَسۡتَعۡفِفِ الَّذِيۡنَ لَا يَجِدُوۡنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغۡنِيَهُمُ

اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ۔ (سورۂ نور، آیت: ۳۲)

ترجمہ: اور چاہیے کہ پارسائی کریں وہ کہ نکاح کا مقدور نہیں رکھتے یہاں تک کہ اللہ اپنے فضل سے انھیں مقدور والا کردے۔ (کنزالایمان)

ترویجِ نکاح معاشرے میں امن کا پیش خیمہ ہے

عملِ زوجیت انسانی ضرورت ہے اور انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ اس کے ساتھ زندگی کے طویل سفر میں کوئی شریکِ حیات ہو جو اس کے لیے تسکین کا ذریعہ ہو۔ اگر یہ ذریعۂ تسکین جائز طریقے سے نہ ملے تو بارہا انسان کا دل اسے ناجائز طریقے سے حاصل کرنے کی طرف مائل ہوتا ہے اور وہ شخص زنا کاری کا شکار ہوتا ہے جس سے معاشرے میں بدامنی پھیلتی ہے۔ اسی لیے سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نظام میں نکاح کو ریت رواج سے پاک کر کے بالکل آسان کیا گیا کہ ایک شخص کم از کم دس درہم حقِ مہر ادا کرے، ایجاب وقبول کے تین بول بولے اور نکاح ہو گیا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ، مَنِ اسْتَطَاعَ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ، فَإِنَّهُ اَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَاَحْصَنُ لِلْفَرْجِ۔ (صحیح البخاری، حصہ ہفتم، ص: ۳)

ترجمہ: اے جماعتِ نوجوانان! تم میں سے جو کوئی بیوی رکھنے کی طاقت رکھتا ہے اسے چاہیے کہ نکاح کر لے اس لیے کہ نکاح نگاہوں کو جھکانے والا اور شرمگاہ کی حفاظت کرنے والا ہے۔

آپ دیکھیں کہ جس قوم یا ملک میں نکاح کو مشکل بنا دیا جاتا ہے اس میں زنا کاری

کس قدر عام ہو جاتی ہے اور جس معاشرے میں زنا کاری عام ہو جائے وہاں امن وسکون کس قدر غارت ہو جاتا ہے۔

آج ہندوستان کے مسلمانوں نے بھی غیروں کے طریقۂ کار کو دیکھتے ہوئے نکاح کو بہت مشکل بنا دیا ہے۔ اہلِ ثروت اپنی بیٹیوں کی شادیوں میں اس قدر فضول خرچی کرتے ہیں کہ انھیں دیکھ کر متوسط طبقے والے بھی شادی بیاہ میں رونقِ محفل بڑھانے کے لیے فضول پیسے لگانے سے گریز نہیں کرتے چاہے بھلے وہ پیسے سودی قرض پر لینے پڑیں۔ ایسے میں غریب طبقے کے لیے اپنی بیٹی کی شادی اتنی مشکل ہوگئی ہے کہ بیٹی کے پیدا ہوتے ہی غریب انسان فکرمند ہو جاتا ہے۔

عام انسانی حقوق کے تعلق سے سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعلیمات کو عملی جامہ پہنانا معاشرے میں امن وسکون کی بحالی کے لیے اشد ضرورت ہے۔ اسی میں انسانیت کی بقا ہے اور انسانوں کے لیے نجات کا سامان ہے۔

نواں باب

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عام انسانی برائیوں کو جرم ٹھہرا کر اور جرائم پر حدود وتعزیرات فرما کر امنِ عالم کو یقینی بنایا

معاشرے کا سماجی ڈھانچہ پانچ چیزوں پر اُستوار ہوتا ہے۔ اگر ان میں سے کسی ایک میں خلل آجائے تو اس سے معاشرے کی بنیادیں متزلزل ہو جاتی ہیں، اس کا امن وسکون غارت ہو جاتا ہے اور معاشرے کا ہر فرد کرب اور بے چینی کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ پانچ

چیزیں یہ ہیں: (۱) عقیدے کا تحفظ (۲) نسب کا تحفظ (۳) عزت وآبرو کا تحفظ (۴) جان کا تحفظ (۵) املاک کا تحفظ۔ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جو نظام بنایا وہ ان پانچوں چیزوں کے تحفظ کو بہت اہمیت دیتا ہے اور ان کی حفاظت کے لیے اسلامی معاشرے کے ہر فرد کی صحیح اور حقیقی تربیت کرتا ہے۔ وہ اُن کے ضمیر کو زندہ کرتا ہے، ان کی معنوی روح کو بلند کرتا ہے، ان میں روحانی اور اخلاقی اقدار کی عظمت پیدا کرتا ہے، ان میں اُلفت ومحبت، اِیثار وقربانی اور باہمی اکرام واحترام کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔

پیغمبرِ امن صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جس معاشرے کی تشکیل دی حقیقت میں وہی ایک مثالی معاشرہ ہے، جس میں امن وامان اور عدل وانصاف کا دور دورہ تھا۔ ہماری اسلامی تاریخ کا ابتدائی دور ان مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔ ہم پر ایسا دور بھی گزرا ہے جب قاضی صاحب مہینوں عدالت لگائے بیٹھے رہتے تھے اور ایک مقدمہ بھی ان کے یہاں پیش نہیں ہوتا تھا، عورت تنہا سفر کرتی تھی اور اسے اللہ کی ذات کے سوا کسی کا خوف نہ ہوتا تھا، کسی کی مجال نہ تھی کہ اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھے۔

یہ راحت وسکون، یہ امن اور چین اسلامی تعزیرات اور اسلامی تعلیم وتربیت کا نتیجہ تھا۔ ہر معاشرے میں کچھ مریض نفوس بھی ہوتے ہیں جن پر تربیت ونصیحت کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ وہ صرف سختی کی زبان جانتے ہیں اور انھیں جرائم سے صرف حدود اور عقوبات ہی روک سکتی ہیں۔ معاشرے میں ایسے افراد کی مثال جسم کے ان مریض اعضا کی سی ہے جن کے علاج کے لیے ٹیکے لگانے اور آپریشن کرنے کی ضرورت پڑتی ہے جب کہ اس کے ٹھیک ہونے کی اُمید ہو اور بیماری اپنے ابتدائی مرحلے میں ہو، لیکن اگر کوئی عضو گل سڑ جائے تو اسے کاٹ کر جسم سے الگ کیے بغیر چارہ نہیں رہتا، تا کہ اس کا زہر دوسرے اعضا تک سرایت

کر کے پورے جسم کی ہلاکت کا سبب نہ بنے۔ اسلامی حدود اور تعزیرات کا مقصد بس انھی معاشرتی مریضوں کا علاج ہے، تاکہ وہ صحت یاب ہو کر معاشرے کے صحت مند افراد بن سکیں اور ایک صاف ستھرا اسلامی معاشرہ قائم رہے۔

کسی فرد کے عقیدہ، اس کی عزت، اس کی جان، اس کی عقل اور اس کے مال پر کسی قسم کی دست درازی اسلام کی نظر میں بہت بڑا جرم ہے جس سے معاشرتی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے، اس لیے اس پر سخت اقدامات تجویز کیے گئے تاکہ مجرم کو اِرتکابِ جرم سے باز رکھا جائے اور معاشرے سے فساد کا مادہ ختم کر دیا جائے۔ اِسلامی معاشرے میں جب کسی شخص کو اس کا نفس اور شیطان کسی جرم کے اِرتکاب پر آمادہ کرے گا تو وہ اِرتکابِ جرم سے پہلے بار بار پاداشِ عمل کو سوچنے پر مجبور ہوگا اور ہوش میں آ کر اس غلط ارادے کو عملی جامہ پہنانے سے باز رہے گا۔ ہر وہ جرائم جو معاشرے سے امن وسکون کے خاتمے کا سبب بن سکتے ہیں سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اُن پر پابندی لگائی، ان کی شناعت بیان فرمائی، بڑے جرائم پر حدود و تعزیرات مرتب کیے یا پھر اخروی عذاب کا ذکر فرمایا۔

پیغمبر امن صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قتل ناحق کو بڑا جرم قرار دیا

سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی دنیا میں آمد سے قبل دنیا جن سنگین جرائم کی مرتکب تھی ان میں سے ایک بہت بڑا جرم یہ تھا کہ انھیں کسی انسان کا ناحق قتل کرنا بالکل گراں نہیں گزرتا تھا۔ ایک بار جنگ چھڑ گئی تو اب کتنے لوگوں کی جان لینے کے بعد تھمے گی یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی کب کون کس کی گردن مار دے گا اس بات کی بھی کوئی ضمانت نہیں تھی۔ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کسی شخص کو ناحق قتل کرنا جرمِ عظیم قرار دیا، اس پر مرتب ہونے والی وعیدوں کا ذکر فرمایا اور دنیا میں بھی اس کے لیے قصاص کا

قانون نافذ فرمایا۔

ایک جان کا قتل پوری انسانیت کے قتل کے برابر ہے

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو عزت وعظمت عطا فرمائی ہے اور چوں کہ کسی انسان کا ناحق خون بہانا اس کی تذلیل ہے، لہٰذا کسی ایک فردِ انسانی کی تذلیل کرنے والا ساری انسانیت کی تذلیل کرنے کا مجرم قرار پائے گا۔ قرآنِ مقدس نے ایک جان کے قتل کو ساری انسانیت کے قتل کے مترادف قرار دیا ہے۔ فرمانِ قرآن ہے:

مَنۡ قَتَلَ نَفۡسًۢا بِغَيۡرِ نَفۡسٍ اَوۡ فَسَادٍ فِى الۡاَرۡضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيۡعًا۔ (سورۂ مائدہ، آیت:۵)

ترجمہ: جس نے کوئی جان قتل کی بغیر جان کے بدلے یا زمین میں فساد کیے تو گویا اس نے سب لوگوں کو قتل کیا۔ (کنزالایمان)

اس آیت سے اندازہ کریں کہ قتلِ ناحق کو کس قدر سنگین جرم قرار دیا گیا کہ ایک خونِ ناحق ساری کائنات کے خونِ ناحق کے برابر قرار دیا گیا ہے۔

مسلمان کی پہچان یہ ہے کہ وہ ناحق کسی کا قتل نہیں کرتا

اللہ کے مخصوص بندوں کی قرآن مقدس میں متعدد صفات بیان کی گئی ہیں انھی میں سے ایک صفت یہ بھی ہے کہ اللہ کے مخصوص اور مقرب بندے کبھی کسی کا ناحق قتل کر ہی نہیں سکتے۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَلَا يَقۡتُلُوۡنَ النَّفۡسَ الَّتِىۡ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالۡحَـقِّ۔ (سورۂ فرقان، آیت:۶۸)

ترجمہ: اور اس جان کو جس کی اللہ نے حرمت رکھی ناحق نہیں مارتے۔ (کنزالایمان)

اس لیے کہ مسلمان جس پیغمبر کی اطاعت کرتے ہیں انھوں نے جانوروں کو بھی

ناحق ستانے پر پابندی لگائی ہے۔امنِ عالم کے قیام کے لیے قتلِ ناحق پر پابندی سب سے اہم ضرورت ہے اسی لیے اس آیۂ مقدسہ میں اسے عبادُ الرحمٰن کی صفات میں شمار کرایا گیا ہے۔جس کسی کو عباد الرحمٰن کے زمرے میں اپنا شمار کرانا ہے اسے اپنے آپ کو ضرور اس کام سے روکنا ہوگا۔

قتلِ ناحق کا شمار سب سے بڑے گناہوں میں

گناہ اور جرم کے بھی مختلف درجات ہیں ان میں جو سب سے بڑے درجے کے گناہ اور جرم ہیں ان میں سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قتلِ ناحق کو شمار کیا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اَکْبَرُ الْکَبَائِرِ الْاِشْرَاکُ بِاللّٰہِ وَقَتْلُ النَّفْسِ وَعُقُوْقُ الْوَالِدَیْنِ وَقَوْلُ الزُّوْرِ۔ (صحیح البخاری، حصہ نہم، ص:۳)

ترجمہ: کبیرہ گناہوں میں سب سے بڑے گناہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا، کسی جان کو (ناحق) قتل کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا اور جھوٹی شہادت دینا ہے۔

اس حدیثِ پاک میں اکبر الکبائر یعنی سب سے بڑے جرائم کا شمار کرایا گیا۔ان میں دوسرے مقام پر قتلِ نفس کا ذکر ہے۔اس سے اس جرم کی سنگینی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

قتل کرتے وقت قاتل مومن نہیں ہوتا

پیغمبرِ امن صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جس معاشرے کی تشکیل فرمائی اس کا تربیت یافتہ کبھی کسی کو ناحق خراش پہنچانا بھی پسند نہیں کرے گا چہ جائے کہ وہ ناحق کسی جان کا قتل کر بیٹھے۔اسی لیے آقائے رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قتلِ ناحق کو مومنانہ کردار کے خلاف

کام قرار دیا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لَا يَقْتُلُ الْقَاتِلُ حِيْنَ يَقْتُلُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ۔ (مجمع الزوائد، حصہ ہفتم، ص:۲۹۵)

ترجمہ: جس وقت قاتل (کسی کو ناحق) قتل کرتا ہے تو وہ مومن نہیں ہوتا۔

ناحق قتل کرنے والے کی مغفرت نہیں ہوگی

قیامت کے دن جب حساب و کتاب کا سلسلہ شروع ہوگا تو بہت سے ایسے مجرمین ہوں گے جنھیں اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے فضل سے معاف فرمادے گا، کثیر تعداد ایسوں کی ہوگی جنھیں سرورِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شفاعت سے معاف فرمادے گا لیکن بہت سے ایسے بدنصیب بھی ہوں گے جو ان دونوں مہربانیوں سے محروم ہوں گے۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

كُلُّ ذَنْبٍ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّغْفِرَهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِلَّا مَنْ مَّاتَ مُشْرِكًا اَوْ قَتَلَ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا۔ (مجمع الزوائد، حصہ ہفتم، ص:۲۹۶)

ترجمہ: ہر گناہ کے بارے میں امید ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کو معاف فرمادے، سوائے اس شخص کے جو مشرک ہوکر مرا ہو یا جس نے کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کیا ہو۔

مشرک ہوکر مرا تو ابد الآباد کے لیے جہنم میں جائے گا اور قتلِ ناحق کیا تب بھی اللہ کی رحمت اور سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شفاعت سے محروم ہوکر جہنم کے عذاب کا مزا

ضرور چکھے گا۔

ننگی تلوار لینے دینے سے بھی منع فرمایا

کسی کے قتلِ ناحق کی شناعت وقباحت کا اندازہ اس بات سے بھی لگا سکتے ہیں کہ سرکارِ ابدقرار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ننگی تلوار لینے دینے سے منع فرمایا ہے۔ یہ اس وجہ سے کہ کبھی غلطی سے کسی کو تکلیف پہنچ سکتی ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں:

نَهٰى رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يُّتَعَاطَى السَّيْفُ مَسْلُوْلًا۔ (سنن ترمذی، حصہ چہارم، ص: ۴۶۴)

ترجمہ: رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ننگی تلوار لینے دینے سے منع فرمایا۔

سبحان اللہ! جس رسول کی تعلیم میں اس بات سے بھی ممانعت ہو جس سے کسی کو ایذا پہنچنے کا امکان ہو ان کے نزدیک کسی جان کو ناحق قتل کرنا کتنا عظیم جرم ہوگا اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ وہ امن کے داعی ہیں، ہر اس کام سے منع فرماتے ہیں جو امن کے خلاف ہو۔

جانوروں کے ناحق قتل کا بھی حساب دینا ہوگا

انسانوں کا قتلِ ناحق تو جرمِ شنیع ہے ہی پیغمبرِ امن صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تو جانوروں کو بھی ناحق قتل کرنے سے منع فرمایا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

جس نے کسی چڑیا یا اس سے بھی چھوٹے کسی جانور کو بے مقصد اور ناحق قتل کیا اللہ تعالیٰ بروزِ قیامت اس کے بارے میں اس سے باز پرس فرمائے گا۔ عرض کی گئی: یا رسول

اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیک وسلم! اس کا حق کیا ہے؟ فرمایا: اس کا حق یہ ہے کہ اسے ذبح کر کے کھالو، ایسا نہ کرو کہ اس کا سر کاٹ کر اس کو پھینک دو۔ (سنن النسائی، حصہ ہفتم، ص:۲۳۹)

جن جانوروں کے کھانے کو حلال قرار دیا گیا ہے انھیں اس طرح سے ذبح کرنا کہ کم سے کم تکلیف ہو اور ذبح کرنے کا مقصد کھانا ہو، تفریح طبع نہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے ورنہ اس کی بھی ممانعت ہے۔ وہ پیغمبر جنھوں نے چھوٹے سے چھوٹے جانوروں کو بھی ناحق قتل کرنا ممنوع قرار دیا وہ کسی انسان کے ناحق قتل کو کس طرح پسند کر سکتے ہیں۔

قتلِ ناحق پر قصاص کا حکم

قتلِ ناحق سے زمین کو پاک کرنے اور اس پر بالکلیہ پابندی لگانے کے لیے پیغمبرِ امن صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حکمِ قرآن کے مطابق قصاص کو اسلامی قانون قرار دیا۔ قصاص دورِ جاہلیت میں بھی رائج تھا لیکن اس کے لیے کسی قاعدے اور ضابطے کی پابندی نہیں تھی، جو زور آور ہوتے وہ کمزوروں پر ظلم ڈھاتے، کسی ذی اثر اور طاقتور قبیلے کا فرد قتل کر دیا جاتا تو اس کا بدلہ صرف قاتل ہی سے نہیں بلکہ اس کے قبیلے کے اکثر افراد یا پھر پورے قبیلے والوں سے لیا جاتا، معصوم اور بے گناہ افراد کو بھی قتل وخون ریزی کی آگ میں جھونک دیا جاتا، اس طرح اپنے جوشِ انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کیا جاتا۔ کہیں پر ایسا دستور تھا کہ کوئی عورت قتل کرتی تو اس کے بدلے میں اس کے قبیلے کے کسی مرد کا قتل کیا جاتا، کوئی غلام قتل کرتا تو اس قبیلے کے کسی آزاد کا قتل کیا جاتا اور کوئی مرد قتل کرتا تو اس کے بدلے میں دو مردوں کا قتل کیا جاتا۔ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قصاص کے تعلق سے بھی رائج سارے ظالمانہ دستوروں کو ختم کیا اور قصاص کا بھی ایسا عدل پر مبنی نظام قائم کیا جو امنِ عالم کی بحالی میں بہت مؤثر ہے۔

فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ (سورۂ بقرہ، آیت:۱۷۸)

ترجمہ: اے ایمان والو! تم پر فرض ہے کہ جو ناحق مارے جائیں ان کے خون کا بدلہ لو، آزاد کے بدلے آزاد اور غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت۔

اس آیت میں بتایا گیا جو قتل کرے گا وہی قتل کیا جائے گا، خواہ آزاد ہو یا غلام، مرد ہو یا عورت۔ اہلِ جاہلیت کا یہ طریقہ ظلم ہے جو ان میں رائج تھا کہ آزادوں میں لڑائی ہوتی تو وہ ایک کے بدلے دو کو قتل کرتے، غلاموں میں ہوتی تو بجائے غلام کے آزاد کو مارتے، عورتوں میں ہوتی تو عورت کے بدلے مرد کو قتل کرتے اور محض قاتل کے قتل پر اکتفا نہ کرتے۔

قصاص کا یہ نظام قتل و غارت گری کو دنیا سے ختم کرنے میں اس قدر مؤثر ہے کہ کوئی بھی شخص کسی کا قتل کرنے کا ارادہ کرے گا تو اس کی نگاہوں کے سامنے اس کا انجامِ بد ہوگا کہ اس کارِ شنیع کے بدلے وہ اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا، سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نظام میں کسی صاحبِ فضل وکمال کے لیے یا کسی صاحبِ اثر ورسوخ کے لیے بھی کوئی لچک نہیں ہے۔ قتل کا ارادہ کرنے والا اپنے انجامِ بد کے خوف سے اس فعلِ قبیح سے اپنا ہاتھ روک لے گا اور خونِ ناحق کا دروازہ بند ہو جائے گا۔

اسی کی جانب اس فرمانِ باری تعالیٰ میں اشارہ ہے:

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ○

(سورۂ بقرہ، آیت:۱۷۹)

ترجمہ: اور خون کا بدلہ لینے میں تمھاری زندگی ہے اے عقل مندو کہ تم کہیں بچو۔

کیونکہ قصاص مقرر ہونے سے لوگ کسی کا ناحق قتل کرنے سے باز رہیں گے اور اس

طرح جانیں بچیں گی۔

خون کے بارے میں قیامت کے دن سب سے پہلے فیصلہ ہوگا

قتلِ ناحق پر قصاص اس وقت لیا جائے گا جب اسلامی حکومت ہو اور اسلامی قوانین کے اعتبار سے فیصلہ ہو۔ اگر کہیں پر اسلامی حکومت نہ ہو یا کسی وجہ سے قتلِ ناحق کرنے والا قانونی گرفت سے بچ نکلے تب بھی اللہ کی گرفت سے بچ نہیں سکتا ہے۔ وہ تو قیامت کے دن ذرے برابر ظلم کا بھی فیصلہ فرمانے والا ہے۔ حدیثِ پاک میں فرمایا گیا کہ قیامت کے دن سب سے پہلے قتلِ ناحق کا حساب لیا جائے گا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: اَوَّلُ مَا یُقْضٰی بَیْنَ النَّاسِ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ فِی الدِّمَاءِ۔

(صحیح البخاری، حصہ نہم، ص:۲)

ترجمہ: قیامت کے دن لوگوں کے درمیان سب سے پہلے خونوں کے بارے میں فیصلہ کیا جائے گا۔

اور پیچھے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت گزر چکی ہے کہ ہر گناہ بخشا جا سکتا ہے سوائے قتلِ ناحق کے کہ جس کسی نے قتلِ ناحق کیا ہوگا اسے جہنم کا مزا چکھنا ہی ہوگا۔

پیغمبرِ امن صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آخری وصیت

خطبۂ حجۃ الوداع سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد فرمایا ہوا ہمہ جہت خطبہ ہے۔ اس خطبے میں سرکارِ ابد قرار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خون کی حرمت کی کس قدر تاکید فرمائی اس کا اندازہ اس روایت کے الفاظ اور اس کے اندازِ بیان سے لگایا جا سکتا ہے:

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنے اونٹ پر سوار ہوئے، ایک شخص اس کی لگام کو پکڑے ہوئے تھے۔ آپ نے لوگوں سے سوال فرمایا: آج کون سا دن ہے؟

راویِ حدیث کہتے ہیں کہ ہم خاموش تھے، ہمیں ایسا لگا کہ ہوسکتا ہے اس کا کوئی اور نام حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بیان فرمائیں گے۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خود ہی فرمایا کہ کیا یہ یوم النحر نہیں ہے؟ ہم نے کہا: ہاں۔

آپ نے فرمایا: یہ کون سا مہینہ ہے؟ ہم خاموش تھے، ہمیں ایسا لگا کہ ہوسکتا ہے اس کا کوئی اور نام حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بیان فرمائیں گے۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خود ہی فرمایا: کیا یہ ذی الحجہ نہیں ہے؟ ہم نے کہا: ہاں یہ ذی الحجہ ہے۔ آپ نے فرمایا:

فِاِنَّ دِمَائَکُمْ وَاَمْوَالَکُمْ وَاَعْرَاضَکُمْ عَلَیْکُمْ حَرَامٌ کَحُرْمَةِ یَوْمِکُمْ هٰذَا فِیْ شَهْرِکُمْ هٰذَا فِیْ بَلَدِکُمْ هٰذَا اِلٰی یَوْمِ تَلْقَوْنَ رَبَّکُمْ۔

(صحیح البخاری، حصہ اول، ص: ۲۴)

ترجمہ: بے شک تمھارے خون، تمھارے اموال اور تمھاری عزتیں تم پر ویسی ہی حرام ہیں جس طرح کہ تمھارے اس دن کی حرمت اس مہینے اور اس شہر میں ہے یہاں تک کہ تم اپنے رب سے ملاقات کرو۔

اس حدیث میں جان و مال اور عزت وآبرو کو تین حرمتوں کے ساتھ ملا کر بیان فرمایا۔ حرمت والے شہر میں حرمت والے مہینے میں حرمت والے دن کی جس قدر حرمت ہے، اسی قدر ایک انسان کے خون کی حرمت ایک انسان کے لیے ہے۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مظالم کو ختم فرمایا

جس دور میں پیغمبر رحمت سرکارِ ابد قرار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے اس دور میں ظلم وزیادتی بامِ عروج پر تھی۔ ہر بالا دست زیر دستوں پر ظلم وستم کے پہاڑ ڈھانا اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتا تھا۔ صاحبانِ حق اپنے حقوق سے محروم تھے اور ان کے حقوق کے لیے آواز اٹھانے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ ایسے ماحول میں سرزمینِ عرب میں امن وامان کا داعی جلوہ گر ہوتا ہے، کہ اس کی وجہ سے مظلوموں کو ظلم سے رہائی ملتی ہے، صاحبانِ حق کو ان کا حق ملتا ہے اور دنیا امن وسکون کا گہوارہ بن جاتی ہے۔

برائیوں پر روک لگانے اور انھیں نیست ونابود کرنے کے لیے آقائے نعمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جو سعیِ بلیغ فرمائی وہ آپ کا خاصہ تھا۔ آپ نے ہر جرم پر پابندی لگانے کے لیے ان کی شناعت اور ان پر مرتب ہونے والے عذابوں کا ذکر فرمایا۔ کسی پر ظلم ہو یہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ہرگز پسند نہیں اس لیے آپ نے ظلم وزیادتی کی روک تھام کے لیے اس کی مذمت فرمائی اور اس پر ہونے والے عذاب کا ذکر فرمایا تا کہ ظلم کا ارادہ کرنے والا اپنا انجامِ بد سوچ کر ظلم سے باز آجائے۔

قیامت کے دن ہر ظلم کا بدلہ دیا جائے گا

دنیا میں کوئی اپنی بالا دستی کی وجہ سے کسی پر ظلم کر کے یا کسی کو تکلیف پہنچا کر سوچتا ہو کہ وہ بچ جائے گا۔ اسے یاد رکھنا چاہیے کہ روزِ قیامت وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی گرفت سے نہیں بچ سکتا ہے۔ قیامت کے دن ہر ظالم کو اس کے ظلم کا بدلہ دیا جائے گا۔

حضرتِ ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَتُؤَدُّنَّ الْحُقُوقَ إِلٰى أَهْلِهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ، حَتّٰى يُقَادَ لِلشَّاةِ الْجَلْحَاءِ

مِنَ الشَّاةِ الْقَرْنَاءِ۔ (صحیح مسلم، حصہ چہارم، ص:۱۹۹۷)

ترجمہ: تمھیں روزِ قیامت حق والوں کے حق ضرور ادا کرنے ہوں گے حتّٰی کہ بغیر سینگوں والی بکری کو سینگوں والی بکری سے بدلہ دلوایا جائے گا۔

جانور شرعی احکام کے مکلف نہیں ہوتے ہیں لیکن پھر بھی قیامت کے دن انسانوں کو ظلم کا انجام دکھانے کے لیے یہ منظر پیش کیا جائے گا۔ حضرت ابنِ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ روزِ قیامت جب جانوروں اور چوپایوں کو اٹھایا جائے گا اور انھیں ایک دوسرے سے بدلہ دلایا جائے گا، اگر سینگ والے نے بے سینگ والے کو مارا ہوگا تو اسے بدلہ دلایا جائے گا، اس کے بعد وہ سب خاک کر دیے جائیں گے۔ یہ دیکھ کر کافر تمنّا کرے گا کہ کاش میں بھی خاک کر دیا جاتا۔ اسی کا ذکر قرآنِ مقدس کی اس آیۂ مقدسہ میں ہے:

يَوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدَاهُ وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا۔

(سورۂ نبا، آیت:۴۰)

ترجمہ: جس دن آدمی دیکھے گا جو کچھ اس کے ہاتھوں نے آگے بھیجا اور کافر کہے گا: ہائے میں کسی طرح خاک ہو جاتا۔

کہیں ظلم کی وجہ سے نیکیاں بے کار نہ ہو جائیں

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبیِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ كَانَتْ عِنْدَهٗ مَظْلِمَةٌ لِّاَخِيْهِ فَلْيَتَحَلَّلْهُ مِنْهَا، فَاِنَّهٗ لَيْسَ ثَمَّ دِيْنَارٌ وَّلَا دِرْهَمٌ، مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّؤْخَذَ لِاَخِيْهِ مِنْ حَسَنَاتِهٖ، فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ حَسَنَاتٌ اُخِذَ مِنْ سَيِّئَاتِ اَخِيْهِ فَطُرِحَتْ عَلَيْهِ۔ (صحیح البخاری، حصہ ہشتم، ص:۱۱۱)

ترجمہ: جس کسی نے اپنے بھائی پر ظلم کیا ہو تو اسے چاہیے کہ اس سے معافی تلافی کر لے اس لیے کہ قیامت کے دن درہم و دینار نہیں ہوگا، تو مظلوم کو ظالم کی نیکیاں دے دی جائیں گی۔ اگر اس کے پاس نیکیاں نہیں ہوں گی تو اس مظلوم کے گناہ اس کے سر سے اتار کر اس ظالم کے سر پر ڈال دیے جائیں گے۔

کسی شخص نے دنیا میں نیکیاں کی ہیں لیکن کسی کو ناحق ستایا بھی ہے تو اس ناحق ستانے کی وجہ سے قیامت کے دن اس کی نیکیاں اس کے ظلم کے بدلے میں اس مظلوم کو دے دی جائیں گی۔ اگر اس نے دنیا میں نیکیاں نہیں کی تھیں تو اُس مظلوم کے گناہ بھی اُٹھا کر اِس ظالم کے سر ڈال دیے جائیں گے اور بالآخر اسے اُس کے کیے کا عذاب بھی چکھنا ہوگا۔

معمولی حق تلفی پر بھی جہنم واجب

معمولی حق تلفی کو کوئی چھوٹا موٹا گناہ نہ سمجھے بلکہ حق تلفی کے معاملے میں معمولی باتوں پر بھی سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پابندی عائد فرمائی ہے۔

حضرت ابو امامہ ایاس بن ثعلبہ حارثی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے جھوٹی قسم کے ذریعے کسی مسلم شخص کا حق غصب کر لیا، اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے جہنم کی آگ واجب کر دی اور اس پر جنت حرام فرما دی۔ ایک آدمی نے کہا: اے اللہ کے رسول! خواہ وہ معمولی سی چیز ہو؟ آپ نے فرمایا: اگر چہ وہ پیلو کے درخت کی ایک شاخ ہی ہو۔ (صحیح مسلم، حصہ اول، ص: ۱۲۲)

ظلم و زیادتی کو آقائے کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کس قدر شنیع قرار دیا ہے اس کا اندازہ اس روایت سے لگا سکتے ہیں کہ پیلو کے درخت کی شاخ جیسی معمولی چیز کو بھی اگر کسی نے کسی سے ناحق لے لیا تو اس پر جنت حرام اور اس کے لیے جہنم واجب ہے۔

ظلم قیامت کے دن مفلس بنا دے گا

دنیا کی زندگی چند سالوں کی ہوتی ہے، یہ زندگی اگر کسی نے تنگدستی کے ساتھ بھی گزار لی تو اس کے روز وشب کسی طرح گزر جائیں گے۔ کچھ لوگ آخرت میں بھی تنگدست اور مفلس ہوں گے۔ ان مفلسوں کا ذکر اس حدیث میں دیکھیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہے؟ انھوں نے کہا: ہم میں مفلس وہ شخص ہے جس کے پاس درہم و دینار اور مال ومتاع نہ ہو۔ آپ نے فرمایا: یقیناً میری امت کا مفلس وہ ہے جو روزِ قیامت نماز، روزے اور زکوٰۃ کے ساتھ آئے گا اور وہ اس طرح آئے گا کہ اس نے کسی کو گالی دی ہوگی، کسی پر بہتان لگایا ہوگا، کسی کا مال کھایا ہوگا، کسی کا خون بہایا ہوگا اور کسی کو مارا ہوگا۔ پس اس کو اس کی نیکیاں دے دی جائیں گی اور اگر اس کی نیکیاں دوسروں کے حقوق ادا ہونے سے پہلے ختم ہو جائیں گی تو اُن کے گناہ اِس کے سر ڈال دیے جائیں گے اور پھر اِسے جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔ (صحیح مسلم، حصہ چہارم، ص:۱۹۹۷)

دنیا آخرت کی کھیتی ہے، اس میں ہم اپنے لیے ٹوٹی پھوٹی نیکیاں جمع کرتے ہیں تاکہ آخرت میں کام آجائیں۔ اگر ہم نے دنیا میں لوگوں کی حق تلفی کی ہے اور ان سے معافی تلافی نہیں کی ہے تو قیامت کے دن ان کے حقوق کی ادائیگی کے لیے ہماری نیکیاں انھیں دے دی جائیں گے اور پھر بھی حقوق باقی رہ گئے ہیں تو ان کے گناہ ہمارے سر پر ڈال دیے جائیں گے۔ اس لیے ہمیں حقوق کے معاملے میں بہت ڈرنا چاہیے تاکہ قیامت کے دن مفلس ہونے سے بچ جائیں۔ دنیا میں اگر کوئی مفلس ہے تو اس کا تعاون کرنے والے بھی بہت لوگ ہیں لیکن اگر آخرت میں کوئی مفلس ہو گیا تو وہاں کوئی تعاون نہیں ہوگا۔

ان احادیث مبارکہ میں سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ظلم اور حق تلفی کو سنگین جرم قرار دیا ہے اور یہ بات واضح فرمادی کہ دنیا میں اگر کسی نے کسی پر ظلم کیا یا کسی کی حق تلفی کی تو وہ ایسا جرم ہے کہ آخرت میں اس کو اس کی سزا ملنی ہی ملنی ہے۔

کسی کی عزت وآبرو سے کھلواڑ ناپسندیدہ عمل ہے

عزت وآبرو ہر انسان کو اسی طرح عزیز ہوتی ہے جس طرح وہ مال ودولت کو عزیز رکھتا ہے بلکہ ایک باغیرت انسان کے لیے عزت وآبرو مال ودولت سے بھی بڑھ کر ہے کہ وہ اپنی جان کی حفاظت پر اپنی عزت وآبرو کی حفاظت کو ترجیح دیتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ماڈرن طبقے سے فیشن کے نام پر عزت داری ختم ہوتی جارہی ہے لیکن اب بھی دنیا میں غیرت مندوں کی تعداد بہت ہے۔

سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نظام میں کسی کی عزت وآبرو کے ساتھ کھلواڑ کرنا یا کسی کے ساتھ ایسا معاملہ کرنا جو اس کے لیے ہتکِ عزت کا باعث ہو شنیع جرم ہے۔ اس سے سختی سے منع کیا گیا ہے اور ہر کسی کی عزت وآبرو کو محفوظ کیا گیا ہے۔ کسی کا مذاق اڑا کر، کسی کی عیب جوئی کرکے، کسی کی غیبت کرکے یا کسی کے راز کا افشا کرکے اس کی عزت کے ساتھ کھلواڑ کرنا اسلام کی نظر میں ہرگز پسند نہیں ہے۔

مذاق اڑانے کی ممانعت:

ہنسی مذاق ایک محدود دائرے میں رہ کر جائز ہے۔ خود سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ سے بھی اس کا ثبوت ہے۔ لیکن کسی کو ہنسی مذاق کا اس طرح نشانہ بنانا کہ اس کی ہتکِ شان ہوجائے یہ اسلام میں جائز نہیں ہے۔ خصوصیت کے ساتھ ایسی باتیں جو اس کے اندر عیب اور کمی کی منزل میں ہیں انھیں لے کر مذاق بنانا تو بہت بڑا جرم ہے۔

فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ۔ (سورۂ حجرات، آیت:۱۱)

ترجمہ: اے ایمان والو! نہ مرد مَردوں سے ہنسیں، عجب نہیں کہ وہ ان ہنسنے والوں سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں عورتوں سے، دور نہیں کہ وہ ان ہنسنے والیوں سے بہتر ہوں۔

یہ مذاق بنانا کئی اعتبار سے ہوسکتا ہے۔ کسی کی شکل وصورت کو لے کر، کسی کے حسب ونسب کو لے کر، کسی کے اعمال کو لے کر یا اس طرح کی کوئی بھی بات جسے سن کر سننے والا عار محسوس کرے اس سے منع فرمایا گیا۔

طعن وتشنیع کی ممانعت:

طعن وتشنیع کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کو اس کے کسی قول یا فعل کو لے کر عار دلائی جائے۔ اسے بھی نظامِ مصطفیٰ میں ناپسند کیا گیا ہے۔

فرمان قرآن ہے: وَلَا تَلْمِزُوْۤا اَنْفُسَكُمْ۔ (ایضاً)

ترجمہ: اور آپس میں طعنہ زنی نہ کرو۔

خصوصیت کے ساتھ اگر کسی مسلم نے اپنے گناہوں سے توبہ کر لی ہے تو اُسے اس گناہ کے تعلق سے عار دلانا اور اس گناہ پر طعن وتشنیع کرنا بہت سخت جرم ہے۔ اسے ناپسند اسی لیے کیا گیا ہے کہ اس میں ہتکِ عزت ہے۔

کسی کے برے نام نہ رکھے جائیں:

نام ہر انسان کی شخصیت کی علامت اور پہچان ہوتے ہیں اور ہر کوئی چاہتا ہے کہ اس کا نام اچھے الفاظ میں رکھے جائیں۔ عام طور پر لوگ ہنسی مذاق میں یا پھر کسی شخص سے غایتِ

نفرت کی بنیاد پر اسے برے ناموں سے یاد کرنے لگتے ہیں۔اس سے منع فرمایا گیا:

وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقٰبِ۔ (ایضًا)

ترجمہ: اور ایک دوسرے کے بُرے نام نہ رکھو۔

کسی مسلمان کو کُتّا یا گدھا یا سور کہنا بھی اسی میں داخل ہے۔اسی طرح کوئی پست قد ہے یا بلند قد ہے یا سیاہ فام ہے یا چلنے پھرنے، بات چیت وغیرہ میں کوئی عیب ہے تو اس کے اعتبار سے اس کا کوئی نام رکھ دیا جاتا ہے یہ بھی جائز نہیں ہے۔مختصر یہ کہ کسی مسلمان کو کسی ایسے لفظ سے پکارنا جس میں اس کی شان گھٹے جائز نہیں ہے۔

کسی کی تحقیر و تذلیل شنیع جرم ہے

کسی کی تحقیر و تذلیل اور اس کی عزت کے ساتھ کھلواڑ کرنا معاشرے میں دیگر برائیوں اور فسادات کو جنم دینے والا عمل ہے اس لیے سرکارِ ابد قرار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس فعلِ قبیح کی شناعت اور برائی بیان کرتے ہوئے اس پر پابندی لگائی۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اَلرِّبَا اِثْنَانِ وَسَبْعُوْنَ بَابًا اَدْنَاهَا مِثْلُ اِتْيَانِ الرَّجُلِ اُمَّهٗ وَاِنَّ اَرْبَى الرِّبَا اِسْتِطَالَةُ الرَّجُلِ فِيْ عِرْضِ اَخِيْهِ۔ (المعجم الاوسط للطبرانی، حصہ ہفتم، ص:١٥٨)

ترجمہ: سود کے بہتر دروازے ہیں، ان میں سب سے ہلکے درجے کا سود ماں کے ساتھ بدکاری کرنے کے برابر ہے اور سب سے بڑا سود اپنے کسی مسلمان بھائی کی عزت پر زبان درازی کرنا ہے۔

کسی کی عزت و آبرو کے ساتھ کھلواڑ کرنے کی شناعت کا اندازہ اس حدیثِ پاک

سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ جس جرم کا سب سے ادنیٰ درجہ ماں کے ساتھ زنا کاری کے برابر ہے، کسی مسلمان کی عزت وآبرو کے ساتھ کھلواڑ کرنا اس جرم کے سب سے اعلیٰ درجے کے برابر ہے۔

عیب اور نقص کس کے اندر نہیں ہے، اگر ہم کسی کے عیب سے واقف ہیں تو سب سے پہلے تو ہمیں یہ چاہیے کہ ہم اسے چھپالیں۔ اگر بتانا ہی چاہتے ہیں تو خود اسے بتائیں اور کہیں کہ اپنی اصلاح کرلے اس لیے کہ اس کے عیب کی اصلاح وہی کرسکتا ہے۔ کسی اور کو بتانا صرف اسی غرض سے ہوسکتا ہے کہ ہم اس کی عزت اُچھالنا چاہتے ہیں اور کسی مسلمان کی عزت اُچھالنا کتنا بڑا جرم ہے اس کا آپ نے اندازہ کرلیا ہے۔

جس کی عزت کے ساتھ کھلواڑ ہوا اسے معلوم ہوگا تو ایک فتنہ برپا ہوسکتا ہے جس سے معاشرے کا امن وسکون غارت ہوسکتا ہے اس لیے سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اسے جرم ٹھہرا کر اس پر پابندی عائد فرمائی۔

زنا پر پابندی معاشرے میں امن کی ضمانت

ہر جان دار میں نسل کی افزائش کا سلسلہ نر اور مادہ سے چلتا ہے۔ عورت کی تخلیق بھی اسی لیے ہوئی کہ اس سے نکاح کرکے مرد قلبی تسکین حاصل کرے۔ مردوں اور عورتوں کا فطری میلان ایک دوسرے کی طرف اسی لیے ہے تاکہ رشتۂ اِزدواج سے جڑنے کے بعد یہ میلان نسل کی افزائش کا ذریعہ بنے۔

کسی مرد کا کسی عورت سے یا کسی عورت کا کسی مرد سے فائدہ حاصل کرنے کے

جواز کے لیے نکاح شرط ہے، پیغمبرِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نظام میں اس کے علاوہ کوئی اور گنجائش نہیں ہے کہ کوئی مرد کسی عورت سے یا کوئی عورت کسی مرد سے جنسی فائدہ حاصل کر سکے۔ ایک دوسری صورت باندیوں کے خریدنے کی تھی جو کہ اب ناپید ہو چکی ہے۔ بہر حال زنا کاری یعنی اپنی بیوی کے علاوہ کسی اور عورت سے یا اپنے شوہر کے علاوہ کسی اور مرد سے جنسی فائدہ حاصل کرنا نظامِ مصطفیٰ میں اتنا سنگین جرم ہے کہ اگر کسی شادی شدہ انسان نے ایسا کیا تو اسلامی قانون میں اس نے اپنے زندہ رہنے کا حق کھو دیا۔ اسے سرِ عام اس قدر سنگسار کیا جائے گا کہ وہ اپنا دم توڑ دے۔ البتہ اگر کسی غیر شادی شدہ نے کیا ہے تو اسے سو کوڑے لگائے جائیں گے۔

زنا کاری کی حد

اسلام میں حدود کے نافذ کرنے کا حکم معاشرے کو گناہوں اور سنگین جرائم سے پاک کرنے کے لیے ہے۔ زنا کاری بھی معاشرے میں ناسور کی حیثیت رکھتی ہے اس لیے اس پر بھی ایسی عبرتناک سزا معین کی گئی ہے کہ اگر کسی کے دل میں اس سنگین جرم کے ارتکاب کا خیال بھی آئے گا تو اس کے انجامِ بد کو سوچ کر وہ فوراً اپنے دل سے اس خیال کو نکال دے گا۔ قانونِ مصطفیٰ یہ ہے کہ اگر کسی شادی شدہ نے زنا کیا تو اسے سنگسار کیا جائے گا اور اگر کسی غیر شادی شدہ نے زنا کیا تو اسے سو کوڑے لگائے جائیں گے۔

سنگساری کا حکم:

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ منبر پر جلوہ افروز تھے اور آپ نے فرمایا:

إِنَّ اللهَ قَدْ بَعَثَ مُحَمَّدًا صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْحَقِّ، وَأَنْزَلَ عَلَيْهِ الْكِتَابَ، فَكَانَ مِمَّا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَةُ الرَّجْمِ، قَرَأْنَاهَا وَوَعَيْنَاهَا وَعَقَلْنَاهَا،

فَرَجَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ، وَرَجَمْنَا بَعْدَہٗ۔ (صحیح مسلم، حصہ سوم، ص: ۱۳۱۷)

ترجمہ: اللہ تبارک وتعالیٰ نے سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا۔ آپ پر جو احکام نازل ہوئے ان میں سے ایک حکم آیتِ رجم بھی ہے۔ ہم نے اسے پڑھا، یاد کیا اور سمجھا۔ تو نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے رجم فرمایا اور ہم نے بھی آپ کے بعد رجم کیا۔ (کنزالایمان)

دراصل آیتِ رجم پہلے نازل ہوئی تھی، اس کی تلاوت بھی کی جاتی تھی اور اس پر عمل بھی جاری ہوا لیکن بعد میں اس کی تلاوت منسوخ ہوگئی لیکن حکم اب بھی برقرار ہے۔ زنا کی حد میں سنگساری کا حکم جاری فرمانے کا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ اس جرم کا خاتمہ یقینی ہوگیا۔ دورِ نبوی میں دو چار واقعات ملتے ہیں کہ کوئی اس جرم کا مرتکب ہوا ہو، ان میں سے بھی بعض ذمی یہودی تھے جنھیں نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے زنا کی حد میں رجم کرنے کا حکم فرمایا۔

آج کا زمانہ جس میں زنا کاری، خصوصًا زنا بالجبر کے بڑھتے معاملات حکومتوں کے لیے تشویش ناک بنتے چلے جا رہے ہیں اور ان کے پاس اس کا کوئی حل نہیں ہے، ایسے میں کوئی حکومت اس حد کو نافذ کر کے دیکھے، زیادہ دن نہیں گزریں گے کہ معاشرہ اس جرمِ عظیم سے یقینی طور پر پاک ہوجائے گا۔

بڑی عجیب بات ہے کہ عمومًا حکومتوں کے آئین میں زنا بالجبر ہی کو جرم قرار دیا جاتا ہے، زنا بالرضا ان کے نزدیک کوئی جرم نہیں ہے۔ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے آئین کی بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں زنا کاری کے ساتھ ساتھ اس کے چھوٹے چھوٹے اسباب ودواعیات پر بھی پابندی لگائی گئی ہے۔ اس لیے کہ اس کے بغیر زنا کاری کے ناسور کا معاشرے سے خاتمہ ممکن ہی نہیں ہے۔

سو کوڑے لگانے کا حکم:

اگر کوئی غیر شادی شدہ مرد یا عورت زنا کاری میں مبتلا ہو تو اس کے لیے حکم یہ ہے کہ اسے سو کوڑے لگائے جائیں گے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۪ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ○ (سورۂ نور، آیت: ۲)

ترجمہ: جو عورت بدکار ہو اور جو مرد تو ان میں ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ اور تمھیں ان پر ترس نہ آئے اللہ کے دین میں، اگر تم ایمان لاتے ہو اللہ اور پچھلے دن پر اور چاہیے کہ ان کی سزا کے وقت مسلمانوں کا ایک گروہ حاضر ہو۔ (کنزالایمان)

یہ خطاب حُکام کو ہے کہ جس مرد یا عورت سے زنا سرزد ہو اس کی حد یہ ہے کہ اس کو سو کوڑے لگاؤ، یہ حد حُر غیر محصِن کی ہے کیوں کہ حُر محصِن کا حکم یہ ہے کہ اس کو رَجم کیا جائے جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہے۔

محصِن وہ آزاد مسلمان ہے جو مکلَّف ہو اور نکاحِ صحیح کے ساتھ صحبت کر چکا ہو خواہ ایک ہی مرتبہ۔ ایسے شخص سے زنا ثابت ہو تو رجم کیا جائے گا اور اگر ان میں سے ایک بات بھی نہ ہو مثلاً حُر نہ ہو یا مسلمان نہ ہو یا عاقل بالغ نہ ہو یا اس نے کبھی اپنی بیوی کے ساتھ صحبت نہ کی ہو یا جس کے ساتھ کی ہو اس کے ساتھ نکاحِ فاسد ہوا ہو تو یہ سب غیر محصِن میں داخل ہیں اور ان سب کا حکم کوڑے مارنا ہے۔

مرد کو کوڑے لگانے کے وقت کھڑا کیا جائے اور اس کے تمام کپڑے اتار دیے جائیں سوا تہبند کے اور اس کے تمام بدن پر کوڑے لگائے جائیں سوائے سر، چہرے اور

شرمگاہ کے۔کوڑے اس طرح لگائے جائیں کہ اَلم گوشت تک نہ پہنچے اور کوڑا متوسط درجے کا ہو۔عورت کو کوڑے لگانے کے وقت کھڑا نہ کیا جائے، نہ اس کے کپڑے اتارے جائیں۔ البتہ اگر پوستین یا روئی دار کپڑے پہنے ہوئے ہو تو اتار دیے جائیں۔ (خزائن العرفان)

سنگساری یا کوڑے لگانے کا حکم تو اس صورت میں ہے جب کہ اسلامی حکومت ہو، مرتکبِ زنا حکومت کی گرفت میں آئے اور حد نافذ کرنے کی دیگر شرطیں بھی پائی جائیں۔اگر کوئی شخص کسی وجہ سے دنیا میں حد سے بچ گیا لیکن درحقیقت وہ زنا کاری کا مرتکب ہے تو یاد رکھے کہ آخرت میں اللہ کے عذاب سے ہرگز بچ نہیں سکتا ہے۔

قیامت میں زنا کار کی سزا

قیامت کے دن زنا کار کو دوہرا عذاب دیا جائے گا۔اس کا ذکر فرماتے ہوئے قرآنِ مقدس میں ارشاد ہوا:

وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ○ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ○ (سورۂ فرقان، آیت: ۶۸،۶۹)

ترجمہ: اور بدکاری نہیں کرتے اور جو یہ کام کرے وہ سزا پائے گا۔ بڑھایا جائے گا اس پر عذاب قیامت کے دن اور ہمیشہ اس میں ذلت سے رہے گا۔

اللہ کے مخصوص بندوں کی صفات میں یہ ذکر فرمایا گیا کہ وہ کبھی زنا کاری کا ارتکاب نہیں کرتے ہیں۔اس کے بعد زنا کی سزا کے تعلق سے ذکر ہوا کہ جو کوئی زنا میں مبتلا ہو گیا اسے سزا ملے گی۔قیامت کے دن اس کے لیے دوہرا عذاب ہے کہ اس میں وہ ذلت وخواری کے ساتھ رہے گا۔

زنا کے قریب بھی مت جاؤ

نظامِ مصطفیٰ کی خصوصیت ہے کہ اس میں ان اسباب پر بھی پابندی عائد کی گئی ہے جو زنا کاری تک پہنچا سکتے ہیں۔ حکمِ قرآن ہے:

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰۤی اِنَّہٗ کَانَ فٰحِشَۃً ؕ وَسَآءَ سَبِیۡلًا ○

(سورۂ بنی اسرائیل، آیت: ۳۲)

ترجمہ: اور بدکاری کے پاس نہ جاؤ، بے شک وہ بے حیائی ہے اور بہت ہی بری راہ۔ (کنزالایمان)

ہر وہ کام جو زنا کاری سے قریب ہونے کا سبب بن سکتا ہے سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان پر پابندی عائد فرمائی اور ان سے بچنے کی سخت تاکیدیں فرمائیں۔ مردوں عورتوں کا اختلاط، عورتوں کا بے پردہ نکلنا، نامحرم سے بلاضرورت بات کرنا، غیر محرم کو دیکھنا، فحش تحریریں پڑھنا، دل میں ہیجان پیدا کرنے والے اشعار سننا اور اس طرح کی ساری باتیں جن سے دل میں زنا کاری کی خواہش پیدا ہو یا کسی غیر محرم کی طرف میلان ہو ان کے لیے اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ان اسباب کو سخت حرام فرما دیا گیا ہے اور حکم فرما دیا گیا کہ زنا کاری کے قریب بھی مت جانا۔

دورِ حاضر میں ذہنی آوارگی

دنیا میں زنا کاری اور زنا بالجبر کے بڑھتے واقعات حکومتوں کے لیے لمحۂ فکریہ ہیں۔ حکومتیں یہ ظاہر کرتی ہیں کہ وہ اپنے ملک سے زنا کا خاتمہ کرنے کی کوشش میں ہیں لیکن دوسری طرف اس کے درجِ ذیل اسباب و محرکات کو ہوا بھی دیتی ہیں:

☆ عورتوں کا بے پردہ گھر سے باہر نکلنا کہ اس کی وجہ سے وہ مردوں کی حریص نگاہوں کا نشانہ بنتی ہیں۔

☆ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں لڑکیوں اور لڑکوں کا اختلاط۔

☆ بازاروں، دفتروں اور عام جگہوں پر مردوں اور عورتوں کا اختلاط۔

☆ غیر محارِم کا گھروں میں آنا جانا اور ان سے عورتوں کا پردہ نہ کرنا۔

☆ فلموں میں آوارگی اور فحاشی پر مشتمل مواد کی شمولیت۔

☆ سوشل نیٹ ورک کے ذریعے مردوں اور عورتوں کی فرینڈ شپ اور چیٹنگ۔

☆ اخبارات اور اشتہارات میں عریانیت سے بھرپور تصویریں۔

☆ انٹرنیٹ پر عریاں فلموں کی فراہمی۔

☆ طوائفوں کے لیے قانونی تحفظ۔

یہ وہ اسباب ہیں جو بڑی تیزی کے ساتھ دلوں میں ہیجان پیدا کرتے ہیں اور پھر دل کا میلان زنا کاری کی طرف ہوتا ہے۔

یہ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نظام کی خصوصیت ہے کہ اس میں چھوٹے سے چھوٹے اسباب جن کی وجہ سے کسی کے دل میں زنا کاری کا خیال بھی آ سکتا ہو، ان پر پابندی لگادی گئی ہے۔

نگاہیں نیچی رکھنے کا حکم

مردوں کے عورتوں کے ساتھ ناجائز تعلق کی ابتدا نگاہوں سے ہوتی ہے۔ مسلمانوں کو حکم ہوا کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں۔فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

قُلۡ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ یَغُضُّوۡا مِنۡ اَبۡصَارِهِمۡ وَیَحۡفَظُوۡا فُرُوۡجَهُمۡ ؕ ذٰلِكَ اَزۡکٰی لَهُمۡ ۔ (سورۂ نور، آیت: ۳۰)

ترجمہ: مسلمان مردوں کو حکم دو اپنی نگاہیں کچھ نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی

حفاظت کریں، یہ ان کے لیے بہت ستھرا ہے۔ (کنزالایمان)

اگلی آیت میں فرمایا:

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَیَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُیُوْبِهِنَّ ۪ وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآىٕهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآىٕهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِیْۤ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِیْۤ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآىٕهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِیْنَ غَیْرِ اُولِی الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِیْنَ لَمْ یَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۪ وَلَا یَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِیُعْلَمَ مَا یُخْفِیْنَ مِنْ زِیْنَتِهِنَّ ؕ وَ تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ جَمِیْعًا اَیُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○ (سورۂ نور، آیت: ۳۰)

ترجمہ: اور مسلمان عورتوں کو حکم دو اپنی نگاہیں کچھ نیچی رکھیں اور اپنی پارسائی کی حفاظت کریں اور اپنا بناؤ نہ دکھائیں مگر جتنا خود ہی ظاہر ہے اور وہ دوپٹے اپنے گریبانوں پر ڈالے رہیں اور اپنا سنگار ظاہر نہ کریں مگر اپنے شوہروں پر یا اپنے باپ یا شوہروں کے باپ یا اپنے بیٹے یا شوہروں کے بیٹے یا اپنے بھائی یا اپنے بھتیجے یا اپنے بھانجے یا اپنے دین کی عورتیں یا اپنی کنیزیں جو اپنے ہاتھ کی مِلک ہوں یا نوکر بشرطے کہ شہوت والے مرد نہ ہوں یا وہ بچّے جنھیں عورتوں کی شرم کی چیزوں کی خبر نہیں اور زمین پر پاؤں زور سے نہ رکھیں کہ جانا جائے ان کا چھپا ہوا سنگار اور اللہ کی طرف توبہ کرو اے مسلمانو! سب کے سب اس امید پر کہ تم فلاح پاؤ۔ (کنزالایمان)

نگاہوں کی حفاظت کا حکم گھر سے باہر بھی ہے تا کہ نامحرموں پر نگاہ نہ پڑے اور گھر

کے اندر بھی ہے۔ گھر کے اندر اس حکم کا تقاضا یہ ہے کہ محرم خواتین پر بھی نگاہ نہ ڈالی جائے۔ بلاشبہ محرم خواتین کے ساتھ ایک تقدس کا رشتہ ہے لیکن بہر حال بحیثیت جنسِ مخالف ہونے کے مرد اور عورت میں ایک دوسرے کے لیے کشش ہے اور نگاہوں کی بے احتیاطی فتنے کا سبب بن سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بدنظری ہی بدکاری کے راستے کی پہلی سیڑھی ہے۔ اسی وجہ سے اس آیت میں نظروں کی حفاظت کے حکم کو حفاظتِ فرج کے حکم پر مقدم رکھا گیا ہے۔

روایت ہے کہ ایک مرتبہ ایک نابینا صحابی حضرت عبداللہ بن ام مکتوم نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حجرۂ مبارک میں تشریف لائے تو حضرت میمونہ اور ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے آپ نے فرمایا: ان سے پردہ کرو۔ وہ کہنے لگیں: کیا یہ نابینا نہیں ہیں؟ آپ نے فرمایا: مگر تم تو نابینا نہیں ہو۔ (سنن الترمذی، حصہ چہارم، ص:۳۹۹)

ہمارے معاشرے میں حال یہ ہے کہ ہم نے نوجوان لڑکیوں کو مخلوط تعلیمی اداروں، دفاتر اور دیگر محافل میں غیر محرموں کے ساتھ آزادانہ میل جول کی اجازت دے رکھی ہے۔ بعض والدین کہتے ہیں کہ ہمیں اپنی بچی پر اعتماد ہے۔ کیا نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو (نعوذ باللہ) ازواج مطہرات پر اعتماد نہیں تھا؟ بدنظری کے نتیجے میں شیطان آنکھ کے راستے سے دل میں اتر جاتا ہے پھر دونوں فریق ہم کلام ہوتے ہیں اور اسی طرح بات آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ نگاہوں کی حفاظت سے مراد صرف یہ نہیں ہے کہ مرد اور عورت ایک دوسرے کے چہرے کو نہ دیکھیں بلکہ اس سے مراد یہ بھی ہے کہ دوسروں کے ستر پر نگاہ نہ ڈالی جائے اور نہ ہی کسی قسم کے فحش مناظر یا تصاویر کو دیکھا جائے۔ اس حوالے سے مندرجہ ذیل احادیث سے رہنمائی حاصل ہوتی ہے:

☆ نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: اے علی! ایک نظر کے بعد دوسری نظر نہ ڈالنا۔

پہلی نگاہ (جو بلا ارادہ پڑ گئی) معاف ہے مگر دوسری نہیں۔

(سنن الترمذی، حصہ چہارم، ص:۳۹۸)

☆ حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے پوچھا: اچانک نگاہ پڑ جائے تو کیا کروں؟ فرمایا: فوراً نگاہ پھیر لو یا نیچی کرلو۔ (صحیح مسلم، حصہ سوم، ص:۱۶۹۹)

☆ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ نگاہ ابلیس کے زہریلے تیروں میں سے ایک تیر ہے۔ جو شخص مجھ سے ڈر کر اس کی حفاظت کرے گا میں اس کے بدلے ایسا ایمان دوں گا جس کی حلاوت وہ اپنے دل میں پائے گا۔ (المعجم الکبیر للطبرانی، حصہ دہم، ص:۱۷۳)

اسی طرح ہر وہ کام جو زنا کی طرف لے جا سکتا ہے نظامِ مصطفیٰ میں ان پر سخت پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ اس کے نتیجے میں ایک صالح معاشرہ تشکیل پایا اور دنیا میں امن وسکون قائم ہو گیا۔ آج بھی اگر معاشرے کو پرامن کرنا ہے تو زنا کاری اور اس کے سارے اسباب ومحرکات پر پابندی لگانا حکومت کی ذمے داری ہے۔

نظامِ مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں لواطت پر پابندی

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نکاح کا جو نظام عطا فرمایا ہے وہ اس قدر پاکیزہ اور صاف وشفاف ہے کہ انسان کی اپنی حیثیت اور فطری ضرورتوں کے تقاضوں کے لیے کافی ووافی اور پرامن ہے۔ اس رشتۂ ازدواج سے ہٹ کر اگر کسی بھی طرح کی زیادتی سے کام لیا گیا تو وہ تباہی اور بربادی لائے گی جو نہ صرف ایک معاشرے بلکہ پورے امنِ عالم کو متاثر کر کے رکھ دے گی۔ اس لیے آپ نے رشتۂ ازدواج سے باہر مرد اور عورت سے

ہر قسم کے جنسی تعلق کو سخت ترین جرم قرار دیا ہے جس کے لیے ضرورت کے اعتبار سے سخت سے سخت سزا مقرر فرمائی ہے۔ ان میں سب سے بدترین جرم، مرد کا مرد سے یا عورت کا عورت سے غیر فطری جنسی تعلق یعنی ہم جنس پرستی (Homesexuality) ہے لیکن افسوس کہ نام نہاد مہذب دنیا کی مختلف پارلیمنٹوں نے اس جرم کے لیے با قاعدہ سندِ جواز عطا کر دی ہے اور وہاں سماج کے ہر طبقے میں اس پر عمل کرنے والے موجود ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس غیر فطری فعل کو سخت ترین جرم اور گناہ قرار دیا ہے یہاں تک کہ قرآنِ کریم میں ایک جلیل القدر پیغمبر حضرت لوط علیہ السلام کی دعوت کا اہم ترین نکتہ اس حرام کام کی اصلاح کے لیے بیان کیا گیا ہے۔

قرآنِ کریم کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم جنس پرستی کا آغاز حضرت لوط علیہ السلام کی قوم نے کیا، ان سے پہلے دنیا کی قوموں میں اس عمل کا عمومی معاشرتی سطح پر کوئی رواج نہ تھا۔ یہی بدبخت قوم ہے جس نے اس ناپاک عمل کو ایجاد کیا۔ اس سے زیادہ شرارت، خباثت اور بے حیائی یہ تھی کہ وہ اپنی اس بدکرداری کو عیب نہیں سمجھتے تھے بلکہ علی الاعلان فخر کے ساتھ اس کو سرانجام دیتے تھے اس کا ذکر قرآن کریم میں اس طرح آیا ہے:

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفٰحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ○ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ○ (سورۂ اعراف، آیت: ۸۰، ۸۱)

ترجمہ: اور لوط کو بھیجا جب اس نے اپنی قوم سے کہا: کیا وہ بے حیائی کرتے ہو جو تم سے پہلے جہان میں کسی نے نہ کی تم تو مردوں کے پاس شہوت سے جاتے ہو عورتیں چھوڑ کر بلکہ تم لوگ حد سے گزر گئے۔ (کنز الایمان)

قوم نے پیغمبرِ وقت حضرت لوط علیہ السلام کی نصیحت کو سن کر ان کا مذاق اڑایا، اور شہر سے نکال دینے کی دھمکی دی اور اسی پر بس نہیں کیا بلکہ بجائے باز آنے کے اس جرمِ عظیم پر ڈٹے رہے اور روکنے پر الٹا عذابِ الٰہی کا مطالبہ خود اپنی زبانوں سے کر دیا۔ قوم کے جواب کو قرآنِ کریم نے اس انداز میں نقل فرمایا ہے:

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ○ (سورۂ عنکبوت، آیت:۲۹)

ترجمہ: تو اس کی قوم کا کچھ جواب نہ ہوا مگر یہ کہ بولے ہم پر اللہ کا عذاب لاؤ اگر تم سچّے ہو۔ (کنزالایمان)

چناں چہ اس عملِ بد کی وجہ سے ان پر اللہ کا عذاب آیا، قرآنِ مقدس میں مذکور ہے:

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عٰلِيَهَا سَافِلَهَا وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ۙ مَّنْضُوْدٍ○ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ○

(سورۂ ہود، آیت: ۸۲، ۸۳)

ترجمہ: پھر جب ہمارا حکم آیا ہم نے اس بستی کے اوپر کو اس کا نیچا کر دیا اور اس پر کنکر کے پتھر لگاتار برسائے جو نشان کیے ہوئے تیرے رب کے پاس ہیں اور وہ پتھر کچھ ظالموں سے دور نہیں۔ (کنزالایمان)

درج بالا آیات میں اللہ تعالیٰ نے اس عملِ قبیح کا ارتکاب کرنے والے اور اس پر خاموش تماشائی بننے والوں کو متنبہ فرمایا ہے کہ جیسے ہمارے عذاب کا کوڑا قومِ لوط پر برسا، ایسے ہی تم لوگوں پر برس سکتا ہے۔

قومِ لوط کی یہ بستیاں (سدوم وعمورہ) اُردن میں اس جگہ واقع تھیں جہاں آج بحرِ میت یا بحرِ لوط واقع ہے، یہاں پہلے سمندر نہیں تھا، جب قوم لوط پر عذاب آیا، زمین کا تختہ الٹ دیا گیا اور سخت زلزلے اور بھونچال آئے تب یہ زمین تقریباً چار سو میٹر سمندر سے نیچے چلی گئی اور پانی ابھر آیا، اسی لیے اس کا نام بحرِ میت یا بحرِ لوط ہے۔

(قصص معارف القرآن)

لواطت میں پڑنا سب سے زیادہ خطرناک ہے

ویسے تو ہر جرم خطرناک اور تشویشناک ہوتا ہے اور ہر جرم کا مرتکب قابلِ سزا ہے۔ بعض کے لیے دنیا میں اسلامی حدود ہیں اور بعض کے لیے آخرت میں دردناک عذاب ہے۔ لیکن حدیثِ پاک میں جس جرم کے تعلق سے زیادہ خدشہ ظاہر کیا گیا ہے وہ لواطت ہے۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ سرکارِ ابدقرار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اِنَّ اَخْوَفَ مَا اَخَافُ عَلٰی اُمَّتِیْ عَمَلُ قَوْمِ لُوْطٍ۔

(سنن ابن ماجہ، حصہ دوم، ص:۸۵۶)

ترجمہ: اپنی اُمت پر جس کا چیز کا مجھے سب سے زیادہ خوف ہے وہ لواطت ہے۔

اس حدیث پر نظر کریں تو یہ بات معلوم ہوجاتی ہے کہ لواطت بہت خطرناک عمل ہے، اس کی بنیاد پر امنِ عالم غارت ہوجاتا ہے اور خوب تباہیاں آتی ہیں، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس جرم کے تعلق سے سخت پابندی عائد فرمائی ہے۔

لوطی کی سزا

جو شخص اس فعلِ بد کا ارتکاب کرے اس کے لیے کڑی سزا ہے۔ قرآنِ مقدس میں

ارشاد ہوا:

وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۔ (سورۂ نساء، آیت:۱۶)

ترجمہ: اور تم میں جو مرد عورت ایسا کام کریں ان کو ایذا دو۔ (کنز الایمان)

اس ایذا دینے کے تعلق سے حدیثِ پاک میں تشریح ملتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے قومِ لوط کے عمل کی سزا کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا:

اُرْجُمُوا الْاَعْلٰی وَالْاَسْفَلَ اُرْجُمُوْهُمَا جَمِيْعًا ۔ (سنن ابن ماجہ، حصہ دوم، ص:۸۵۶)

ترجمہ: فاعل ومفعول دونوں کو رجم کردو۔

حضرت صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

اِغلام یعنی پیچھے کے مقام میں وطی کی تو اس کی سزا یہ ہے کہ اس کے اوپر دیوار گرا دیں یا اونچی جگہ سے اسے اوندھا کر کے گرائیں اور اس پر پتھر برسائیں یا اسے قید میں رکھیں یہاں تک کہ مرجائے یا توبہ کرے یا چند بار ایسا کیا ہو تو بادشاہِ اسلام اسے قتل کر ڈالے۔ الغرض یہ فعل نہایت خبیث ہے بلکہ زنا سے بھی بدتر ہے، اسی وجہ سے اس میں حد نہیں کہ بعضوں کے نزدیک حد قائم کرنے سے اس گناہ سے پاک ہوجاتا ہے اور یہ اتنا برا ہے کہ جب تک توبہ خالصہ نہ ہو اس میں پاکی نہ ہوگی۔ (بہار شریعت، حصہ نہم، ص:۳۸۰، ۳۸۱)

لوطی پر لعنت

اگر دنیا میں کوئی شخص اس برے فعل کا مرتکب رہا اور سزا سے بچ بھی گیا تو دنیا اور آخرت میں اسے اللہ کی لعنت، غضب اور عذاب سے کون بچائے گا۔

حضرت عمرو بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ

علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مَلْعُونٌ مَنْ عَمِلَ عَمَلَ قَوْمِ لُوطٍ۔ (سنن الترمذی، حصہ سوم، ص:۱۰۹)

ترجمہ: قوم لوط جیسا عمل کرنے والا ملعون ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے لواطت کے فعلِ قبیح میں مبتلا ہونے والوں کے تعلق سے فرمایا: اس کی صبح اللہ تعالیٰ کے غضب میں ہوتی ہے اور اس کی شام بھی اللہ تعالی کی ناراضگی میں ہوتی ہے۔

(شعب الایمان للبیہقی، حصہ ہفتم، ص:۲۷۸)

لوطی کبھی پاک نہیں ہوسکتا

لواطت کی شناعت وقباحت کا اندازہ اس سے بھی لگا سکتے ہیں کہ زنا کار اگر غیر شادی شدہ ہے تو اس کی سزا کم ہے اور شادی شدہ ہے تب اسے سزائے موت ہے لیکن لوطی چاہے شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ اسے سزائے موت ہی دی جائے گی۔ اسی طرح اس روایت سے بھی لواطت کی شناعت کا اندازہ ہوتا ہے جس میں لوطیوں کے تعلق سے حضرت مجاہد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ہے:

لَوْ اَنَّ الَّذِیْ یَعْمَلُ ذٰلِكَ الْعَمَلَ - یَعْنِی عَمَلَ قَوْمِ لُوطٍ - اغْتَسَلَ بِكَلِّ قَطْرَةٍ مِنَ السَّمَاءِ، وَكُلِّ قَطْرَةٍ فِی الْاَرْضِ لَمْ یَزَلْ نَجِسًا۔

(شعب الایمان للبیہقی، حصہ ہفتم، ص:۲۸۷)

ترجمہ: اگر لواطت کا فعل قبیح کرنے والا آسمان اور زمین کے ہر ہر قطرے سے غسل کر لے تب بھی وہ نجس ہی رہے گا۔

البتہ سچے دل سے توبہ کر لے تو اللہ تبارک وتعالیٰ معاف فرمانے والا ہے۔ لواطت

کے تعلق سے ذکر فرمانے کے بعد وہ خود ارشاد فرماتا ہے:

فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ○

(سورۂ نساء، آیت:۱۶)

ترجمہ: پھر اگر وہ توبہ کرلیں اور نیک ہوجائیں تو ان کا پیچھا چھوڑ دو۔ بے شک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔ (کنزالایمان)

چوری پر پابندی میں معاشرے کا امن وسکون

چوری چاہے چھوٹی ہو یا بڑی گناہِ کبیرہ اور جرم ہے۔ معاشرے میں امن کی بحالی کے لیے ضروری ہے کہ اہلِ معاشرہ کے مال کی حفاظت یقینی ہو اس لیے چوری کو جرم قرار دیتے ہوئے اس پر عبرتناک سزا رکھی گئی ہے۔ ایک انسان دن بھر تگ ودو کر کے پیسے کماتا ہے، اپنی ضروریات سے سمجھوتہ کر کے کچھ پیسے بچا کر رکھتا ہے یا کوئی قیمتی چیز خرید کو محفوظ کر لیتا ہے۔ اسی طرح اپنی ضرورت کے اعتبار سے اپنے استعمال کی کوئی چیز لے آتا ہے۔ ایسے میں کوئی شخص اس کا کوئی مال چوری کر لے تو اس کے لیے مصیبت اور مشقت کا باعث ہوجاتا ہے۔ اسی لیے سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے چوری پر مکمل پابندی لگائی اور نظامِ مصطفیٰ میں چور پر حد نافذ کی گئی تاکہ دوسروں کے لیے درسِ عبرت بن جائے۔

چور اور چورنی کا ہاتھ کاٹنے کا حکم

اگر کسی نے چوری کی ہے اور اس کا جرم ثابت ہوجاتا ہے تو اس کے لیے نظامِ مصطفیٰ میں یہ سزا ہے کہ اس کا ہاتھ کاٹ لیا جائے۔

فرمانِ قرآن ہے:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْۤا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ

اللّٰہِ ؕ وَاللّٰہُ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ ○ (سورۂ مائدہ، آیت:۳۸)

ترجمہ: اور جو مرد یا عورت چور ہو تو ان کا ہاتھ کاٹو ان کے کیے کا بدلہ، اللہ کی طرف سے سزا اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔ (کنز الایمان)

کسی نے چوری کی، اس کی چوری دو مرتبہ کے اقرار یا دو مَردوں کی شہادت سے حاکم کے سامنے ثابت ہوگئی اور جو مال چُرایا ہے وہ دس درہم سے کم کا نہ ہو تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ پہلی مرتبہ کی چوری میں داہنا ہاتھ کاٹا جائے گا، پھر دوبارہ اگر کرے تو بایاں پاؤں، اس کے بعد بھی اگر چوری کرے تو قید کیا جائے یہاں تک کہ توبہ کرے۔ (ملخصًا از خزائن)

چوری نا قابل معافی جرم ہے

جن جرائم میں دنیوی حد ہے ان میں حد اس وقت نافذ ہوگی جب حد کے نافذ کرنے کی شرطیں پائی جائیں گی۔ اگر کسی شخص نے دس درہم سے کم کی چوری کی یا چوری تو کی لیکن پکڑا نہیں گیا یا پکڑا گیا لیکن انکار کر بیٹھا اور دعویٰ کرنے والے کے پاس دو گواہ نہیں ہیں جن کے ذریعے وہ اس کے جرم کو ثابت کر سکے تو اس پر حد نافذ نہیں ہوگی لیکن اللہ کے یہاں اس پر کتنا بڑا عذاب ہے اس کا ذکر اس حدیث پاک میں ہے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ غزوۂ خیبر کے دن نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے چند صحابۂ کرام آئے اور انھوں نے کہا: فلاں شہید ہے اور فلاں شہید ہے حتّٰی کہ وہ ایک آدمی کے پاس سے گزرے تو انھوں نے کہا: فلاں بھی شہید ہے۔ یہ سن کر نبیِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: ہرگز نہیں، اس نے ایک چادر چرائی تھی اس کی وجہ سے میں نے اسے جہنم میں دیکھا ہے۔ (صحیح مسلم، حصہ اول، ص:۱۰۷)

اللہ اکبر! شہید جو اللہ کے دین کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دیتا ہے اور دینِ خدا

کے لیے اپنی گردن کٹا دیتا ہے، حدیثِ پاک کے مطابق اس کے سارے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں سوائے چند گناہوں کے۔انھی میں سے ایک گناہ چوری بھی ہے۔ جب شہید اس کی بنیاد پر جہنم میں جا سکتا ہے تو عام لوگوں کے ساتھ چوری کی سزا میں روزِ قیامت کیا معاملہ ہوگا اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

پیغمبر امن صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ڈاکہ زنی کو جرم عظیم قرار دیا

جس طرح اسلام نے چوری سے کسی مومن کا مال لینا حرام قرار دیا ہے اور چوری کے فعل کے مرتکب ہونے والے لوگوں کے لیے سزا رکھی ہے، اسی طرح ڈکیتی اور رہزنی کو بھی حرام کہا گیا اور اس کے لیے سخت سزا رکھی گئی ہے۔ چوری اور رہزنی میں فرق یہ ہے کہ چوری میں کسی کے مال کو چھپا کر لیا جاتا ہے اور رہزنی میں علی الاعلان لیا جاتا ہے۔

رہزنی کے تعلق سے فرمانِ قرآن ہے:

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیۡنَ یُحَارِبُوۡنَ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ وَیَسۡعَوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ فَسَادًا اَنۡ یُّقَتَّلُوۡۤا اَوۡ یُصَلَّبُوۡۤا اَوۡ تُقَطَّعَ اَیۡدِیۡہِمۡ وَاَرۡجُلُہُمۡ مِّنۡ خِلَافٍ اَوۡ یُنۡفَوۡا مِنَ الۡاَرۡضِ ؕ ذٰلِکَ لَہُمۡ خِزۡیٌ فِی الدُّنۡیَا وَلَہُمۡ فِی الۡاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ ○ (سورۂ مائدہ، آیت: ۳۳)

ترجمہ: وہ کہ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے اور مُلک میں فساد کرتے پھرتے ہیں ان کا بدلہ یہی ہے کہ گن گن کر قتل کیے جائیں یا سولی دیے جائیں یا اُن کے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کاٹے جائیں یا زمین سے دور کر دیے جائیں۔ یہ دنیا میں ان کی رسوائی ہے اور آخرت میں اُن کے لیے بڑا عذاب۔ (کنز الایمان)

ان کے لیے بھی یہ عبرتناک سزائیں اسی لیے ہیں تا کہ سوسائٹی سے اس جرم کا خاتمہ

ہو جائے۔ ان کے لیے دنیا میں بھی سزا ہے اور آخرت میں بھی بڑا عذاب ہے۔

ڈاکہ زن کے لیے معافی نہیں

خیر و برکت والے کچھ ایسے دن یا راتیں ہوتی ہیں جن میں اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے بندوں پر خاص فضل فرماتا ہے۔ اس کی رحمتیں بہانے تلاش کر کے بندوں کو معاف کرتی ہیں لیکن ایسے مبارک مواقع پر بھی کچھ لوگ اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ انھی میں رہزنوں کا بھی شمار ہے۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آقائے رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

يَطَّلِعُ اللهُ عَلٰى خَلْقِهٖ فِيْ لَيْلَةِ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ، فَيَغْفِرُ لِجَمِيْعِ خَلْقِهٖ اِلَّا لِلْمُشْرِكِ، وَقَاطِعِ الطَّرِيقِ، وَالْعَاقِّ، وَالْمُشَاحِنِ۔

(شعب الایمان للبیہقی، حصہ پنجم، ص: ۳۵۵)

ترجمہ: اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمتیں شعبان کی پندرہویں شب میں مخلوق پر سایہ فگن ہوتی ہیں تو اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی ساری مخلوقات کو بخش دیتا ہے سوائے مشرک، ڈاکہ زن، والدین کے نافرمان اور کسی سے بغض و کینہ رکھنے والے کے۔

ایسا وقت جب رحمتِ الٰہی جھما جھم برس رہی ہو اس میں بھی محرومی پانے والوں میں ڈاکہ زنوں کا شمار ہے۔ اس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ کس قدر بدنصیب ہوگا۔ اسی طرح مشرک، والدین کا نافرمان اور بغض و کینہ رکھنے والوں کی بھی بخشش نہیں ہوتی ہے۔

حاصلِ کلام یہ کہ ڈاکہ زنی چوں کہ امنِ عالم کے منافی ہے اس لیے پیغمبرِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نظام میں اس پر سخت پابندی لگائی گئی ہے، دنیا میں اس پر عبرتناک سزا

ہے اور آخرت میں اس جرم میں مبتلا ہونے والے کے لیے دردناک عذاب ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جرم چوری سے بڑھ کر ہے اس لیے اس پر عذاب بھی چور پر ہونے والے عذاب سے بڑھ کر ہوگا۔ اگر کسی ڈاکہ زن نے ڈاکہ زنی کے دوران کسی کا قتل کر دیا ہے تو اس کے پاداش میں اس کو قتل بھی کیا جائے گا، اگر مقتول کے ورثہ نے معاف کر دیا تب بھی معافی نہیں ہے۔

غصب پر پابندی میں معاشرتی امن کی بقا ہے

غصب یعنی کسی کی چیز ناحق ہڑپ لینا بھی جرمِ عظیم ہے۔ یہ جرم اس زمانے میں کثرت سے پایا جاتا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ زمین جائداد کے معاملے میں اس کے مرتکبین کی تعداد اس قدر ہے کہ ایک بھائی اپنے سگے بھائی کی جائداد ہڑپنے میں بھی کوئی جھجھک محسوس نہیں کرتا ہے۔ پھر یہ جرم دیگر جرائم کو دعوت دیتا ہے۔

ظاہر ہے کہ جس کی جائداد ہڑپی گئی ہے وہ خاموش تو بیٹھے گا نہیں بلکہ یا تو قانونی چارہ جوئی کرے گا، اس کی وجہ سے دونوں کو کچہری کے چکر کاٹنے پڑیں گے۔ یا پھر اپنے طور پر اسے مزا چکھانے کی کوشش کرے گا جس کے نتیجے میں ذہنی اور جسمانی اذیتوں کا سلسلہ شروع ہوگا۔ اس لیے اس جرم پر بھی نظامِ مصطفی میں سخت پابندی ہے۔

جو شخص کسی کا کوئی مال غصب کر لیتا ہے اس کے تعلق سے احادیث مبارکہ میں طرح طرح کے عذاب کا ذکر آیا ہے۔

سات زمینوں کا طوق

کسی شخص نے کسی کی ایک بالشت زمین بھی ہڑپ کر لی ہے تو پیغمبرِ امن صلی اللہ علیہ وسلم کے نظام میں یہ بھی جرمِ عظیم ہے۔ اس پر کیا سزا ملے گی وہ حدیث میں دیکھیں۔

حضرت سعید بن زید بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف اَرویٰ نامی ایک خاتون

نے مروان کے پاس مقدمہ دائر کیا، اس عورت کا یہ خیال تھا کہ حضرت سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کے حق میں سے کچھ کم کر دیا ہے۔ حضرت سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: میں کیسے اس کا حق مار سکتا ہوں جب کہ میں خود گواہی دیتا ہوں کہ حضور رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

مَنْ اَخَذَ شِبْرًا مِّنَ الْاَرْضِ ظُلْمًا فَاِنَّهٗ يُطَوَّقُهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِن سَبْعِ اَرْضِيْنَ۔ (صحیح البخاری، حصہ چہارم، ص:۱۰۷)

ترجمہ: جس نے کسی کی ایک بالشت زمین ناجائز طور سے دبائی ہے تو قیامت کے دن اس کی وجہ سے ساتوں زمینوں کا طوق اس کے گلے میں ڈال دیا جائے گا۔

زمین کس قدر وسیع ہے، پھر اسی طرح کی سات زمینوں کا طوق بنا کر اس شخص کے گلے میں ڈالا جائے گا جس نے کسی کی ایک بالشت بھی زمین ہڑپ کر لی ہے۔ پھر جو لوگ لاکھوں کروڑوں کی جائداد دبا کر ہضم کر جاتے ہیں انھیں اندازہ کرنا چاہیے کہ قیامت کے دن انھیں کس قدر سختیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ جس چیز میں کسی کا حق ہے اس میں کوتاہی کی گئی تو وہ معاف کی جانے والی بات نہیں ہے۔

مٹی کھود کر میدانِ حشر میں لائے

ایک روایت میں اس کی سزا کے تعلق سے یہ ملتا ہے۔ حضرت یعلی بن مرّہ ثقفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مَنْ اَخَذَ اَرْضًا بِغَيْرِ حَقِّهَا كُلِّفَ اَنْ يَّحْمِلَ تُرَابَهَا اِلَى الْمَحْشَرِ۔

(مسند احمد، حصہ:۲۹، ص:۹۹)

ترجمہ: جس نے ناحق کسی کی زمین پر قبضہ کر لیا اسے حکم دیا جائے گا کہ اس زمین کی

مٹی کھود کر میدانِ حشر کی طرف لے کر آئے۔

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

اَيُّمَا رَجُلٍ ظَلَمَ شِبْرًا مِّنَ الْاَرْضِ كَلَّفَهُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ اَنْ يَّحْفِرَهٗ حَتّٰى يَبْلُغَ اٰخِرَ سَبْعِ اَرْضِيْنَ ثُمَّ يُطَوِّقُهٗ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ حَتّٰى يُقْضٰى بَيْنَ النَّاسِ۔ (ایضاً،ص:۱۱۱)

ترجمہ: جس نے ایک بالشت زمین پر بھی ناحق قبضہ کرلیا اسے حکم دیا جائے گا کہ اسے کھودے یہاں تک کہ ساتوں زمینوں کی تہ تک پہنچ جائے۔ پھر اس زمین کو اس کی گردن کا طوق بنا دیا جائے گا یہاں تک کہ قیامت کے دن لوگوں کا فیصلہ ہو جائے۔

کسی کی جائداد کو غصب کرنا اور اس پر ناحق قبضہ جما لینا معاشرے میں فساد کا باعث بنتا ہے اس لیے اس پر اس قدر وعیدیں ہیں۔ دنیا کی چار روزہ زندگی میں کسی کا حق مار کر اگر ہم نے عیش کر بھی لیا تو آخرت میں اس پر ضرور محاسبہ ہوگا اور اس قدر دشواریوں اور پریشانیوں سے گزارا جائے گا کہ ان کا ذکر سن کر روح کانپ جاتی ہے۔ اس کے مقابل میں اگر ہم نے دنیا میں کم پر گزارا کرلیا تو آخرت کی پریشانیوں سے محفوظ ہو جائیں گے۔

پیغمبر امن صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رشوت خوری کی سخت مذمت کی

رشوت وہ چیز ہے جو آدمی کسی حاکم یا غیر حاکم کو اس مقصد کے تحت دیتا ہے کہ فیصلہ اس کے حق میں ہو یا اس کے من پسند منصب پر اسے فائز کیا جائے۔ چوں کہ اس میں دوسرے کی حق تلفی ہوتی ہے اس لیے پیغمبرِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس پر بھی پابندی عائد فرمائی ہے۔ رشوت لینے کی مذمت میں قرآنِ مقدس میں ارشاد ہوا:

وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ

السُّحۡتَ ؕ لَبِئۡسَ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ○ (سورۂ مائدہ، آیت: ٦٢)

ترجمہ: اور اُن (یہود) میں تم بہتوں کو دیکھو گے کہ گناہ اور زیادتی اور حرام خوری پر دوڑتے ہیں، بے شک بہت ہی برے کام کرتے ہیں۔ (کنز الایمان)

رشوت دے کر کسی کا حق مارنا جائز نہیں

رشوت دینے کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ انسان جس چیز کا مستحق نہیں ہے اسے اس چیز کا مستحق قرار دے دیا جائے۔ اسے استحقاق تو مل جاتا ہے لیکن ایک دوسرا شخص جو اس کا مستحق تھا اس سے اس کا حق چھن جاتا ہے۔ اسی طرح حکام اور قضاۃ کو اس لیے رشوت دی جاتی ہے تاکہ جو مقدمہ چلایا جا رہا ہے اس میں رشوت دینے والے کے حق میں فیصلہ ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اس میں بھی فریقِ ثانی کی حق تلفی ہے۔ اس لیے رشوت لینے اور دینے دونوں کو حرام قرار دیا گیا۔ فرمانِ قرآن ہے:

وَلَا تَأۡكُلُوۡٓا اَمۡوَالَكُمۡ بَيۡنَكُمۡ بِالۡبَاطِلِ وَتُدۡلُوۡا بِهَآ اِلَى الۡحُكَّامِ لِتَاۡكُلُوۡا فَرِيۡقًا مِّنۡ اَمۡوَالِ النَّاسِ بِالۡاِثۡمِ وَاَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ○

(سورۂ بقرہ، آیت: ۱۸۸)

ترجمہ: اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ اور نہ حاکموں کے پاس ان کا مقدمہ اس لیے پہنچاؤ کہ لوگوں کا کچھ مال ناجائز طور پر کھا لو جان بوجھ کر۔ (کنز الایمان)

رشوت خور کا ٹھکانہ جہنم ہے

دنیا کی چار دن کی حقیر زندگی کو چمکانے کے لیے ایک شخص رشوت لیتا ہے اور ایک حقدار کا حق دوسرے کو دے دیتا ہے، پھر سمجھتا ہے کہ اس نے بڑی کامیابی حاصل کر لی ہے۔ اسے آگاہ رہنا چاہیے کہ چند سالوں کے عیش کے بعد اسے دنیا سے جانا بھی ہے اور جہنم ایسے

گوشت پوست کو جلانے کے لیے تیار ہے جو حرام غذا سے پروان چڑھے ہیں۔

حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اِنَّهٗ لَا يَرْبُوْ لَحْمٌ نَبَتَ مِنْ سُحْتٍ اِلَّا كَانَتِ النَّارُ اَوْلٰى بِهٖ۔ (سنن الترمذی، حصہ اول، ص: ۷۵۳)

ترجمہ: بے شک جو گوشت بھی حرام غذا سے پروان چڑھا ہے اس کے لیے جہنم ہی زیادہ مناسب ہے۔

جو شخص حرام غذا کھا کر اپنے جسم کو پروان چڑھاتا ہے اسے جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ رشوت کا مال بھی حرام ہے اس لیے رشوت خور کے لیے بھی جہنم کا عذاب ہے۔

رشوت دینے اور لینے والے دونوں جہنمی

ہر وہ کام جس میں اللہ کی نافرمانی ہے شریعتِ مطہرہ کی نظر میں وہ قبیح اور شنیع ہے اور اس کام کے لیے پیسے خرچ کرنا اور قبیح و شنیع ہے۔ یہی معاملہ رشوت کا ہے کہ دنیا میں اگر چہ اس میں فائدہ نظر آتا ہے لیکن آخرت میں اس کا انجامِ بد کیا ہوگا اس کا ذکر حدیثِ پاک میں ان الفاظ میں آتا ہے: اَلرَّاشِيْ وَالْمُرْتَشِيْ فِي النَّارِ۔ (مسند البزار، حصہ سوم، ص: ۲۴۷)

ترجمہ: رشوت لینے والا اور رشوت دینے والا دونوں جہنمی ہیں۔

ایک روایت میں رشوت دینے والوں، لینے والوں اور دونوں کے بیچ میں ثالثی کرنے والوں سب پر لعنت فرمائی گئی۔ حضرت ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں:

لَعَنَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الرَّاشِيَ وَالْمُرْتَشِيَ وَالرَّائِشَ۔ (شعب الایمان للبیہقی، حصہ ہفتم، ص: ۳۵۴)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے رشوت دینے والے، لینے والے اور

ثالثی کرنے والے تینوں پر لعنت فرمائی ہے۔

رشوت دے کر دنیا میں اپنی مرضی کے مطابق فیصلہ حاصل کرنے والا یہ نہ سمجھے کہ اسے بہت بڑی کامیابی میسر آگئی ہے۔ اسے یاد رکھنا چاہیے کہ قیامت کے دن کوئی رشوت نہیں چلنے والی ہے اور وہاں ہر کسی کے ساتھ عدل ہوگا۔ جس نے دنیا میں رشوت کے بل پر کسی کا حق مار لیا تھا اسے بھی قیامت کے دن جہنم کا منہ دیکھنا پڑے گا۔

رشوت خوری بھی حق تلفی کا عظیم سبب ہے اور حق تلفی امن کو غارت کرنے والی بلا ہے اس لیے سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کی سخت مذمت فرمائی اور اس کے تعلق سے وعیدیں بیان فرمائی ہیں۔

وعدہ خلافی سے ممانعت امن کی بحالی کا ذریعہ

وعدہ نبھانے کے تعلق سے آقائے رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بہت زور دیا ہے۔ وعدہ وفائی ان صفات میں سے ہے جن کے پیکر سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اعلانِ نبوت سے قبل بھی تھے۔ آپ کی پوری حیاتِ طیبہ میں وعدہ خلافی کا ایک بھی واقعہ نہیں مل سکتا ہے بلکہ وعدہ نبھانے کے تعجب خیز واقعات ملیں گے۔

امن کی بحالی کے لیے وعدہ نبھانا بھی بہت ضروری ہے۔ ایک وعدہ خلاف شخص دوسروں کے لیے عام طور پر باعثِ زحمت بن جاتا ہے۔ اس لیے سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے وعدہ خلافی پر سخت پابندی عائد فرمائی ہے اور یہ حکم فرمایا ہے کہ وہی وعدہ کیا جائے جس کے وفا کرنے کی امید ہو۔

وعدے کے بارے میں باز پرس ہوگی

قیامت کے دن ہر کام کا حساب دینا ہے، انھی میں سے وعدہ وفائی بھی ہے کہ اس

کے تعلق سے قیامت کے دن باز پرس ہوگی۔قرآنِ مقدس میں حکم ہوا:

وَاَوۡفُوۡا بِالۡعَهۡدِ ۚ اِنَّ الۡعَهۡدَ كَانَ مَسۡـُٔوۡلًا ○ (سورۂ بنی اسرائیل، آیت: ۳۴)

ترجمہ: اور عہد پورا کرو، بے شک عہد سے سوال ہونا ہے۔(کنز الایمان)

اس آیۂ مقدسہ میں وعدہ وفا کرنے کا حکم فرماتے ہوئے یہ ارشاد ہوا کہ اس کے تعلق سے قیامت کے دن حساب ہونا ہے۔ دراصل وعدہ خلافی میں سب سے بڑی شناعت کی جو بات ہے وہ لوگوں کو ایذا پہنچانا ہے۔ایک شخص سے ہم نے کسی بات کا وعدہ کیا، اس نے اس وعدے کے مطابق ہم پر بھروسہ کیا لیکن ہم نے وعدہ پورا نہیں کیا۔اس کی وجہ سے عموماً اس شخص کے لیے مشکلات کھڑی ہو جاتی ہیں۔

کامیاب مومن کی صفت

دنیا و آخرت کی کامیابی پانے والے مومنین کی صفات اللہ تبارک وتعالیٰ نے سورۂ مومنون میں تفصیل سے ذکر فرمائی ہیں۔ وہ نماز خشوع کے ساتھ پڑھتے ہیں، لغو کاموں سے اعراض کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، اپنی نمازوں پر محافظت کرتے ہیں۔انھی میں سے ایک صفت یہ بھی ہے:

وَالَّذِيۡنَ هُمۡ لِاَمٰنٰتِهِمۡ وَعَهۡدِهِمۡ رٰعُوۡنَ ○ (سورۂ مومنون، آیت: ۸)

ترجمہ: اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کی رعایت کرتے ہیں۔(کنز الایمان)

اس پر انھیں کیا انعام ملے گا اسے قرآنِ مقدس میں اس طرح ذکر کیا گیا:

اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡوٰرِثُوۡنَ ○ الَّذِيۡنَ يَرِثُوۡنَ الۡفِرۡدَوۡسَ ؕ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ○ (سورۂ مومنون، آیت: ۸)

ترجمہ: یہی لوگ وارث ہیں کہ فردوس کی میراث پائیں گے۔ وہ اس میں ہمیشہ

رہیں گے۔ (کنزالایمان)

وعدہ خلافی منافق کی علامت ہے

مومن کی یہ شان ہوتی ہے کہ وہ اپنے عہد کا پکا ہوتا ہے۔اس کے بالمقابل منافق کا یہ حال ہوتا ہے کہ اس کے اندر وعدہ وفائی نہیں ہوتی ہے۔ حدیثِ پاک میں منافق کی جو علامتیں بیان کی گئی ہیں ان میں سے ایک علامت وعدہ خلافی بھی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اٰیَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ، اِذَا حَدَّثَ کَذَبَ، وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ، وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ۔ (سنن الترمذی، حصہ پنجم، ص:۱۹)

ترجمہ: منافق کی علامتیں تین ہیں۔ (۱) بات چیت میں جھوٹ بولتا ہے۔ (۲) وعدہ خلافی کرتا ہے۔ (۳) امانت میں خیانت کرتا ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جس کے اندر یہ باتیں پائی گئیں اسے ہم ایمان سے خارج اور منافق مانیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں مومنانہ صفات کے خلاف منافقانہ صفتیں پائی جارہی ہیں اور ایسے کو اپنے ایمان کا جائزہ لینا چاہیے۔

خیانت، نظام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ناقابل تلافی جرم

جو جرائم خِسّت اور ذلت پر دلالت کرتے ہیں ان میں سے ایک جرم خیانت بھی ہے۔ایک شخص نے ایک شخص پر بھروسہ کیا اور اسے کسی چیز کا امین بنا دیا، اب اس نے اس میں خیانت کر دی تو اس پر سے ہمیشہ کے لیے اس کا بھروسہ اٹھ جائے گا۔ خائن معاشرے کے لیے بہت بڑی زحمت کا باعث ہوتا ہے اس لیے سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خیانت کو سخت شنیع جرم قرار دیا ہے۔ دراصل یہ ایک جرم اپنے اندر چوری، جھوٹ، بے وفائی،

دغابازی اور اس جیسے کئی جرائم سمیٹے ہوئے ہے۔

امانت داری کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگا سکتے ہیں کہ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اعلانِ نبوت سے پہلے کی بھی چالیس سالہ زندگی امانت پر مبنی ہے۔ کفارِ قریش نے آپ سے دشمنی اور عناد کا کوئی دقیقہ رکھ نہیں چھوڑا تھا لیکن کبھی کسی کی مجال نہیں ہوئی کہ آپ کی امانت وصداقت پر انگلی اٹھائے۔ بلکہ ہجرت سے پہلے وہ لوگ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس اپنی امانتیں رکھا کرتے تھے۔ آپ کی بھی امانت دارانہ شان یہ تھی کہ مکۂ معظّمہ سے ہجرت پر مجبور ہوئے اس وقت بھی امانت داری کا اس قدر لحاظ فرمایا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نائب بنا کر آئے اور فرمایا کہ صبح سب کی امانتیں ادا کر دینا پھر نکلنا۔

امانتیں ان کے مالکوں کے حوالے کرنے کا حکم

کسی کے پاس امانت رکھی گئی ہے تو اس کو اس میں کسی بھی طرح کا کوئی تصرف کرنا جائز نہیں ہے بلکہ یہ حکم ہے کہ جس طرح اسے موصول ہوئی تھی اسی طرح اس کے مال کو لوٹائے۔ امانت داری ایک بہت عظیم ذمے داری ہوتی ہے اور اس میں کوتاہی پوری زندگی کے لیے اس انسان کے وقار کو مجروح کر دے گی۔ حکمِ قرآن ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۔ (سورۂ نساء، آیت:۵۸)

ترجمہ: بے شک اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں جن کی ہیں انھیں سپرد کرو۔

اس آیت میں امانتیں ادا کرنے کا حکم فرمایا۔ ایک آیت میں امانت میں خیانت سے منع فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ○ (سورۂ انفال، آیت:۲۷)

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ اور رسول (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) سے دغا نہ کرو اور نہ اپنی امانتوں میں دانستہ خیانت۔ (کنزالایمان)

کوئی امانت کسی کے پاس رکھی گئی ہے تو اسے اس میں تصرف کا کوئی اختیار ہی نہیں ہے۔ اگر اپنے تعلق سے اس بات کا اعتماد نہیں ہے کہ امانت کی صحیح طور پر حفاظت کر سکے گا تو کسی کی امانت رکھنی ہی نہیں چاہیے اس لیے کہ ایک بار بھی اگر ادنیٰ سا شک بھی پیدا ہو گیا تو زندگی بھر کے لیے بھروسہ اٹھ جائے گا۔ اسی طرح جس شخص کے تعلق سے تردد ہے کہ کہیں وہ امانت میں خیانت نہ کر دے اس کے پاس بھی امانت نہیں رکھنی چاہیے۔

خیانت منافق کرتا ہے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اٰیَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ، اِذَا حَدَّثَ کَذَبَ، وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ، وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ۔ (سنن الترمذی، حصہ پنجم، ص:۱۹)

ترجمہ: منافق کی علامتیں تین ہیں۔ (۱) بات چیت میں جھوٹ بولتا ہے۔ (۲) وعدہ خلافی کرتا ہے۔ (۳) امانت میں خیانت کرتا ہے۔

اس روایت سے پتہ چلا کہ اگر امانت میں خیانت کا خیال دل میں پیدا ہو رہا ہے تو اپنے ایمان کی کمزوری پر نظرِ ثانی کرنی چاہیے اس لیے کہ جس کا ایمان پختہ ہو گا اس کے دل میں خیانت کا خیال نہیں آئے گا۔

غیر امین غیر دین دار

دینداری انسان کو لوگوں کے حقوق کا خیال کرنے اور ہر صاحبِ حق کو اس کا حق پہنچانے کی دعوت دیتی ہے۔ اگر کسی کا حق مارنے کا خیال دل میں آئے تو سمجھ لینا چاہیے کہ

دین داری میں خلل ہے۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَّا اَمَانَۃَ لَہٗ، وَلَا دِیْنَ لِمَنْ لَّا عَھْدَ لَہٗ۔

(شعب الایمان للبیہقی، حصہ ششم، ص:۱۹۶)

ترجمہ: جس میں امانت نہیں اس میں ایمان نہیں اور جس میں وعدے کی پابندی نہیں اس میں دین داری نہیں۔

اس حدیث سے پتہ چلا کہ ایمان اور امانت کا باہم تلازم ہے کہ امانت کے بغیر حلاوتِ ایمان سے محرومی ہے۔ ہم مومن ہیں، یقیناً مومن ہیں تو ہمیں مومنانہ شان کا لحاظ رکھنا چاہیے اور خیانت سے بہر حال گریز کرنا چاہیے۔

خیانت جہنم میں لے جانا والا عمل

کسی طور پر کسی کی حق تلفی جہنم میں جانے اور عذاب میں مبتلا ہونے کا باعث ہے۔ جہنمیوں کی علامات میں سے سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خیانت کو بھی بتایا ہے۔

حضرت عیاض مُجاشِعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایک دن طویل خطبہ ارشاد فرمایا اس میں آپ نے جہنم میں جانے والوں کا ذکر کرتے ہوئے جہنمیوں میں اس شخص کا بھی شمار فرمایا جسے مال کی لالچ تو نہیں ہوتی ہے لیکن اگر موقع پا جائے تو خیانت کر دیتا ہے۔ (صحیح البخاری، حصہ چہارم، ص:۲۱۹۷)

یعنی جس کی خیانت کرنے کی عادت نہیں ہے لیکن اگر موقع مل جائے تو خیانت سے گریز بھی نہیں کرتا ہے ایسے شخص کو بھی جہنمیوں میں سے شمار فرمایا گیا۔ پھر وہ شخص جو خیانت کا عادی ہے اور ہمیشہ اس کی فکر میں رہتا ہے اس کے لیے جہنم میں کس قدر عذاب ہوگا

اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

امانت کا صرف یہ مطلب نہیں کہ کسی نے مال و دولت ہمارے پاس رکھی۔ یہ امانت کا عام معنیٰ ہے۔امانت یہ بھی ہے کہ۔۔۔۔

☆ ہمیں کوئی دینی ذمے داری دی گئی۔ جیسے کوئی مدرس تدریس کے منصب پر فائز ہوتا ہے یا کوئی امام امامت کے منصب پر فائز ہوتا ہے۔

☆ ہمیں کوئی دنیوی ذمے داری دی گئی۔ جیسے کسی کو حاکم بنایا گیا، کوئی کسی شخص کے یہاں نوکری کرتا ہے یا کسی نے اپنے مال کو فروخت کرنے کا وکیل بنا دیا ہے۔

اس طرح کے کثیر معاملات ہیں جو ہمارے ذمے امانت کی حیثیت سے ہوتے ہیں انھیں بھی صحیح طور پر ادا نہ کرنا قابلِ گرفت بات ہے۔

مثال کے طور پر کسی کے لیے دفتر کی حاضری کا وقت صبح دس بجے سے شام چھ بجے تک ہے، کسی دن دفتر میں ذمے داران نہیں ہیں اور یہ شخص چھٹی لیے بغیر دفتر سے چلا گیا تو یہ بھی خیانت ہے۔ یہ دفتر میں موجود ہے لیکن وقت گزاری کر رہا ہے، جس کام کے لیے اسے رکھا گیا ہے وہ کام صحیح طور پر مکمل نہیں کر رہا ہے تو یہ بھی خیانت ہے اور قابلِ گرفت بات ہے۔

شراب نوشی پر پابندی معاشرے کے لیے رحمت

شراب اور نشہ آور چیزوں کا روز افزوں استعمال معاشرے میں جو تباہیاں اور بربادیاں لا رہا ہے اور اس کی وجہ سے اخلاقی، دینی، روحانی، مذہبی اور معاشرتی طور پر جن جن خساروں کا سامنا کیا جا رہا ہے ان سے ہر کس و ناکس واقف ہے۔کوئی ایسا سال نہیں گزرتا جس میں نشہ کرنے والے ہزاروں کی تعداد میں اسپتال نہ پہنچتے ہوں اور نشے کی وجہ سے ہزاروں افراد زنا کاری، بدکاری، قتل، خودکشی، چوری اور اس طرح کے دیگر جرائم کا

ارتکاب نہ کرتے ہوں۔

اسلام کی جلوہ گری سے پہلے عرب میں شراب بڑی کثرت سے پی جاتی تھی، اس کا ذکر ان کے قصائد اور اشعار میں بھی بہت پایا جاتا ہے۔ شراب نوشی کا نقصان یہ ہے کہ اس سے عقل زائل ہو جاتی ہے اور جب عقل زائل ہو جائے تو انسان کچھ بھی کر بیٹھتا ہے۔ جب اسلام کی جلوہ گری ہوئی تو چوں کہ اہلِ عرب شراب نوشی کے از حد عادی تھے اس لیے فوری طور پر اس پر پابندی لگانا مشکل کام تھا۔

شراب کی حرمت تدریجاً ہوئی

مدینے کی طرف ہجرت کے بعد اتفاق سے ایک واقعہ پیش آیا کہ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صحابۂ کرام کی دعوت کی، دعوت میں طعام کے ساتھ ساتھ شراب کا بھی انتظام تھا، بہت سے حضرات نے کھانا کھایا اور شراب بھی نوش کی، نمازِ مغرب کا وقت ہوا تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو امامت کے لیے آگے بڑھایا، آپ نے نماز میں سورۂ کافرون کی تلاوت کی لیکن نشے کی وجہ سے ہر جگہ سے لفظ ''لا'' چھوٹ گیا جس سے معنی میں بہت بڑا افساد لازم آیا۔ اس کے بعد مندرجہ ذیل آیۂ کریمہ نازل ہوئی:

يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ۔ (سورۂ نساء، آیت: ۴۳)

(ترجمہ: اے ایمان والو! نشے کی حالت میں نماز کے پاس نہ جاؤ جب تک اتنا ہوش نہ ہو کہ جو کہو اسے سمجھو۔) (تفسیر طبری، حصہ ہشتم، ص: ۳۷۶)

اس آیت کے نازل ہونے کے بعد شراب نوشی میں کافی حد تک کمی آ گئی اس لیے کہ نشے کی حالت میں نماز نہیں پڑھ سکتے تھے اور نماز چھوڑنا بھی باعثِ زحمت تھا۔

صحابۂ کرام کو یہ اندازہ ہو گیا کہ شراب اتنی بری چیز ہے کہ وہ نماز سے مانع بن رہی ہے، تو بہت سارے صحابۂ کرام نے اس آیت کے نزول پر ہی شراب چھوڑ دی۔ لیکن ابھی بالکلیہ اسے حرام نہیں کیا گیا تھا اس لیے اس کے پینے کا سلسلہ کہیں کہیں جاری تھا۔

پھر جب مسلمانوں نے اپنے آپ کو شراب کے معاملے میں کافی حد تک کنٹرول کر لیا تو اب اس کی حرمتِ مغلظہ نازل ہوئی اور فرمایا گیا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۝

(سورۂ مائدہ، آیت: ۹۰، ۹۱)

ترجمہ: اے ایمان والو! شراب اور جُوا اور بُت اور پانسے ناپاک ہی ہیں شیطانی کام تو ان سے بچتے رہنا کہ تم فلاح پاؤ۔ شیطان یہی چاہتا ہے کہ تم میں بیر اور دشمنی ڈلوا دے شراب اور جوئے میں اور تمھیں اللہ کی یاد اور نماز سے روکے، تو کیا تم باز آئے۔ (کنز الایمان)

اس آیۂ مقدسہ میں شراب اور جوئے کے نتائج اور وبال بیان فرمائے گئے کہ شراب نوشی اور جوئے بازی کا ایک وبال تو یہ ہے کہ اس سے آپس میں بُغض اور عداوتیں پیدا ہوتی ہیں اور جو کوئی ان بدیوں میں مبتلا ہو وہ ذکرِ الٰہی اور نماز کے اوقات کی پابندی سے محروم ہو جاتا ہے۔ مذکورہ آیتوں کے نزول کے بعد شراب کو بالکلیہ حرام کر دیا گیا۔

شراب پینا بہت بڑا گناہ ہے

بہت سے افراد کا نظریہ ہے کہ شراب پینے سے رنج وغم سے چھٹکارا حاصل ہو جاتا

ہے، کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ شراب نوشی سے صحت بنتی ہے۔ کچھ لوگ اس کے دوسرے فوائد بیان کرتے ہیں اور پینے کا جواز تلاش کرتے ہیں۔قرآنِ مقدس میں فرمادیا گیا:

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَاۤ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۫ وَاِثْمُهُمَاۤ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ (سورۂ بقرہ، آیت:۲۱۹)

ترجمہ: تم سے شراب اور جوئے کا حکم پوچھتے ہیں۔تم فرمادو کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے کچھ دنیوی نفع بھی اور ان کا گناہ ان کے نفع سے بڑا ہے۔

نفع تو یہی ہے کہ شراب سے وقتی طور پر کچھ سرور پیدا ہوتا ہے یا اس کی خرید وفروخت سے تجارتی فائدہ ہوتا ہے۔ گناہوں اور مفسدوں کا کیا شمار، عقل کا زوال، غیرت وحمیت کا زوال، عبادات سے محرومی، لوگوں سے عداوتیں، سب کی نظر میں خوار ہونا، دولت ومال کی اضاعت۔ (ملخصًا از خزائن)

اگر شراب وقتی طور پر کچھ فائدے مند معلوم ہوتی ہے تو وہ فائدہ معمولی ہے لیکن اس کا گناہ بہت بڑا ہے اور اس کے نقصانات معاشرے کے لیے مُہلِک مرض کی طرح ہیں۔ اسی لیے سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نظامِ امن میں اس پر سخت پابندی عائد کی گئی ہے اور اسے ان جرائم میں سے شمار کیا گیا ہے جن پر حد نافذ ہوتی ہے۔

شراب نوشی کی حد

شراب پینے والے کے لیے چالیس یا اسی کوڑے لگانے کی سزا ہے، ایک بار پی تو کوڑے لگائے جائیں گے، دوبارہ اور سہ بارہ پینے میں بھی یہی سزا ہے اور چوتھی بار پی تو اس کو قتل کر دیا جائے گا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِذَا سَکِرَ فَاجْلِدُوْهُ، فَاِنْ عَادَ فَاجْلِدُوْهُ، فَاِنْ عَادَ فَاجْلِدُوْهُ ثُمَّ قَالَ فِي الرَّابِعَةِ: فَاِنْ عَادَ فَاضْرِبُوْا عُنُقَهٗ۔ (سنن ابن ماجہ، حصہ دوم، ص:۸۵۹)

ترجمہ: جب کوئی شخص نشہ کرے تو اسے کوڑے لگاؤ، پھر دوبارہ نشہ کرے تو پھر کوڑے لگاؤ، تیسری بار کرے تب بھی اسے کوڑے لگاؤ، چوتھی بار نشہ کرے تو اسے قتل کر دو۔

اس روایت سے پتہ چلا کہ کوڑے لگا کر اسے اپنی اصلاح کرنے کا موقع دیا جائے گا، اگر پھر بھی نہیں اصلاح کرتا ہے تو اسے دو موقعے اور دیے جائیں گے۔ اب بھی اگر اس میں سدھار نہیں آتا ہے تو سمجھ لیا جائے گا کہ اب اس میں سُدھار لانا ممکن نہیں ہے اور اب وہ قتل کا مستحق ہو جائے گا۔

کتنے کوڑے لگائے جائیں گے اس تعلق سے مذہبِ حنفی یہ ہے کہ اسی (۸۰) کوڑے لگائے جائیں گے۔ حضرت حُضین بن مُنذِر بیان کرتے ہیں کہ جب ولید بن عقبہ کو حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس لایا گیا اور لوگوں نے ان کے خلاف شراب نوشی کی گواہی دی تو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ تمھارے چچازاد بھائی تمھارے سامنے ہیں، تم ان پر حد نافذ کرو۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انھیں کوڑے لگائے اور فرمایا:

جَلَدَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَرْبَعِيْنَ وَجَلَدَ اَبُوْبَكْرٍ اَرْبَعِيْنَ وَجَلَدَ عُمَرُ ثَمَانِيْنَ وَكُلٌّ سُنَّةٌ۔ (سنن ابن ماجہ، حصہ دوم، ص:۸۵۸)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے (شراب نوشی کی سزا میں) چالیس کوڑے لگائے تھے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی چالیس کوڑے لگائے تھے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسی کوڑے لگائے تھے۔ یہ دونوں سنت

سے ثابت ہیں۔

جب کوئی صحابی کسی کام کو سنت کہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ اس روایت سے پتہ چلا کہ چالیس کوڑے لگانا بھی سنت سے ثابت ہے اور اسی کوڑے لگانا بھی سنت سے ثابت ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اُسی کوڑے لگانے کو اختیار فرمایا تھا، یہی مذہب حنفی میں مختار ہے۔

شراب ہر برائی کی کنجی ہے

شراب پر پابندی اس لیے لگائی گئی ہے کہ یہ ہر برائی کی جڑ ہے۔ شراب نوشی کرنے والا نشے کی حالت میں کب کس کو کیا تکلیف پہنچائے گا اس کی کوئی ضمانت نہیں ہے بلکہ بارہا نشے کی حالت میں وہ قتل و غارت گری پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے۔ اسی لیے سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اسے ہر برائی کی کنجی قرار دیا ہے۔

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

اَوْصَانِیْ خَلِیْلِیْ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: لَا تَشْرَبِ الْخَمْرَ، فَاِنَّھَا مِفْتَاحُ کُلِّ شَرٍّ۔ (سنن ابن ماجہ، حصہ دوم، ص:۱۱۱۹)

ترجمہ: میرے خلیل صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مجھے وصیت فرمائی کہ شراب مت پینا اس لیے کہ وہ ہر برائی کی کنجی ہے۔

سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایسا نظام تشکیل دیا جس میں دنیا سے ہر برائی کے خاتمے کو یقینی بنایا گیا ہے اور شراب ہر برائی کی کنجی ہے اس لیے اس پر سخت سے سخت پابندی ہے۔ دنیا میں اس پر حد کی شکل میں سزا ہے اور آخرت میں اس پر دردناک عذاب ہے۔ پھر صحت کی خرابی، مال کا ضیاع، گھر میں لڑائی جھگڑا اور دیگر خرافات جو شراب نوشی کی

دین ہیں وہ اس کے اضافی نقصانات میں سے ہیں۔

شراب پینے والے پر آخرت میں عذاب ہوگا

اگر کوئی شخص دنیا میں شراب کی حد اور نقصان سے کسی وجہ سے بچ بھی جاتا ہے تو آخرت میں اسے اللہ کے عذاب سے کوئی نہیں بچا سکتا۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ رسولِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے شراب پی کر نشہ کیا اس کی چالیس دنوں تک نمازیں قبول نہیں ہوں گی، اگر توبہ کے بغیر مر گیا تو جہنم میں داخل ہوگا اور اگر توبہ کر لیا تو اللہ تبارک وتعالیٰ اسے معاف فرمائے گا۔ پھر اگر دوبارہ شراب پیا تو ایسا ہی معاملہ ہوگا اور پھر سے توبہ کر لیا تو اللہ تبارک وتعالیٰ اسے معاف فرمائے گا۔ پھر اگر تیسری بار شراب پیا تو یہی معاملہ ہوگا، البتہ اب بھی توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ اسے معاف فرمادے گا۔

لیکن تیسری مرتبہ کے بعد اگر اس نے چوتھی مرتبہ شراب پی تو اللہ تعالیٰ اسے ضرور قیامت کے دن جہنمیوں کی پیپ پلائے گا۔ (سنن ابن ماجہ، حصہ دوم، ص: ۱۱۲۰)

یعنی اسے جہنم میں جانے کی سزا تو ملے گی ہی ساتھ میں بطورِ سزا اسے جہنمیوں کی پیپ پینے کے لیے دی جائے گی۔

معاشرے کو مامون کرنے کے لیے اس اُمُّ الخبائث پر مکمل پابندی ضروری تھی اسی لیے پیغمبر رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حسنِ اسلوب کے ساتھ اس برائی کا معاشرے سے جڑ سے خاتمہ فرما دیا اور صحابۂ کرام کے دلوں میں اس کے تعلق سے سخت نفرت پیدا فرما دی۔ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اگر شراب کا ایک قطرہ کنویں میں گر جائے پھر اس جگہ منارہ بنایا جائے تو میں اس پر اذان نہ کہوں اور اگر دریا میں شراب کا قطرہ پڑے

پھر دریا خشک ہوا اور وہاں گھاس پیدا ہوا اس میں اپنے جانوروں کو نہ چراؤں۔ (خزائن)

خود کشی کی نظام مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں گنجائش نہیں

دورِ حاضر میں خودکشی کے واقعات روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں۔ اگر ہم خودکشی کے اسباب پر غور کریں تو پتہ چلے گا کہ خودکشی کرنے والے امتحانات میں ناکامی، بے روزگاری، غربت، مسلسل بیماری، گھریلو جھگڑے اور لڑکیوں کے لیے عرصۂ دراز تک مناسب رشتہ نہ آنے یا دیگر وجوہ سے خودکشی کرتے ہیں۔ اولاً تو سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نظام میں ان اسباب ہی کا خاتمہ کیا گیا ہے۔ اس کی بے شمار مثالیں اس کتاب میں بھی آپ نے متعدد مقامات پر ملاحظہ کی ہوں گی۔ یہاں ایک سرسری جائزہ لیتے ہیں:

امتحان میں ناکامی:

امتحان میں ناکامی کی وجہ سے طلبہ خودکشی کر لیتے ہیں اس لیے کہ ان کے ذہن پر اس بات کا بہت بڑا دباؤ ہوتا ہے کہ اگر امتحان میں ناکام ہو گئے تو ایک سال برباد ہو گیا۔ اسلام نے طالب علم کے ذہن پر ایسا کوئی بوجھ نہیں رکھا ہے بلکہ طالبِ علم کے ہر ہر لمحے کو عبادت میں گزرنے والا وقت قرار دیا ہے۔ لاکھوں کی تعداد میں اسلامی مدارس ہیں، ان میں سیکڑوں طلبہ فیل ہوتے ہیں لیکن شاید ہی کوئی ایسی مثال ملے کہ مدارس اسلامیہ کے کسی طالب علم نے کبھی خودکشی کی ہو۔

بے روزگاری:

بے روزگاری بھی خودکشی کے اسباب میں سے ہے، سیکڑوں نوجوان بے روزگار پھرتے ہیں اور نوکری نہ ملنے کی وجہ سے وہ اپنے کاندھے پر عائد گھریلو ذمے داریاں سنبھال نہیں پاتے۔ بارہا ایسے حالات سے دو چار ہو کر ایک بے روزگار انسان خودکشی کر لیتا ہے۔

عموماً حکومتوں نے ریزرویشن کا سسٹم رکھا ہے جس کی وجہ سے غیر مستحقین کو نوکری مل جاتی ہے اور جو مستحق ہیں وہ اپنی زندگی کا لمبا عرصہ صلاحیت بنانے میں گزارتے ہیں پھر بھی نوکری سے محروم رہ جاتے ہیں۔ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہر انسان کو حقِ معاش عطا فرمایا ہے، نہ کسی کے لیے ریزرویشن ہے اور نہ کسی کے لیے کوئی بھید بھاؤ ہے۔ اگر کسی وجہ سے وہ شخص مناسب کام نہیں پا رہا ہے تو رشتے داروں، پڑوسیوں اور عام مسلمانوں کو حکم دیا ہے اس کی ہر اعتبار سے مدد کریں۔

غربت وافلاس:

دورِ حاضر میں معاشی نظام بڑے اضطراب کا شکار ہے اور روز بروز مہنگائی بڑھتی جا رہی ہے۔ ایسے میں ایک غریب انسان کے لیے دو وقت کی روٹی کا انتظام مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اگر اس کے یہاں بیٹیاں پیدا ہو گئی ہیں تو ان کی شادی بیاہ کی فکر اسے کھائے جاتی ہے۔ بارہا حالات سے تنگ آ کر ایک غریب انسان خودکشی پر مجبور ہو جاتا ہے۔ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعلیمات میں سے تو یہ ہے کہ سرمایہ دار غریبوں کو تلاش کریں اور ان کا تعاون کریں، پھر زکوٰۃ کا نظام ایسا ہے کہ اگر اس ایک نظام پر منظم انداز سے عمل کر لیں تو دنیا میں شاید کوئی غریب نہ رہ جائے۔

مسلسل بیماری:

کوئی شخص کسی بیماری میں مبتلا ہو گیا تو گھر والے اسے اپنے اوپر بوجھ سمجھنے لگتے ہیں، اسے ذہنی اذیتیں بھی دیتے ہیں۔ بارہا پریشان ہو کر وہ خودکشی کا قدم اٹھاتا ہے یا پھر مسلسل بیمار رہتے رہتے اس کے اندر چڑ چڑا پن آ جاتا ہے اور وہ مرنے کو زندہ رہ کر بیماری جھیلنے پر ترجیح دیتا ہے۔ پیغمبر رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیماروں کی تیمارداری کو عبادت قرار

دیا ہے اور بیماروں کے لیے ان کے مرض اور تکلیف کو نیکیاں بٹورنے کا ذریعہ قرار دیا ہے۔

گھریلو جھگڑے:

گھر میں ناچاقی عموماً ایک دوسرے کے حقوق نہ ادا کرنے کی وجہ سے ہوتی ہے اور کبھی کبھی ناچاقی اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ کوئی فریق اپنی جان دینے کو روز روز کے جھگڑے پر ترجیح دیتا ہے۔ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہر کسی کے لیے حقوق وفرائض متعین کیے ہیں کہ ان کا لحاظ کیا جائے تو کبھی بھی کسی کا بھی دل نہیں دکھے گا، نہ جھگڑے لڑائی کی نوبت آئے گی اور نہ ہی کسی کے دل میں خودکشی کا خیال آئے گا۔

بیٹیوں کے لیے عرصۂ دراز تک رشتہ نہ آنا:

یہ عموماً دو اسباب کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ والدین نے بچیوں کو تہذیب نہیں سکھائی ہے اس لیے ان کی بیٹیوں کو اپنے گھر لانا کوئی پسند نہیں کرتا ہے۔ دوسرا سبب یہ ہوتا ہے کہ معاشرے میں جہیز نام کا ایک ناسور جو پھیلا ہوا ہے اس نے اس قدر تباہی مچادی ہے کہ رشتہ کرنے سے پہلے لوگ اس بات کا ضرور جائزہ لیتے ہیں کہ لڑکی والے جہیز کتنا دیں گے۔ اس کے علاوہ شادی بیاہ میں بارات کی ناز برداری کے لیے لاکھوں روپیوں کا انتظام کرنا ہوتا ہے۔ ایسے میں ایک غریب انسان کے لیے اپنی بیٹی کی شادی بمنزلۂ بربادی ہوجاتی ہے۔ مگر نظامِ مصطفی کو دیکھیں کہ اس میں شادی کے لیے لڑکی والوں پر کوئی خرچ ہے ہی نہیں۔ لڑکا مہر، نان نفقے اور رہنے کے لیے گھر کا انتظام کرے اور نکاح کر لے۔ کھانا دانا بھی لڑکی والوں کے ذمے نہیں بلکہ لڑکا اپنی حیثیت اور استطاعت کے مطابق ولیمہ کرے۔

آپ خود اندازہ کریں کہ جس نظام نے خودکشی کے سارے اسباب کا خاتمہ کر دیا ہے، جس معاشرے میں وہ نظام نافذ ہو کیا اس میں کسی شخص کے دل میں کبھی بھی خودکشی کا

خیال آسکتا ہے؟ قرآنی آیات اور احادیث مبارکہ میں خودکشی کے تعلق سے بار بار مذمتیں آئی ہیں اور خودکشی کرنے والوں کے تعلق سے دل گداز سزاؤں اور عذابوں کا ذکر ہوا ہے۔

اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو

امن یہی ہے کہ جان و مال اور عزت و آبرو کا تحفظ ہو اور انھیں ضائع ہونے سے بچایا جائے۔ اس سلسلے کی ایک کڑی اپنی جان کی حفاظت کرنا اور اس کو ہلاکت سے بچانا بھی ہے۔ فرمانِ قرآن ہے:

وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ۔ (سورۂ نساء، آیت:۱۹۵)

ترجمہ: اور اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو۔ (کنزالایمان)

مذکورہ آیت میں اس بات کا ذکر ہے کہ اپنے ہاتھ سے کوئی ایسا کام نہ کرو جو تمھاری ہی ہلاکت کا باعث بنے۔ آج دنیا بھر میں خودکشی کے رجحانات عام ہو چکے ہیں، چھوٹی چھوٹی باتوں اور معمولی تکلیفوں کی بنیاد پر لوگوں کے دلوں میں خودکشی کے خیالات آنے لگتے ہیں، جب کہ یہ مصیبت سے نمٹنے کی صورت نہیں۔ دوسری چیزیں ضائع ہو جائیں تو ان کو دوبارہ حاصل کرنا ممکن ہے مگر جان ضائع ہوئی تو نہ اب جان واپس لائی جا سکتی ہے اور نہ دوسری چیزیں مل سکتی ہیں بلکہ اپنی چیزیں بھی اب حقیقت میں دوسروں کی ہو جاتی ہیں۔ خودکشی کو حرام قرار دے کر جانوں کے تحفظ کو یقینی بنایا گیا ہے اور اپنی جان کی حفاظت کا حکم دیا گیا ہے۔

خودکشی کرنے والے پر جنت حرام ہے

خودکشی کا خیال کسی بھی انسان کے ذہن میں اسی لیے آتا ہے کہ وہ سوچتا ہے کہ جان دے کر اسے مصیبت سے چھٹکارا مل جائے گا لیکن اسے سمجھ لینا چاہیے کہ دنیا کی مصیبت سے بھاگنے کے لیے وہ خودکشی تو کر لے گا لیکن آخرت کی مصیبت اس پر مسلط کر دی جائے گی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے خود کو پہاڑ سے گرا کر ہلاک کیا وہ دوزخ میں جائے گا، ہمیشہ اس میں گرتا رہے گا اور ہمیشہ ہمیشہ وہیں رہے گا۔ جس شخص نے زہر کھا کر اپنے آپ کو ختم کیا تو وہ زہر دوزخ میں بھی اس کے ہاتھ میں ہوگا جسے وہ دوزخ میں کھاتا ہوگا اور ہمیشہ ہمیشہ وہیں رہے گا اور جس شخص نے اپنے آپ کو لوہے کے ہتھیار سے قتل کیا تو وہ ہتھیار اس کے ہاتھ میں ہوگا جسے وہ دوزخ کی آگ میں ہمیشہ اپنے پیٹ میں مارتا رہے گا اور ہمیشہ ہمیشہ وہیں رہے گا۔

(صحیح البخاری، حصہ ہفتم، ص: ۱۳۹)

دنیا میں جس عمل کے ذریعے خودکشی کی ہے اسے جہنم میں اسی کام کے ذریعے عذاب دیا جائے گا اور وہ بار بار موت کی سختیوں سے دوچار ہوگا۔ موت کی سختیوں کے تعلق سے ملتا ہے کہ جس طرح بھیگے ہوئے اون کو کسی خاردار جھاڑی میں پھنسا دیا جائے اور پھر اس جھاڑی کو کھینچا جائے تو کتنی مشکل سے وہ جھاڑی اس اون کے الجھاو سے نکلے گی۔ یہی حال روح کے بدن سے نکلنے کا ہوتا ہے۔ جو شخص خودکشی کرتا ہے اسے بار بار خودکشی کرنے کی سزا ملے گی اور پھر وہ کتنی سختیاں برداشت کرے گا اس کا ہم اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔

خودکشی کرنے والے کی نماز جنازہ نہیں پڑھی

خودکشی کس قدر سنگین جرم ہے اس کا اندازہ اس سے بخوبی لگا سکتے ہیں کہ خودکشی کرنے والے شخص کا جنازہ لایا گیا تو سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھی۔ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، کہتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص کا جنازہ لایا گیا جس نے اپنے آپ کو نیزے سے ہلاک کر لیا تھا۔ آپ نے اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھی۔ (صحیح مسلم، حصہ دوم، ص: ۶۷۲)

اس حدیث میں نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا اس کی نمازِ جنازہ نہ پڑھنا اس جرم کی سنگینی بیان کرنے کے لیے ہے ورنہ خودکشی کرنے والے کی نماز جنازہ بھی پڑھی جائے گی۔ ہوسکتا ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام کے سامنے اس کی سنگینی کا اظہار فرمانے کے لیے خود نماز جنازہ نہ پڑھی ہو اور صحابہ سے فرمایا ہو کہ وہ پڑھ لیں۔ جیسا کہ دیگر احادیث کے الفاظ سے پتہ چلتا ہے۔

سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے معاشرے کو جرائم سے پاک کرنے اور اسے امن وسکون کا گہوارہ بنانے کے لیے ان جرائم پر سخت پابندی عائد فرمائی اور امن وسکون سے بھرپور معاشرہ قائم فرمایا۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نزدیک مسلمان اور مومن وہی شخص ہے جو تمام انسانیت کے لیے پیکرِ امن وسلامتی اور باعثِ خیر وعافیت ہو اور اَمن وامان، تحمل وبرداشت، بقاے باہمی اور احترامِ آدمیت جیسے اوصاف سے متصف بھی ہو۔ اسی لیے سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جرائم پر حدود وتعزیرات نافذ فرمائیں اور ان کے لیے اخروی عذاب کا بھی تذکرہ فرمایا تا کہ جرائم کا سد باب یقینی ہو جائے اور معاشرے میں امن برقرار رہے۔

دسواں باب

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نظام امن نے بین الاقوامی امن کو پختگی عطا کی

عالمی سطح پر امن کی بحالی کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ جنگ وجدال، قتل وقتال، دشمنوں کے ساتھ مراسلت وسفارت وغیرہ امور سے متعلق اصول وضوابط اور قواعد وقوانین

ہوں۔ اسی طرح اہلِ قتال اور غیر اہلِ قتال کا تعین ہو۔ سرورِ کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی جلوہ گری سے پہلے یہ سارے معاملات بالکلیہ بدنظمی کے شکار تھے۔ ان امور کے لیے دنیا کے پاس کچھ اصول وضوابط نہیں تھے اور اگر کسی کے پاس تھے بھی تو جامع نہیں تھے یا پھر تعصب اور بھید بھاؤ کے بھینٹ چڑھ جایا کرتے تھے۔

ایسے ماحول میں بین الاقوامی امن کی بحالی کے لیے سرور دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جو اصول وضوابط فراہم کیے وہ ہر اعتبار سے جامع تھے اور ظلم وزیادتی، تعصب اور بھید بھاؤ سے بالکل پاک تھے۔

سفیروں کا قتل سنگین جرم قرار دیا گیا

بین الاقوامی سطح پر پیغام رسانی کا کام سفیر کرتا ہے اور اپنے ملک یا سلطنت کو دوسرے ملک یا سلطنت سے جوڑنے میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ دشمن ملک یا سلطنت کی طرف سے آنے والا سفیر کافر اور قابلِ قتل ہی ہوگا لیکن اگر وہ سفارت کے لیے آیا ہے تو سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کے قتل کی ممانعت فرمائی ہے۔ اس لیے کہ سفیر جس ملک یا سلطنت کی طرف سے بھیجا گیا ہے وہ اس کی نمائندگی کرنے والا ہوتا ہے اور کسی نمائندے کو قتل کرنا گویا اس ملک کے بادشاہ کو قتل کرنا ہے۔

مسیلمۂ کذاب کے سفیروں کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معاملہ

یہاں تک کہ مسیلمۂ کذاب کی طرف سے بھی جو لوگ سفیر بن کر آئے تھے اور سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سامنے انھوں نے دلیری اور جراءت مندی کا مظاہرہ کیا تھا آپ نے انھیں اس کے باوجود امن وامان کے ساتھ واپس جانے دیا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ابن نوّاحہ اور ابن

اُثال مسیلمہ کے سفیر بن کر رسولِ گرامی وقار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان دونوں سے فرمایا: کیا تم گواہی دیتے ہو کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟ ان دونوں نے کہا: ہم گواہی دیتے ہیں کہ مسیلمہ اللہ کا رسول ہے۔ نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کی بات سن کر فرمایا:

اٰمَنۡتُ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ لَوۡ كُنۡتُ قَاتِلًا رَسُوۡلًا لَقَتَلۡتُكُمَا۔

ترجمہ: میں اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا۔ اگر میرے لیے سفیر کو قتل کرنا درست ہوتا تو میں ابھی تم دونوں کو قتل کر دیتا۔

راویِ حدیث حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

فَمَضَتِ السُّنَّةُ اَنَّ الرُّسُلَ لَا تُقۡتَلُ۔

ترجمہ: اس وقت سے یہ قانون بن گیا کہ سفیر کا قتل نہیں کیا جائے گا۔

(مسند احمد، حصہ ششم، ص: ۳۰۶)

مُسیلمہ جو جھوٹا مدعیِ نبوت تھا اس کے سفیر جو اس کو رسول مان کر صریح کفر پر تھے اس کے باوجود چوں کہ وہ سفیر تھے اس لیے سرورِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کے قتل سے گریز فرمایا۔ اسی وقت سے سفیروں کے قتل نہ کیے جانے کا قانون اور ضابطہ بن گیا اور اب تک یہ قانون ہر ملک وملت میں جاری ہے۔

اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ سفیر کا قتل اس کے ملک میں اشتعال پیدا کر سکتا ہے اور پھر جنگ وجدال کا ماحول گرم ہوگا اور امن وامان کا خاتمہ ہوگا۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اگر سفیر کو امان نہیں ہوگا تو پھر کسی بھی ملک کی طرف پیغام رسانی ناممکن ہو جائے گی اس لیے سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہ نظام قائم فرما دیا کہ سفیروں کو امان ہے۔

بدعہدی کی ممانعت

وعدہ خلافی چاہے کسی کے ساتھ بھی ہو نظامِ مصطفیٰ میں اسے عملِ شنیع قرار دیا گیا ہے۔اس کی تفصیل پیچھے گزر چکی ہے کہ قانونِ مصطفی میں وعدہ پورا کرنے کی کس قدر تاکید ہےاور وعدہ خلافی کومومنانہ شان کے خلاف منافقانہ کردارقرار دیا گیا ہے۔ بدعہدی تو وعدہ خلافی سے بھی بڑھ کر ہے کہ وعدہ خلافی کا معاملہ فرد یا بعض افراد سے متعلق ہوتا ہے لیکن بدعہدی کا معاملہ کسی ملک یا سلطنت سے متعلق ہوتا ہے۔

کسی مُعاہد کا قتل کرنا جائز نہیں

جس قوم کے ساتھ مسلمانوں کا معاہدہ ہے اس قوم کے کسی فرد کا قتل کرنا جائز نہیں ہے۔اگر وہ کوئی جرم کرتا ہے اور اسلامی قانون کی زد میں آتا ہے تو خلیفۃ المسلمین یا بادشاہِ اسلام حسبِ قانون اسے قتل کرسکتا ہے، عام حالات میں کسی فرد کے لیے معاہدین میں سے کسی کو قتل کرنا جائز نہیں ہے۔اگر کسی نے ایسا کیا تو اس پر دنیوی احکام تو نافذ ہوں گے ہی آخرت میں اس کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا اس کا ذکر اس حدیث میں دیکھیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ نبیِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مَنْ قَتَلَ مُعَاهِدًا لَمْ يَرِحْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ وَإِنَّ رِيْحَهَا لَيُوْجَدُ مِنْ مَسِيْرَةِ أَرْبَعِيْنَ عَامًا ۔ (صحیح البخاری، حصہ چہارم،ص:۹۹)

ترجمہ: جس کسی نے معاہدے میں شریک کسی فرد کو قتل کیا، وہ جنت کی خوشبو نہ پا سکے گا اگر چہ اس کی خوشبو چالیس سال کے سفر کے فاصلے سے بھی آجاتی ہے۔

یعنی جنت میں داخل ہونا تو کیا اسے جنت کی خوشبو بھی میسر نہیں آسکتی ہے جب کہ

جنت کی خوشبو دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔

ابو رافع کو واپس لوٹا دیا

سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے چہرۂ انور پر پیغمبرانہ جاہ وجلال کے آثار نمایاں تھے، اگر آپ کو کوئی شخص حق شناس نگاہوں سے دیکھ لیتا تو اس کے دل میں آپ کی عظمت جاگزیں ہو جاتی اور پھر وہ اپنے آپ کو اسلام میں داخل ہونے سے نہیں روک پاتا۔

حضرت ابو رافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے اسلام لانے کا واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ مجھے قریش نے سفیر بنا کر سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمتِ عالیہ میں بھیجا۔ جب میں نے رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیکھا تو میرے دل میں اسلام کی عظمت جاگزیں ہوگئی۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیک وسلم! میں ان کے پاس ہرگز واپس نہیں جاؤں گا۔ یہ سن کر رسولِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِنِّیْ لَا اَخِیْسُ بِالْعَھْدِ وَلَا اَحْبِسُ الْبُرُدَ وَلٰکِنِ ارْجِعْ فَاِنْ کَانَ فِیْ نَفْسِکَ الَّذِیْ فِیْ نَفْسِکَ الْاٰنَ فَارْجِعْ۔

ترجمہ: میں معاہدہ نہیں توڑ سکتا اور نہ ہی سفیر کو روک سکتا ہوں۔ تم واپس چلے جاؤ، پھر اگر تمھارے دل میں اسلام قبول کرنے کی طرف آمادگی ہوگی تو لوٹ آنا۔

حضرت ابو رافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: میں واپس لوٹ گیا، پھر نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور داخلِ اسلام ہو گیا۔

(سنن ابی داؤد، حصہ سوم، ص: ۸۲)

یہ غالباً صلحِ حدیبیہ کے بعد کا واقعہ ہے کہ صلح کے معاہدے میں یہ بات مذکور تھی کہ اگر مکے سے کوئی شخص مدینے آئے تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اسے روک نہیں سکتے ہیں بلکہ

اسے واپس بھیجنا ہوگا اس لیے معاہدے کی خلاف ورزی سے سرکارِ ابد قرار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے گریز فرمایا۔

عہد شکنی پر عذاب

قیامت کے دن سب سے مشکل اس کے لیے ہوگی جس کے عیوب سب کے سامنے ظاہر کر دیے جائیں گے اور وہ دنیا میں کیسے زندگی گزارتا تھا یہ کھول کر سامنے رکھ دیا جائے گا۔ جس کسی نے دنیا میں عہد شکنی کی ہوگی قیامت کے دن اس کے نام کا جھنڈا لگایا جائے گا جس پر اس کا نام لکھا ہوگا اور لوگ دیکھ کر پہچان لیں گے کہ فلاں شخص نے دنیا میں کسی کے ساتھ عہد شکنی کی تھی۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ سرورِ دو جہاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اِنَّ الْغَادِرَ يُنْصَبُ لَهٗ لِوَاءٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَيُقَالُ: هٰذِهٖ غَدْرَةُ فُلَانِ بْنِ فُلَانٍ۔ (سنن ابی داؤد، حصہ سوم، ص: ۸۲)

ترجمہ: قیامت کے دن عہد شکنی کرنے والے کے نام سے جھنڈا نصب کر دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ یہ فلاں بن فلاں کی بدعہدی کی علامت ہے۔

کتنی ذلت کی بات ہوگی اس شخص کے لیے جس کے بارے میں سب کو پتہ چل جائے گا کہ اس نے دنیا میں فلاں کام کیا تھا جس کی بنیاد پر اس کے نام کی نشانی لگائی گئی ہے۔

ان روایات سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بدعہدی اور عہد شکنی پر سرورِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پابندی لگائی اور اس کو شنیع عمل قرار دیا چاہے بھلے ہی وہ دشمنوں کے ساتھ کیوں نہ کی جائے۔

قیدیوں کے قتل کی ممانعت

جنگ کے دوران یہ نظام ہوا کرتا تھا کہ جس گروہ کو جنگ میں ہزیمت ہوتی اُن میں سے جس قدر لوگوں کی گرفتاری ممکن ہوتی انھیں گرفتار کرلیا جاتا۔ اگر آپ تاریخِ عالم کا مطالعہ کریں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی جلوہ گری سے پہلے قیدیوں کے ساتھ اس قدر وحشیانہ سلوک کیا جاتا کہ اس کی داستان ناقابلِ بیان ہے۔ آقائے رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہ ماحول قائم فرمایا کہ قیدیوں کے ساتھ بھی حسنِ سلوک کیا جائے۔ اس کا نتیجہ دنیا نے دیکھا کہ قید میں آنے والے اسلامی تعلیمات سے متأثر ہوکر حلقۂ اسلام میں داخل ہوگئے۔

بلاضرورت قیدیوں کے قتل کی بھی ممانعت ہے

جنگ میں دشمنوں کی طرف سے جن لوگوں نے حصہ لیا ہے میدانِ کارزار میں انھیں جہاں بھی پایا جائے گا قتل کردیا جائے گا۔ لیکن جب انھیں ہزیمت ہو اور قیدی بنا لیے جائیں تو علی العموم قتل سے سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے منع فرمایا۔

حضرت عطیہ قرظی بیان فرماتے ہیں:

عُرِضْنَا عَلٰى رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ قُرَيْظَةَ، فَكَانَ مَنْ اَنْبَتَ قُتِلَ، وَمَنْ لَمْ يُنْبِتْ خُلِّيَ سَبِيْلُهٗ، فَكُنْتُ فِيْ مَنْ لَمْ يُنْبِتْ فَخُلِّيَ سَبِيْلِيْ۔ (سنن ابن ماجہ، حصہ دوم، ص:۸۴۹)

ترجمہ: غزوۂ بنوقریظہ کے دن ہمیں قیدی بنا کر سرکارِ ابدقرار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا گیا، تو جس کے موئے زیرِ ناف آچکے تھے اسے قتل کردیا جاتا تھا اور جس کے نہیں آئے تھے اسے قتل نہیں کیا جاتا تھا۔ میں ان لوگوں میں سے تھا جن کے موئے زیر

ناف نہیں آئے تھے تو مجھے بھی قتل نہیں کیا گیا۔

موے زیر ناف کا آ جانا بالغ ہو جانے کی علامت ہے، نابالغ سے عموماً کوئی خطرہ نہیں ہوتا ہے اور اسے صحیح ماحول مل جائے تو اس کے راہِ راست پر آنے کی بھی امید ہوتی ہے اس لیے نابالغوں کا قتل کرنا اگرچہ درست تھا مگر سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مذکورہ مصلحتوں کے پیش نظر انھیں قتل نہیں کیا۔ پھر آپ دیکھیے کہ خود راویِ حدیث حضرت عطیہ قرظی رضی اللہ تعالیٰ عنہ داخلِ اسلام ہوئے۔

قیدیوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک کی ممانعت

دین اسلام سے پہلے یہ رواج چلا آ رہا تھا کہ جنگ کی صورت میں فاتح مفتوح کے تمام جنگی قیدیوں کو غلام بنا لیا کرتا تھا اور ان کے ساتھ نہایت ہی غیر انسانی سلوک کیا کرتا تھا۔ نہ صرف فوجیوں کو بلکہ ان کے ساتھ ساتھ مفتوحہ ممالک کے عام لوگوں کو بھی غلام بنا لیا جاتا تھا۔ اسلامی قانون میں قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک کرنے کا حکم ہے اس کا ذکر قرآنِ مقدس کی اس آیت میں دیکھیں:

فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۙ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً ۔ (سورۂ محمد، آیت: ۴)

ترجمہ: تو مضبوط باندھو۔ پھر اس کے بعد چاہے احسان کر کے چھوڑ دو چاہے فدیہ لے لو۔ (کنزالایمان)

اس آیۂ مقدسہ میں فرمایا گیا کہ انھیں احسان کر کے بھی چھوڑا جا سکتا ہے اور اگر فدیہ لینا چاہیں تو ان سے فدیہ لے کر بھی ان کو رہائی دی جا سکتی ہے۔ اس میں قابلِ غور یہ ہے کہ احسان کا ذکر پہلے آیا ہے اور فدیہ لینے کا ذکر بعد میں آیا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ قیدیوں کے ساتھ بھی بہتر سلوک کرنا اسلامی تعلیمات میں سے ہے۔

مُقَاتِل اور غَیر مُقَاتِل میں فرق

یہ پیغمبرِ امن، حضور رحمتِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نظامِ امن کی خاصیت ہے کہ آپ نے اہلِ قتال اور غیر اہلِ قتال میں تفریق فرمائی ہے۔ یہ تفریق نظامِ مصطفیٰ کے علاوہ اور کسی نظام میں نہیں تھی۔ دیگر اقوام کی جنگوں کا حال یہ تھا کہ ان کے سامنے جو بھی آ گیا بلا تفریق اس کا قتل کرتے چلے جاتے تھے، بوڑھوں، بچوں، عورتوں، مریضوں اور مذہبی پیشواؤں کو بھی وہ نہیں بخشتے تھے۔ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جنگی نظام میں اہلِ قتال اور غیر اہلِ قتال کی تفریق فرمائی اور آپ نے جنگی ہدایات میں واضح فرما دیا کہ کس کا قتل کیا جائے گا اور کس کے قتل سے ہاتھوں کو روکا جائے گا۔

اہل قتال وہ ہیں جو جنگ میں عملاً حصہ لیتے ہیں اور غیر اہل قتال وہ ہیں جو جنگ میں حصہ نہیں لے سکتے مثلاً عورتیں، بچے، بیمار، زخمی، اندھے، مقطوع الاعضاء، معذور، مجنون، سیاح، خانقاہ نشین، زاہد، معبدوں اور مندروں کے مجاور، ایسے ہی دوسرے بے ضرر لوگ۔ پیغمبرِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پہلے طبقے یعنی اہلِ قتال کو جنگ میں قتل کرنے کا حکم دیا اور دوسرے طبقے یعنی غیر اہلِ قتال کے قتل سے منع فرمایا۔

عورتوں، بچوں اور اجیروں کے قتل سے ممانعت

عورتیں، چھوٹے بچے اور گھریلو خدام بھی عموماً جنگ میں حصہ نہیں لیتے، عورتیں فطری طور پر جنگی صلاحیت نہیں رکھتی ہیں اور گھریلو خدام بھی جنگ کے طریقوں سے ناواقف ہوتے ہیں۔ چھوٹے بچوں کے اندر تو ویسے ہی لڑنے کی طاقت نہیں ہوتی ہے۔ اس لیے نبی آخر الزماں سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے عالمی امن کی بقا کے لیے عورتوں، بچوں اور اجیروں کے قتل سے منع فرمایا۔

حضرت حنظلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں: ہم نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ غزوہ کیا، ہم نے دیکھا کہ ایک مقتول عورت کے پاس لوگ جمع ہیں۔ لوگوں نے سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیکھا تو آپ کے لیے جگہ بنا دی۔ آپ نے اس عورت کو دیکھا تو فرمایا: یہ تو اہلِ قتال میں سے نہیں تھی۔ پھر آپ نے ایک شخص سے فرمایا: خالد بن ولید سے جا کر کہہ دو کہ چھوٹے بچوں اور اجیروں کو قتل نہ کریں۔

(سنن ابن ماجہ، حصہ دوم، ص: ۹۴۸)

البتہ اگر کوئی عورت یا اجیر میدانِ جنگ میں تلوار اٹھالے تو اسے قتل کرنے پر کوئی پابندی بھی نہیں ہے اس لیے وہ مدِ مقابل آیا ہے۔

بوڑھوں کے قتل سے ممانعت

جو کوئی اس قدر بوڑھا ہو چکا ہے کہ اب جنگ میں ہتھیار نہیں اٹھا سکتا ہے اور وہ کسی طور پر بھی جنگ میں حصہ لینے سے قاصر ہے تو اسے بھی قتل کرنے سے منع فرمایا گیا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب کوئی لشکر روانہ فرماتے تو انھیں یہ ہدایت دیتے:

لَا تَقْتُلُوْا شَيْخًا فَانِيًا وَّلَا طِفْلًا صَغِيْرًا۔ (سنن ابی داوٗد، حصہ سوم، ص: ۳۷)

ترجمہ: کسی شیخِ فانی اور چھوٹے بچے کو قتل مت کرنا۔

شیخِ فانی کے قتل کی ممانعت بھی اسی لیے ہے کہ اس سے ضرر پہنچنے کا اندیشہ نہیں ہوتا ہے۔ اس لیے سیدِ کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے شیخِ فانی کو غیر اہلِ قتال میں شمار کیا۔

جہاد کے پُر امن اصول

دورِ جاہلیت میں عمومًا یہ ماحول تھا کہ لوگ جنگ وجدال کے دوران اس علاقے

میں حد درجہ تباہی مچا دیا کرتے تھے۔شرکاے جنگ کے ساتھ بھی ایسا وحشیانہ سلوک کرتے کہ دیکھ کر روح کانپ اٹھے۔سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دورِ جاہلیت کی ان خرافات پر پابندی عائد فرمائی اور جنگ کے دوران ان سبھی جاہلانہ رسوم سے منع فرما دیا جن میں کوئی دینی یا دنیوی فائدہ نہ ہو۔

غفلت میں حملہ کرنے سے احتراز کا حکم

عرب میں قاعدہ تھا کہ راتوں کو اور خصوصاً رات کے آخری حصے میں جب لوگ سو رہے ہوتے اچانک حملہ کر دیتے تھے۔رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا اور آپ کا خود بھی یہی معمول تھا کہ اگر رات کے وقت پہنچ بھی جاتے تو جنگ شروع کرنے کے لیے صبح ہونے کا انتظار فرماتے۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں:

كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا غَزَا قَوْمًا لَمْ يُغِرْ حَتّٰى يُصْبِحَ۔ (صحیح البخاری، حصہ چہارم، ص:۷۴)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا یہ معمول تھا کہ آپ جب بھی کسی قوم سے جہاد فرماتے، تو جب تک صبح نہ ہو جاتی حملہ نہیں فرماتے تھے۔

غفلت میں کسی پر حملہ کر کے غالب آجانا دراصل بزدلی کا کام ہے اور مدِ مقابل کو سخت تکلیف پہنچانا ہے۔آقاے رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اسے بھی تکلیف پہنچانے سے احتراز فرمایا جو میدانِ جنگ میں مدِ مقابل ہے۔

آگ میں جلانے سے ممانعت

زمانۂ جاہلیت میں جنگی دستوروں میں سے یہ بھی تھا کہ دشمن گرفت میں آجاتا تو بارہا

لوگ اسے جذبۂ انتقام میں آگ میں جلا دیا کرتے تھے یا پھر دشمنوں کی لاشوں کو آگ میں جلا دیا کرتے تھے۔ سرکارِ ابد قرار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان دونوں باتوں سے منع فرمایا۔

حضرت حمزہ اسلمی بیان فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مجھے ایک سَرِیَّہ کا امیر بنا کر بھیجا۔ روانہ فرماتے وقت آپ نے فرمایا: فلاں شخص مل جائے تو اسے آگ میں جلا دینا۔ جب میں آگے بڑھا تو آپ نے مجھے آواز دی، میں واپس آیا تو آپ نے مجھ سے ارشاد فرمایا: إِنْ وَجَدْتُمْ فُلَانًا فَاقْتُلُوْهُ وَلَا تُحْرِقُوْهُ، فَإِنَّهٗ لَا يُعَذِّبُ بِالنَّارِ إِلَّا رَبُّ النَّارِ۔ (سنن ابی داؤد، حصہ سوم، ص: ۵۴)

ترجمہ: فلاں شخص کو پانا تو قتل کر دینا، آگ میں مت جلانا اس لیے کہ آگ کا عذاب آگ کے پیدا کرنے والے کے علاوہ کوئی نہیں دے سکتا ہے۔

یہ تو انسانوں کے جلانے کی بات ہے۔ کسی جنگ کے موقع پر بعض حضرات نے چیونٹیوں کے جتھے پر آگ لگا دی تھی تو حضور رحمۃ للعالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انھیں اس سے بھی منع فرمایا اور یہی ارشاد فرمایا تھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے علاوہ کسی اور کے لیے ہرگز درست نہیں کہ کسی کو آگ کا عذاب دے۔

ہاتھ باندھ کر قتل مت کرنا

دشمن کو باندھ کر قتل کرنا گویا اسے اس کی مکمل مغلوبی کا احساس دلا کر قتل کرنا ہوگا۔ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس سے بھی منع فرمایا ہے۔

حضرت ابنِ تِعلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: ہم نے حضرت عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید کے ساتھ غزوہ کیا، آپ کے پاس دشمنوں میں سے چار جوان پکڑ کر لائے تھے، حضرت عبدالرحمٰن نے حکم دیا کہ انھیں باندھ کر قتل کر دو۔ جب حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ

تعالیٰ عنہ کو یہ بات معلوم ہوئی تو آپ نے فرمایا:

سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْهٰى عَنْ قَتْلِ الصَّبْرِ، فَوَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَوْ كَانَتْ دَجَاجَةٌ مَا صَبَرْتُهَا۔

ترجمہ: میں نے سنا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کسی کو باندھ کر قتل کرنے سے منع فرمایا ہے۔ خدا کی قسم اگر مرغی بھی ہوتی تو میں باندھ کر قتل نہیں کرتا۔

یہ بات کسی نے حضرت عبدالرحمٰن بن خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو بتائی تو انھوں نے چاروں غلاموں کو آزاد فرمایا۔ (سنن ابی داؤد، حصہ سوم، ص:۶۰)

لوٹ مار سے منع فرمایا گیا

فتح حاصل ہونے کے بعد دشمن کا چھوڑا ہوا مال غنیمت ہوتا ہے اور اسے اس کے حصے داروں میں ارشادِ الٰہی کے مطابق تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس مال کو اس طور پر لوٹنے سے منع کیا گیا ہے کہ جسے جتنا مل جائے وہ اس کا ہو جائے، بلکہ اسے پُرسکون انداز میں یکجا کیا جائے گا پھر حصے داروں میں برابر برابر تقسیم کیا جائے گا۔

حضرت ابولبید فرماتے ہیں:

كُنَّا مَعَ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ سَمُرَةَ بِكَابُلَ فَأَصَابَ النَّاسُ غَنِيْمَةً فَانْتَهَبُوْهَا فَقَامَ خَطِيْبًا فَقَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْهٰى عَنِ النُّهْبٰى فَرَدُّوْا مَا أَخَذُوْا فَقَسَمَهٗ بَيْنَهُمْ۔ (سنن ابی داؤد، حصہ سوم، ص:۶۶)

ترجمہ: ہم لوگ حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ مقام کابل میں تھے، لوگوں کے ہاتھ مالِ غنیمت لگا تو لوگ اسے لوٹنے لگے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرمایا اور کہا: میں نے رسولِ اکرم صلی اللہ

تعالیٰ علیہ وسلم کو لوٹ مار سے منع فرماتے ہوئے سنا ہے۔ تو لوگوں نے لوٹا ہوا پورا مال لوٹا دیا، اس کے بعد انھوں نے ان کے درمیان تقسیم فرما دیا۔

ذِمیین کے اموال حلال نہیں

ذِمی یعنی وہ کفار جو دارُ الاسلام میں جزیہ دے کر رہتے ہوں انھیں بھی اسلامی ملک کے شہریوں کے حقوق دیے جاتے ہیں۔ اگر انھوں نے معاہدے کی خلاف ورزی کی اور ان کے ساتھ جنگ کی نوبت پہنچ گئی تب بھی ان کے ساتھ کسی طرح کی زیادتی جائز نہیں ہے۔

حضرت عِرباض بن ساریہ سُلمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں: ہم نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ خیبر کا محاصرہ کیا، اُس وقت صحابہ کی ایک جماعت سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ تھی۔ خیبر کا سردار بڑا سرکش اور ناپسند انسان تھا۔ وہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس آیا اور بولا: اے محمد! (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کیا آپ لوگوں کو ہمارے جانور ذبح کرنے، ہمارے پھلوں کے کھانے اور ہماری عورتوں کے مارنے کی اجازت دیتے ہیں؟ یہ سن کر سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ناراض ہوئے اور فرمایا: اے ابنِ عوف! اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر جاؤ اور ندا کر دو کہ جنت صرف مومنین کے لیے حلال ہے اور سب سے کہہ دو کہ نماز کے لیے جمع ہو جائیں۔

جب سب لوگ جمع ہو گئے تو آقاے رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی اور فرمایا: کچھ لوگ تختوں پر ٹیک لگائے یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن میں جو کچھ ہے ان کے علاوہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے کچھ بھی حرام نہیں فرمایا ہے۔ آگاہ ہو جاؤ! خدا کی قسم میں نے بھی تمھیں جو نصیحتیں کی ہیں، جن باتوں کا حکم دیا ہے اور جن کاموں سے منع کیا ہے وہ سب بھی قرآن ہی کے اوامر ونواہی کی طرح ہیں بلکہ بعض تو ان سے بڑھ کر بھی ہیں۔ اہلِ کتاب جزیہ دے

رہے ہوں تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمھارے لیے یہ حلال نہیں فرمایا کہ تم ان کے گھروں میں اجازت کے بغیر داخل ہو جاؤ، ان کی عورتوں کو مارو اور ان کے پھلوں کو کھاؤ۔

(سنن ابی داؤد، حصہ سوم، ص: ۱۷۰)

یہ نظام سرکارِ ابد قرار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا قائم کیا ہوا ہے کہ آپ نے جنگ اور محاصرے کے وقت بھی دشمنوں پر کسی بھی طرح کا ظلم روا نہیں رکھا ہے۔

جنگ کے دوران بھی تباہ کاری ممنوع تھی

تقریباً ساری قوموں کا یہ مزاج تھا کہ فوج کی پیش قدمی کے وقت فصلوں کو خراب کرنا، کھیتوں کو تباہ کرنا، بستیوں میں قتل عام، آتش زنی کرنا اور خوف ودہشت سے زمین کو بھر دینا جنگجو گروہوں میں عام بات تھی بلکہ آج بھی افواج کا یہی مزاج ہے۔ آقاے رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نظام میں اسے بھی فساد قرار دیا گیا ہے اور اس طرح کے کاموں سے منع فرمایا گیا ہے۔ فرمانِ قرآن ہے:

وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِى الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَ يُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ○ (سورۂ بقرہ، آیت: ۲۰۵)

ترجمہ: اور جب پیٹھ پھیرے تو زمین میں فساد ڈالتا پھرے اور کھیتی اور جانیں تباہ کرے اور اللہ فساد سے راضی نہیں۔ (کنز الایمان)

نظامِ مصطفی میں جنگ کی اجازت مصلحت کے تحت ہے اس لیے جنگ کے سارے معاملات میں اس مصلحت کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ جہاں کہیں اس کے خلاف کوئی بھی معاملہ ہوا اور فساد کی صورت بنتی نظر آئی تو اس پر سختی سے پابندی لگا دی گئی۔

مُثلہ بنانا جرم قرار دیا گیا

پہلے یہ دستور تھا کہ دشمنوں کی لاشوں کی بڑی بے حرمتی کی جاتی تھی، ان کے اعضا کاٹ کر ہار بنا کر پہننا، ان کی ناک اور کان کاٹ دینا، چہرے مسخ کر دینا وغیرہ کاموں کو بہادری سمجھا جاتا تھا۔ جب کہ یہ سب کام بالکل بے سود تھے اور ان سے کسی طرح کا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا تھا۔ کس قدر بدعقلی تھی کہ ایک شخص جو قتل ہو چکا ہے اس کے ساتھ اس طرح کا سلوک کیا گیا تو اس سے اس کو کیا تکلیف پہنچے گی؟ آقاے رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس سے سختی سے منع فرمایا۔ حضرت عبداللہ بن یزید انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: نَهَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ النُّهْبٰى وَالْمُثْلَةِ۔

(سنن النسائی، حصہ ہفتم، ص:۱۰۱)

ترجمہ: رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوٹ مار اور مثلہ بنانے سے منع فرمایا۔

سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جہاد کے لیے فوج روانہ فرماتے تو انھیں جو ہدایات فرماتے تھے ان میں سے یہ بھی تھی:

اُغْزُوْا وَلَا تَغْدِرُوْا وَلَا تَغُلُّوْا وَلَا تُمَثِّلُوْا۔ (سنن ابن ماجہ، حصہ دوم، ص:۹۵۳)

ترجمہ: غزوہ کرو، غدر مت کرو، غنیمت میں خیانت مت کرو اور مثلہ مت بناؤ۔

بدنظمی اور انتشار کی ممانعت

اہلِ عرب کی عادت تھی کہ جب جنگ کو نکلتے تو راستے میں جو بھی ملتا اسے تنگ کرتے اور جب کسی جگہ اُترتے تو ساری منزل پر پھیل جاتے تھے یہاں تک کہ راستوں پر چلنا مشکل ہو جاتا تھا۔ آقاے رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا۔

حضرت انس جُہنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں: میں نے رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ فلاں فلاں غزوہ کیا، ایک غزوے میں لوگوں نے منزلوں اور

راستوں کو تنگ کر دیا۔

نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایک شخص کو حکم فرمایا کہ جا کر لوگوں میں ندا کر دو:

مَنْ ضَيَّقَ مَنْزِلًا اَوْ قَطَعَ طَرِيْقًا فَلَا جِهَادَلَهٗ۔

(سنن ابی داؤد، حصہ سوم، ص:۴۱)

ترجمہ: جس نے منزلوں کو تنگ کر دیا یا راستوں کو تنگ کر دیا تو اس کے لیے جہاد کا کوئی ثواب نہیں ہے۔

یہاں پر ''قطع طریق'' سے مراد رہزنی اور راہ گیروں کو لوٹنا بھی ہوسکتا ہے۔ دورِ جاہلیت میں یہ بھی رواج تھا۔ اس صورت میں یہاں ممانعت رہزنی سے ہوگی۔

اس تعلق سے ایک روایت حضرت ابوثعلبہ خشنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ لوگ جب کسی مقام پر ٹھہرتے تھے تو گھاٹیوں اور وادیوں میں پھیل جایا کرتے تھے۔ رسولِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِنَّ تَفَرُّقَكُمْ فِيْ هٰذِهِ الشِّعَابِ وَالْاَوْدِيَةِ،
اِنَّمَا ذٰلِكُمْ مِّنَ الشَّيْطَانِ۔

ترجمہ: اس طرح سے تمھارا گھاٹیوں اور وادیوں میں پھیل جانا شیطانی عمل ہے۔

راویِ حدیث بیان کرتے ہیں: اس کے بعد سے نبیِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب بھی کسی وادی میں اترتے تھے تو لوگ اس طرح سے جتھا جما کر قیام کرتے تھے کہ اگر ایک کپڑا ان پر پھیلا دیا جائے تو سب کے لیے کافی ہوجائے۔ (سنن ابی داؤد، حصہ سوم، ص:۴۱)

شور اور ہنگامے سے ممانعت

عرب کی جنگ میں اس قدر شور اور ہنگامہ برپا ہوتا تھا کہ اس کا نام ہی ''غوغا'' پڑ

گیا تھا۔ اسلام لانے کے بعد بھی سابقہ عادت کے مطابق شور وغوغا بلند ہوا تو آقائے رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس سے منع فرما دیا۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ہم نبیِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد کے لیے نکلتے تھے، جب ہم کسی بلند جگہ پر چڑھتے تھے تو تکبیر وتہلیل کہتے تھے جس کی وجہ سے ہماری آوازیں بلند ہو جاتی تھیں۔

نبیِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

يَآاَيُّهَا النَّاسُ ارْبَعُوْا عَلٰى اَنْفُسِكُمْ، فَاِنَّكُمْ لَا تَدْعُوْنَ اَصَمَّ وَلَا غَائِبًا، اِنَّهٗ مَعَكُمْ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ قَرِيْبٌ، تَبَارَكَ اسْمُهٗ وَتَعَالٰى جَدُّهٗ۔

(صحیح البخاری، حصہ چہارم، ص: ۵۷)

ترجمہ: اے لوگو! وقار کے ساتھ چلو، تم جس کو پکار رہے ہو وہ نہ بہرا ہے اور نہ غائب۔ وہ تو تمھارے ساتھ ہے، سب کچھ سنتا ہے اور بہت قریب ہے۔ اس کا نام اونچا اور اس کی عظمت بلند ہے۔

لوگ ذکر وتسبیح کے ساتھ آواز بلند کرتے تھے لیکن راستے میں کسی کو اس آواز سے تکلیف نہ ہو اس لیے آقائے رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ذکر وتسبیح کی آواز کو بھی بلند کرنے سے منع فرما دیا۔

اصولِ جہاد میں اصلاح کے نتائج

ان احکام کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بین الاقوامی امن کی پختگی کے لیے جنگ کو تمام وحشیانہ افعال سے پاک کر دیا جو اس عہد میں جنگ کا لازمی جز بنے ہوئے تھے۔

اسیرانِ جنگ اور سفرا کا قتل، مُردوں کی بے حرمتی، مُعاہدین کا قتل، غیر اہلِ قتال کا قتل، اعضا کی قطع و برید، آگ کا عذاب، لوٹ مار، قطعِ طریق، فصلوں اور بستیوں کی ویرانی و بربادی، بدعہدی اور پیمان شکنی، فوجوں کی پراگندگی اور بدنظمی، لڑائی کا شور اور ہنگامہ سب کچھ آئینِ جنگ کے خلاف قرار دیا گیا اور جنگ صرف ایک ایسی چیز رہ گئی جس میں شریف اور بہادر آدمی دشمن کو کم سے کم ممکن نقصان پہنچا کر اس کے شر کو دفع کرنے کی کوشش کرے۔

اس اصلاحی تعلیم نے آٹھ سال کی قلیل مدت میں جو عظیم الشان نتائج پیدا کیے، اس کا بہترین نمونہ فتحِ مکہ ہے۔

ایک طاقت پر دوسری طاقت کی فتح اور خصوصاً دشمن کے بڑے شہر کی تسخیر کے موقع پر وحشی عرب ہی نہیں بلکہ متمدن روم اور ایران میں بھی جو کچھ ہوتا تھا، اسے پیش نظر رکھیے اس کے بعد غور کیجیے کہ وہی عرب جو چند برس پہلے تک جاہلیت کے طریقوں کے عادی تھے اسی شہر میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوتے ہیں جس سے آٹھ ہی برس پہلے ان کو بری طرح تکلیفیں دے دے کر نکالا گیا تھا اور انھی دشمنوں پر فتح حاصل کرتے ہیں جنھوں نے فاتحوں کو گھر سے بے گھر کرنے پر قناعت نہیں کی تھی بلکہ جس جگہ اُنھوں نے پناہ لی تھی وہاں سے بھی ان کو نکال دینے کے لیے کئی مرتبہ چڑھ کر آئے تھے۔

ایسے شہر اور ایسے دشمنوں پر غلبہ حاصل ہوتا ہے مگر کوئی قتلِ عام نہیں کیا جاتا، کسی قسم کی لوٹ مار نہیں ہوتی، کسی کی جان و مال اور عزت و آبرو سے کھلواڑ نہیں کیا جاتا، پرانے اور کٹر دشمنوں میں سے کسی پر انتقام کا ہاتھ نہیں اٹھتا، تسخیرِ شہر کی پوری کارروائی میں صرف چوبیس آدمی مارے جاتے ہیں اور وہ بھی اس وقت جب کہ دست درازی میں پیش قدمی خود ان کی طرف سے ہوئی۔

گیارھواں باب

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نظامِ امن نے خواتین کو پُرامن اور باعزت زندگی عطا کی

اسلام سے پہلے پوری روے زمین وحشت وبربریت، ظلم وستم اور فتنہ وفساد کی آماجگاہ بن چکی تھی۔ دنیا بھر میں خصوصاً ملکِ عرب میں امن وچین، اطمینان وسکون اور

راحت وسرور سے لوگ محروم ہو چکے تھے۔ بالخصوص سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی جلوہ گری سے پہلے عورتوں کا بہت بُرا حال تھا، دنیا کی نگاہ میں عورتوں کی کوئی عزت ووقعت نہ تھی، مردوں کی نظر میں اس سے زیادہ عورتوں کی کوئی حیثیت نہ تھی کہ وہ مردوں کی نفسانی خواہشات کو پوری کرنے کا ذریعہ ہیں۔ عورتیں دن رات مردوں کی ہر طرح کی خدمت کرتی تھیں، مگر ظالم مرد پھر بھی ان عورتوں کی کوئی قدر نہیں کرتے تھے، بلکہ جانوروں کی طرح ان کو مارتے پیٹتے تھے۔

پیغمبرِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی جلوہ گری سے پہلے ہر بلا اور مصیبت کو عورتوں پر آزمایا گیا اور ان کا ہر طرح سے استحصال کیا گیا۔ عورت پر سب سے بڑا ظلم تو یہی تھا کہ دنیا میں اس کے آنکھ کھولتے ہی اس کے ماں باپ اس کی پرورش اور اس سے محبت کرنے کے بجائے اس کو زندہ در گور کر دیتے تھے اور جو عورتیں زندہ در گور ہونے سے بچ بھی جاتیں تو پوری زندگی ظلم وستم کا نشانہ بنی رہتیں۔ اس وقت عورتوں کی مجبوری اور لاچاری کا یہ عالم تھا کہ نہ کوئی ان کو دلاسا دے کر خوش کرنے والا تھا اور نہ کوئی ان کے آنسو پونچھنے والا تھا۔ کئی سو سالوں تک ظلم رسیدہ پریشان حال عورتیں آنسو بہاتی رہیں۔

دورِ جاہلیت میں عورتوں کے حالات

دنیا کی تقریباً ساری قومیں عورتوں کو معاشرے میں کوئی مقام نہیں دیتی تھیں، انھیں ذلیل ورسوا سمجھتی تھیں اور ان پر ظلم وبربریت کے پہاڑ توڑتی تھیں۔ اس دور میں جو قومیں مہذب سمجھی جاتی تھیں ان کا بھی یہی حال تھا۔ خصوصیت کے ساتھ عورتوں پر جو مظالم عرب میں ڈھائے جاتے تھے ان کی نوعیت ہی مختلف تھی۔

عورتوں کو میراث میں آپس میں بانٹ لیتے

زمانۂ جاہلیت کا دستور یہ تو تھا ہی کہ عورت کو میراث میں کوئی حصہ نہیں ملتا تھا۔ ظلم بالائے ظلم یہ کہ جس شخص کا انتقال ہو گیا اس کی عورتوں کو بھی وہ لوگ وراثت میں سامان کی طرح بانٹ دیتے تھے۔

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ جب عورت کا شوہر مرجاتا تو شوہر کے ورثا اس عورت کے حقدار ہوتے، اگر وہ چاہتے تو ان میں سے کوئی اس سے شادی کر لیتا تھا یا جس سے چاہتے اُسی سے اس کی شادی کرا دیتے اور چاہتے تو نہ کراتے۔ اس طرح عورت کے سسرال والے اُس کے میکے والوں سے زیادہ اس پر حق رکھتے تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا يَحِلُّ لَـكُمۡ اَنۡ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرۡهًا ‌ؕ وَلَا تَعۡضُلُوۡهُنَّ لِتَذۡهَبُوۡا بِبَعۡضِ مَاۤ اٰتَيۡتُمُوۡهُنَّ اِلَّاۤ اَنۡ يَّاۡتِيۡنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ‌ ۚ وَعَاشِرُوۡهُنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ‌ ۚ فَاِنۡ كَرِهۡتُمُوۡهُنَّ فَعَسٰۤى اَنۡ تَكۡرَهُوۡا شَيۡـئًـا وَّيَجۡعَلَ اللّٰهُ فِيۡهِ خَيۡرًا كَثِيۡرًا ○ (سورۂ نساء، آیت: ۴)

ترجمہ: اے ایمان والو! تمھیں حلال نہیں کہ عورتوں کے وارث بن جاؤ زبردستی اور عورتوں کو روکو نہیں اس نیت سے کہ جو مہر ان کو دیا تھا اس میں سے کچھ لے لو مگر اس صورت میں کہ صریح بے حیائی کا کام کریں اور ان سے اچھا برتاؤ کرو۔ پھر اگر وہ تمھیں پسند نہ آئیں تو قریب ہے کہ کوئی چیز تمھیں ناپسند ہو اور اللہ اس میں بہت بھلائی رکھے۔ (کنزالایمان)

(صحیح البخاری، حصہ ششم، ص: ۴۴)

اس آیت میں ان کے اسی فعل کی ممانعت وارد ہوئی اور انھیں حکم ہوا کہ دورِ جاہلیت میں جو میراث میں عورتوں کو جابرانہ طور پر بانٹ لیا کرتے تھے وہ اب جائز نہیں۔

باندیوں پر قبضہ کر لیتے

یہی معاملہ وہ مرنے والے کی باندیوں کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ بلکہ وارث ہوں یا غیر وارث باندیوں پر قبضہ کرنے میں یکساں تھے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ جب کوئی شخص مرجاتا اور اُس کی باندی ہوتی تو اس کا کوئی دوست اس باندی پر کپڑا ڈال دیتا، اب کوئی دوسرا شخص اس باندی پر دعویٰ نہیں کرسکتا تھا۔ اگر وہ باندی خوبصورت ہوتی تو یہ شخص اس سے شادی کر لیتا اور اگر بد ہیئت ہوتی تو اسے اپنے پاس تاحیات روکے رکھتا۔ (تفسیر طبری، جلد ہشتم، ص: ۱۰۴)

بڑی عجیب بات تھی کہ کسی کے انتقال کے بعد انھیں زیادہ فکر ہوتی تھی کہ کس طرح سے اس کے مال و متاع اور ان کی بیویوں اور باندیوں پر قبضہ جمایا جائے۔ اس کے لیے بھی کوئی اصول اور ضابطہ نہیں تھا بلکہ باندیوں پر جس نے بھی کپڑا ڈال دیا وہ اس کی ہوگئی۔

لڑکیوں کی پیدائش پر ان کے کلیجے پھٹ جاتے

دورِ جاہلیت میں مشرکین عورت کو کسی رتبے اور مقام کا اہل نہ سمجھتے تھے اس لیے وہ لڑکی کے پیدا ہونے پر غصہ ہوتے، حالاں کہ وہ یہ جانتے تھے کہ نظام کائنات کے تحت شادیوں کے لیے لڑکی کی پیدائش ضروری ہے اس کے باوجود اس نظام کے خلاف اس حد تک چلے جاتے کہ اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیا کرتے تھے۔

قرآن کریم میں ان قوموں کے طرز عمل کے خلاف آیت اتری ہے کہ جب ان کے یہاں کسی بچی کی ولادت ہوتی تو وہ غضب ناک ہوتے تھے۔ قرآن کریم نے ان کی اس قبیح عادت کو اس طرح بیان کیا ہے:

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۝

يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ○ (سورۂ نحل، آیت:۵۸)

ترجمہ: اور جب ان میں کسی کو بیٹی ہونے کی خوشخبری دی جاتی ہے تو دن بھر اس کا منہ کالا رہتا ہے اور وہ غصّہ کھاتا ہے۔ لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے اس بشارت کی برائی کے سبب، کیا اسے ذلّت کے ساتھ رکھے گا یا اسے مٹی میں دبادے گا۔ ارے بہت ہی برا حکم لگاتے ہیں۔ (کنزالایمان)

یہ غضبنا کی اس حد تک پہنچ جاتی کہ بہت سے لوگ اپنی بچیوں کو زندہ درگور کر دیا کرتے تھے۔ لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کی رسمِ قبیح کو قرآن حکیم دوسرے مقام پر اس طرح بیان کرتا ہے:

وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ○ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ○ (سورۂ تکویر، آیت:۸،۹)

ترجمہ: اور جب زندہ دبائی ہوئی سے پوچھا جائے کس خطا پر ماری گئی۔

لڑکیوں اور عورتوں کے معاملے میں ان کا یہ حال تھا کہ وہ انھیں کوئی مقام اور حیثیت نہیں دیا کرتے تھے بلکہ ان کی پیدائش کو اپنے لیے باعثِ عار سمجھتے تھے۔

عرب میں نکاح کا دستور

عورتیں ان کے نزدیک کھلونے کی حیثیت رکھتی تھیں اس کا ثبوت ان کے درمیان رائج مختلف قسم کی شادیوں سے بھی ملتا ہے۔ عربوں کے یہاں کئی طریقے کی شادیوں کا رواج تھا۔ ان میں سے چند مشہور شادیوں کا ذکر اس طرح ملتا ہے:

دوستی کی شادی:

مرد کسی بھی عورت کو اپنے گھر میں رکھ لیتا، نہ نکاح کی ضرورت ہوتی اور نہ ہی خطبے

اور مہر کی ضرورت ہوتی۔ جب تک چاہتا اس کے ساتھ ازدواجی تعلق قائم کرتا، اس کے بعد یہ تعلق باہمی رضامندی سے ختم ہو جاتا، کسی طلاق کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس شادی سے اگر اولاد پیدا ہو جاتی تو وہ ماں کی طرف منسوب ہوتی۔ آج بھی یہ طریقہ مغربی معاشرے میں رواج پکڑ چکا ہے۔

بدلے کی شادی:

یہ وہ نکاح تھا کہ ایک شخص اپنی ماتحتی میں رہنے والی لڑکی کا نکاح کسی شخص سے اس شرط پر کر دیتا کہ وہ اپنی کسی بیٹی، بہن وغیرہ کا نکاح اس سے کرائے گا۔ اس میں مہر بھی مقرر کرنا ضروری نہ تھا۔

بیویوں کا تبادلہ:

ایک رواج یہ تھا کہ دو مرد اپنی اپنی بیویوں کا آپس میں تبادلہ کر لیتے تھے اور اس کا نہ عورت کو علم ہوتا اور نہ ہی اس سے رائے لی جاتی، نہ ایجاب وقبول اور مہر کی ضرورت ہوتی اور نہ ہی عورت کی مرضی کا خیال ہوتا۔ بس دوسرے کی بیوی پسند آنے پر ایک مختصر سی مجلس میں یہ سب کچھ طے پا جاتا تھا۔

نکاحِ بُعولت:

یہ نکاح عرب میں بہت عام تھا، اس میں یہ تھا کہ مرد ایک یا کئی عورتوں کا مالک ہوتا۔ بعولت (خاوند ہونا) سے مراد مرد کا عورتیں جمع کرنا ہوتا تھا۔ اس میں عورت کی حیثیت عام مال ومتاع جیسی ہوتی۔

نکاحِ اِستِبْضَاع:

اس کا مطلب ہے فائدہ اٹھانے کے لیے عورت مہیا کرنے کا نکاح۔ یعنی ایک

شخص اپنی بیوی کو کسی دوسرے خوبصورت مرد کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارنے کے لیے بھیج دیتا اور خود اس سے الگ رہتا، تاکہ اس کی نسل خوبصورت پیدا ہو۔ جب اس کو حمل ٹھہر جاتا تو وہ عورت پھر اپنے شوہر کے پاس آجاتی۔

اجتماعی نکاح:

اس کا مطلب یہ ہے کہ تقریباً دس آدمی ایک ہی عورت کے لیے جمع ہوتے اور ہر ایک اس سے مباشرت کرتا۔ جب اس کو بچہ پیدا ہوتا تو وہ ان سب کو بلواتی اور وہ بغیر کسی پس وپیش کے آجاتے، پھر وہ جسے چاہتی (پسند کرتی یا اچھا سمجھتی) اس سے کہتی کہ یہ بچہ تیرا ہے اور اس شخص کو اس سے انکار کرنے کی اجازت نہ ہوتی تھی۔

نکاح کی یہ گھناؤنی صورتیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ وہ عورت کو صرف شہوت پوری کرنے کا ذریعہ سمجھتے تھے اور کسی سامان یا مال سے فائدہ اٹھانے کی جتنی صورتیں ہوسکتی ہیں وہ ساری صورتیں وہ عورتوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے بھی روا رکھتے تھے۔ نکاح کی اکثر صورتیں تو ایسی تھیں کہ ان میں عورتوں کو بطورِ مہر بھی کچھ نہیں دیا جاتا اور ان کے اس طرح سے استحصال میں ان کی مرضی کا بھی خیال نہیں کیا جاتا تھا۔

آقائے نعمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عورتوں کو عزت کا مقام دیا

جب سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی جلوہ گری ہوئی تو دنیا بھر کی ستائی ہوئی عورتوں کی قسمت کا ستارہ چمک اٹھا اور ظلم وستم سے کچلی اور روندی ہوئی عورتوں کا درجہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قائم کردہ نظام میں اس قدر بلند وبالا ہوگیا کہ صرف عبادات ومعاملات ہی نہیں بلکہ زندگی اور موت کے ہر مرحلے اور ہر موڑ پر عورتیں مردوں کے دوش بدوش کھڑی ہوگئیں۔ پیغمبرِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے عورتوں کو عزت ووقار،

مرتبہ، ملکیت اور ان کے وہ سارے حقوق عطا کیے جن سے وہ پہلے محروم تھیں۔

ماں کی حیثیت سے عورت کا حق:

نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہل ایمان کی جنت ماں کے قدموں تلے قرار دے کر ماں کو معاشرے کا سب سے زیادہ مکرم ومحترم مقام عطا کیا۔ آپ نے فرمایا کہ سب سے زیادہ حسن سلوک کی مستحق ماں ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہو کر عرض گزار ہوا: یا رسول اللہ! میرے حسنِ سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ فرمایا کہ تمھاری والدہ، عرض کی: پھر کون؟ فرمایا: تمھاری والدہ، عرض کی: پھر کون ہے؟ فرمایا: تمھاری والدہ، عرض کی: پھر کون ہے؟ فرمایا: تمھارے والد۔

(صحیح البخاری، حصہ ہشتم، ص:۲)

بیٹی کی حیثیت سے عورت کا حق:

جس معاشرے میں بیٹی کی پیدائش کو ذلت ورسوائی کا سبب قرار دیا جاتا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی معاشرے میں بیٹی کو احترام وعزت کا مقام عطا کیا۔ بیٹیوں کی پرورش اور ان کے حقوق کا لحاظ رکھنے کو عبادت کا مقام دیا اور بیٹیوں کو باعثِ برکت کہا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ایک عورت اپنی دو بیٹیوں کے ساتھ میرے پاس آئی، میرے پاس اس وقت صرف ایک کھجور تھی، میں نے وہ اسے دے دی، اس نے وہ کھجور دو ٹکڑے کر کے اپنی بیٹیوں کو دے دی اور اس نے خود نہیں کھائی، پھر وہ تینوں وہاں سے چلی گئیں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تشریف لائے تو میں نے آپ کو بتایا۔ آپ نے فرمایا: جو کوئی ان لڑکیوں کی وجہ سے آزمائش میں ڈالا

جائے تو یہ لڑکیاں اس کے لیے آگ سے آڑ بنیں گی۔ (صحیح البخاری، حصہ دوم، ص: ۱۱۰)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کے پاس لڑکی ہو پھر اس کو زندہ نہ دفنائے اس کو ذلیل وخوار نہ سمجھے، نہ لڑکے کو اس پر فوقیت دے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو جنت میں داخل فرما دے گا۔

(سنن ابی داؤد، حصہ چہارم، ص: ۳۳۸)

جن بچیوں کو اہلِ عرب اپنے لیے مصیبت اور مشقت کا باعث سمجھتے تھے آقائے رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انھی بچیوں کو آخرت میں مصیبت اور مشقت دور کرنے کا ذریعہ قرار دیا۔

بھن کی حیثیت سے عورت کا حق:

بیٹیوں کی پرورش اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک پر جنت کا وعدہ فرمایا گیا ہے۔ اسی طرح بہنوں کی پرورش اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک بھی جنت میں لے جانے والا عمل ہے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لَا یَکُوْنُ لِاَحَدٍ ثَلَاثُ بَنَاتٍ، اَوْ ثَلَاثُ اَخَوَاتٍ، اَوْ ابْنَتَانِ، اَوْ اُخْتَانِ، فَیَتَّقِی اللّٰہَ فِیْہِنَّ وَیُحْسِنُ اِلَیْہِنَّ اِلَّا دَخَلَ الْجَنَّۃَ۔

(مسند احمد، حصہ: ۱۷، ص: ۴۷۶)

ترجمہ: جس کی تین بیٹیاں یا تین بہنیں ہوں یا دو بیٹیاں یا دو بہنیں ہوں، وہ ان کے معاملے میں اللہ سے ڈرے اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرے تو جنت میں داخل ہوگا۔

کبھی بعض بہنوں کی دیکھ بھال کی ذمے داری والدین کے انتقال یا شوہروں کے طلاق کے بعد بھائیوں پر آجاتی ہے تو وہ سخت بوجھ محسوس کرتے ہیں اور ذمے داری قبول

کرنے سے کتراتے ہیں، انھیں پیغمبرِ امن صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کو پیشِ نظر رکھ کر اپنی کی اصلاح کی ضرورت ہے۔

بیوی کی حیثیت سے عوت کے حقوق:

پیغمبرِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی جلوہ گری سے پہلے تو عورتوں کو بیوی کی حیثیت سے کوئی حق اور مقام حاصل نہیں تھا۔ آقاے کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نظام میں اس معاملے میں خاص طور پر بہت بڑی تبدیلی آئی۔ عورتوں کو بحیثیت بیوی ان کے حقوق بھی دیے گئے اور انھیں عزت کا مقام بھی عطا کیا گیا۔

بیوی کے نان و نفقے کا خرچ شوہر کے ذمے کیا گیا:

عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ۔ (سورۂ بقرہ، آیت:۲۳۶)

ترجمہ: مقدور والے پر اس کے لائق اور تنگدست پر اس کے لائق۔ (کنز الایمان)

بیویوں کا حق مہر ادا کرنا شوہر پر واجب قرار دیا گیا:

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ۗ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا ○ (سورۂ نساء، آیت:۴)

ترجمہ: اور عورتوں کو ان کے مہر خوشی سے دو، پھر اگر وہ اپنے دل کی خوشی سے مہر میں سے تمھیں کچھ دے دیں تو اسے کھاؤ رچتا پچتا۔ (کنز الایمان)

عورت کے ساتھ حسنِ معاشرت کا حکم ہوا:

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ○ (سورۂ نساء، آیت:۱۹)

ترجمہ: اور ان سے اچھا برتاؤ کرو، پھر اگر وہ تمھیں پسند نہ آئیں تو قریب ہے کہ کوئی

چیز تمھیں ناپسند ہو اور اللہ اس میں بہت بھلائی رکھے۔ (کنز الایمان)

بنیادی ضرورتیں فراہم کرنا بیوی کا حق قرار دیا گیا:

ایک شخص نے نبیِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سوال کیا: بیوی کا شوہر پر کیا حق ہے؟ آپ نے فرمایا:

اَنْ يُّطْعِمَهَا اِذَا طَعِمَ، وَاَنْ يَّكْسُوَهَا اِذَا اكْتَسٰى، وَلَا يَضْرِبِ الْوَجْهَ، وَلَا يُقَبِّحْ، وَلَا يَهْجُرْ اِلَّا فِي الْبَيْتِ۔ (سنن ابن ماجہ، حصہ اول، ص: ۵۹۳)

ترجمہ: اسے اپنے ساتھ کھانا کھلائے، اسے کپڑے پہنائے، اس کے چہرے پر نہ مارے، اس کی صورت نہ بگاڑے اور اسے نہ چھوڑے مگر گھر کے اندر۔

سب سے بہتر انسان اسے قرار دیا گیا جو بیوی کے ساتھ بہتر ہو:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اَكْمَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ اِيْمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا، وَخَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِنِسَائِهِمْ۔ (سنن الترمذی، حصہ سوم، ص: ۴۵۸)

ترجمہ: سب سے کامل ایمان والا مومن وہ ہے جو سب سے اچھے اخلاق والا ہے اور تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنی عورتوں کے لیے سب سے بہتر ہو۔

عورتوں کو مارنے سے منع فرمایا گیا:

ایک بار ولید بن عقبہ کی بیوی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے شکایت کرنے آئیں کہ ولید مجھ کو بہت مارتے ہیں۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ولید سے جا کر بتا دینا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مجھ کو اپنی پناہ میں لے لیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر آئیں اور کہنے لگیں کہ ولید نے اب تو مجھے اور مارا ہے۔

یہ سن کر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کپڑے کا ایک ٹکڑا کاٹ کر بطورِ نشانی عطا فرمایا۔ اس خاتون نے جا کر دکھایا تو اس نے اس کو اور بھی مارا پھر وہ شکایت لے کر حاضر ہوئیں اور عرض کی کہ ولید نے اب مجھے پہلے سے بھی زیادہ مارا۔ یہ سن کر نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ولید کے لیے دعاے ہلاکت فرمائی۔ (کنزالعمال، حصہ: ۱۳، ص: ۶۰۳)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ ابدقرار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اِنَّ الْمَرْاَۃَ کَالضِّلَعِ اِنْ ذَھَبْتَ تُقِیْمُھَا کَسَرْتَھَا وَاِنْ تَرَکْتَھَا اسْتَمْتَعْتَ بِھَا عَلٰی عِوَجٍ۔ (سنن الترمذی، حصہ سوم، ص: ۴۸۵)

ترجمہ: عورت پسلی کی طرح ہے کہ اگر تم اسے بالکل سیدھی کرنا چاہو تو ٹوٹ جائے گی اور اگر چھوڑ دو تو اس کی کجی کے ساتھ اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہو۔

وہ دور جس میں عورت کا معنیٰ صفر تھا، اس دور میں سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے عورتوں کو اس قدر حقوق عطا فرمائے کہ انھیں ہر اعتبار سے عزت، وقار اور مقام عطا فرمایا۔ یہ یقیناً عورتوں پر سرکارِ ابدقرار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا عظیم احسان ہے۔

تعددِ ازدواج رحمت یا زحمت؟

آج اگر ہم دنیا کے حالات کا جائزہ لیں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ دنیا میں تو متضاد رجحانات عام ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک طرف تو فحاشی رواج پکڑ رہی ہے کہ اخبارات، اشتہارات، ٹیلی ویژن، انٹرنیٹ وغیرہ پر فحش مواد کے نشر کرنے میں کوئی خرابی یا برائی نہیں سمجھی جا رہی ہے۔ نیوز پیپر والا اپنے نیوز پیپر کی طرف لوگوں کا رجحان بڑھانے کے لیے عریاں تصاویر کو اپنے نیوز پیپر کی زینت بنانے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ کمپنیاں اشتہارات

میں یہ تصور پیش کر رہی ہیں کہ ان کے پروڈکٹ کے استعمال سے نوجوانوں کے لیے دوشیزاؤں کو متأثر کرنا آسان ہوگا اور اس تصور کو پیش کرنے کے لیے وہ اپنے اشتہارات کو ایسے ہی مضامین کے مواد پر مشتمل کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

فلم انڈسٹری کا حال تو ناگفتہ بہ ہے کہ اس انڈسٹری نے شہرت اور دولت کمانے کا ذریعہ ننگے پن کو بنالیا ہے اور ان کا یہ تصور ہے کہ جو کوئی چادرِ عصمت کو جس قدر چاق کرے وہ اسی قدر مشہور و معروف شخصیت کے نام سے جانا جائے گا۔ انٹرنیٹ کا حال تو مت پوچھیے کہ یہاں وہ سب کچھ دستیاب ہے جو ایک زمانے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

ایسے حالات میں ذہنوں کا آوارہ ہونا اور نفس میں شہوانی خیالات کا موجزن ہونا لازمی بات ہے۔ جس کے ذہن اور نفس میں ایسی کیفیت پیدا ہو جائے اسے دور کرنے کا ایک ہی ذریعہ ہے کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ چند پُرسکون لمحات گزارے اور اپنے آپ کو شہوت و ہیجان سے پاک کر لے۔

حدیثِ پاک میں اسی لیے فرمایا گیا:

يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ، مَنِ اسْتَطَاعَ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ، فَإِنَّهُ أَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَأَحْصَنُ لِلْفَرْجِ، وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ فَإِنَّهُ لَهُ وِجَاءٌ۔

(صحیح البخاری، حصہ ہفتم، ص:۳)

ترجمہ: اے نوجوانوں کی جماعت! تم میں سے جو کوئی عورت رکھنے کی طاقت رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ نکاح کر لے اس لیے کہ وہ نگاہوں کو جھکانے اور شرمگاہ کی حفاظت کرنے والا ہے اور جس کے اندر عورت رکھنے کی طاقت نہ ہو اسے چاہیے کہ روزہ رکھے اس لیے کہ روزہ شہوت کو توڑنے والا ہے۔

ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک انسان ایک شادی کر لے لیکن اس کی شہوت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے وہ ایک شادی کافی نہ ہو۔ پھر عورتوں کے عوارض بھی بار ہا مردوں کے لیے مشکلات کا باعث بنتے ہیں کہ ہر ماہ عموماً ۵ - ۷ دن حیض کے ہوتے ہیں کہ ان دنوں میں ان سے جماع حرام ہے۔ عورت حاملہ ہے تو مرد کو اس سے مباشرت کا پورا لطف نہیں ملتا۔ وضعِ حمل کے بعد عموماً ۳۵ سے ۴۰ دن نفاس کے ہوتے ہیں کہ اس حالت میں بھی عورت سے اجتناب ضروری ہے۔ سال میں دو، چار بلکہ بارہا کئی کئی مرتبہ عورتیں اپنے والدین کے یہاں چلی جاتی ہیں۔ کبھی عورت کی طبیعت خراب ہو گئی۔ یہ سارے حالات ایسے ہیں کہ ان میں عورت کے ہوتے ہوئے بھی اس سے فائدہ یا پھر مکمل فائدہ نہیں مل پاتا۔ تو لازمی بات ہے کہ ذہن میں اٹھا ہوا ہیجانی طوفان تھمے گا نہیں اور پھر معاشرے میں دیگر خرافات اور برائیاں جنم لیں گی۔ ایسے حالات سے نمٹنے کے لیے دینِ رحمت کا دیا ہوا نظام یہ ہے:

فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۔ (سورۂ نساء، آیت: ۳)

ترجمہ: تو نکاح میں لاؤ جو عورتیں تمھیں خوش آئیں، دو دو اور تین تین اور چار چار، پھر اگر ڈرو کہ دو بیبیوں کو برابر نہ رکھ سکو گے تو ایک ہی کرو۔ (کنز الایمان)

اس تعلق سے دیگر اقوام و مذاہب کا نظریہ مختلف ہے کہ انھوں نے تعددِ ازدواج کو غلط خیال کیا ہے اور اسلام کے اس حکم پر طرح طرح کے اعتراضات کیے ہیں۔ جب کہ تعددِ ازدواج کی حقیقت و حکمت سے آشنا انسان اچھی طرح جانتا ہے کہ تعددِ ازدواج کی اجازت انسانی معاشرے کے افراد اور خود انسانی معاشرے کے لیے بھی رحمت ہی رحمت ہے۔

یہ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نظام کی خاصیت ہے کہ اس نے انسانوں کو

ذہنی آوارگی میں مبتلا ہونے سے روکا ہے، اسی لیے بدنظری، فحاشی، عریانیت وغیرہ کے خاتمے کے لیے اسلام میں سخت اصول وضوابط ہیں۔ اس کے باوجود اپنے ماننے والوں کی ضرورت کا خیال کرتے ہوئے انھیں ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت دی ہے۔ اس کے بالمقابل دیگر اقوام نے عریانیت اور فحاشی کو عام کیا ہے اور نکاح کو ایک میں محدود کر دیا ہے۔ اس کی وجہ سے معاشرے میں جو سنگین برائیاں اور جرائم پروان چڑھ رہے ہیں ان سے ہر کس وناکس واقف ہے۔

دینِ رحمت میں متعدد شادیوں کی جو اجازت دی گئی ہے اس کے فوائد اور حکمتیں بیان کی جا رہی ہیں جن کے مطالعے سے جہاں یہ اندازہ ہوگا کہ تعدد ازدواج انسانیت پر رحمت ہے وہیں یہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نظام میں انسانوں کی ضرورتوں اور تقاضوں کا بھرپور خیال رکھا گیا ہے۔

تعدد ازدواج کا رواج ابتداے دنیا سے تھا

تاریخ کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ تعدد ازدواج انسانی فطرت کا تقاضا ہے اسی لیے اس کا رواج ابتداے روزگار سے تھا۔ خود سابقہ انبیاے کرام علیہم السلام نے بھی ایک سے زیادہ نکاح فرمائے ہیں۔ جو لوگ اسلام کے اس نظام پر اعتراض کرتے ہیں ان کے پیشواؤں کے یہاں خود تعدد ازدواج کے طریقے رائج تھے بلکہ ان میں سے بعض کی تاریخ میں تو اس کی گھناؤنی صورتوں کا بھی ذکر ملتا ہے جو فطرتِ انسانی کے خلاف ہے۔ تعددِ ازدواج کا تاریخی پسِ منظر مختصر طور پر پیش کیا جاتا ہے:

حضرت ابراھیم علیہ السلام کی ازواج:

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام جو کہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے جدِ

امجد ہیں اور یہود ونصاری دونوں کو دعویٰ ہے کہ ہم آلِ ابراہیم ہیں، بلکہ اپنے تئیں دونوں اُنھیں اپنا ہم مذہب قرار دیتے ہیں۔ تاریخ میں ملتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چار نکاح فرمائے تھے۔

البدایۃ والنہایۃ میں ہے:

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی دوسری بیوی حضرت ہاجرہ قبطیہ مصریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بطن سے ان کی اولاد میں سب سے پہلے حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے، پھر ان کی پہلی بیوی حضرت سارہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بطن سے حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے۔ پھر آپ نے قنطورا بنت یقطن کنعانیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نکاح فرمایا تو ان کے بطن سے چھ بچے پیدا ہوئے۔ پھر آپ نے حجون بنت امین رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نکاح فرمایا تو ان کے بطن سے آپ کے پانچ بچے ہوئے۔ (حصہ اول، ص:۲۰۲)

اس سے واضح ہوا کہ حضرت ہاجرہ اور حضرت سارہ رضی اللہ عنہما ایک ہی وقت میں آپ کے نکاح میں تھیں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام آپ کی دوسری بیوی کے بطن سے پہلے پیدا ہوئے جب حضرت اسحاق علیہ السلام پہلی بیوی کے بطن سے بعد میں پیدا ہوئے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کی ازواج:

تعدد ازدواج پر اعتراض کرنے والوں میں یہود بھی ہیں جو کہ اپنے آپ کو بنی اسرائیل یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد کہتے ہیں۔ انھیں یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے بھی ایک سے زیادہ نکاح فرمایا تھا۔ بلکہ ان کی شریعت میں تو دو بہنوں کو ایک وقت میں اپنے نکاح میں رکھنا بھی جائز تھا۔

کتاب ''الانس الجلیل'' میں مذکور ہے:

وَرُزِقَ يَعْقُوبُ مِنْ زَوْجَتِهٖ لَيَّا رُوْبِيْلَ وَهُوَ اَكْبَرُ اَوْلَادِهٖ ثُمَّ شَمْعُوْنَ وَلَاوٰى وَيَهُوْذَا ثُمَّ تَزَوَّجَ اُخْتَهَا رَاحِيْلَ فَرُزِقَ مِنْهَا يُوسُفَ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَبِنْيَامِيْنَ۔ (حصہ اول،ص:۶۵)

ترجمہ: حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں ان کی اہلیہ لیا سے روبیل پیدا ہوئے جو کہ ان کے سب سے بڑے بیٹے ہیں، پھر شمعون، لاویٰ اور یہوذا پیدا ہوئے۔ پھر آپ نے اپنی اہلیہ کی بہن راحیل سے نکاح فرمایا تو ان کے بطن سے حضرت یوسف علیہ السلام اور بنیامین پیدا ہوئے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کی ازواج:

بنی اسرائیل کے ایک جلیل القدر پیغمبر حضرت داؤد علیہ السلام ہیں۔ ان کے تعلق سے روایت ملتی ہے کہ ان کی ننانوے بیویاں تھیں۔ ابوبکر عبدالقاہر جرجانی دار رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

كَانَ قَدْ اُبِيْحَ لِدَاوٗدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ امْرَأَةً مَّهْرِيَّةً۔

(درج الدرر فی تفسیر الآی والسور، حصہ دوم، ص:۶۰۲)

ترجمہ: حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے ۹۹ عورتوں سے نکاح مباح تھا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی ازواج:

بنی اسرائیل کے ایک جلیل القدر پیغمبر حضرت سلیمان علیہ السلام ہیں۔ ان کے تعلق سے روایت ملتی ہے کہ ان کی تین سو بیویاں تھیں۔ حضرت جرجانی فرماتے ہیں:

كَانَ قَدْ اُبِيْحَ لِسُلَيْمَانَ عَلَيْهِ السَّلَامُ ثَلَاثُ مِائَةِ حُرَّةٍ۔ (ایضًا)

ترجمہ: حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے تین سو آزاد عورتوں سے نکاح کی

اجازت تھی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

قَالَ سُلَيْمَانُ لَاَطُوْفَنَّ اللَّيْلَةَ عَلٰى تِسْعِيْنَ امْرَأَةً كُلُّهُنَّ تَأْتِيْ بِفَارِسٍ يُجَاهِدُ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ۔ (صحیح البخاری، حصہ ہشتم، ص: ۱۳۰)

ترجمہ: حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: آج رات میں نوے عورتوں کو صحبت سے سرفراز کروں گا اور ان میں سے ہر ایک کو ایسا بچہ ہوگا جو اللہ کی راہ میں جہاد کرے گا۔

اس سے پتہ چلا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی ایک وقت میں کم از کم نوے بیویاں تھیں جنھیں ایک رات میں صحبت سے سرفراز فرمانے کے تعلق سے آپ نے فرمایا تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ازواج:

خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بھی چار ازواج تھیں۔ ملک غلام مرتضیٰ نے مدینۂ منورہ سے شائع ہونے والے جریدے کے شمارہ نمبر: ۵۹ میں ''تعدد زوجات النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' کے نام سے ایک مقالہ لکھا تھا، اس میں انھوں نے بائبل کے حوالے سے لکھا ہے:

تَزَوَّجَ سَيِّدُنَا مُوْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ بِأَرْبَعِ نِسَاءٍ وَاَسْمَاؤُهُنَّ كَمَا يَلِيْ: سَفُوْرَةُ وَهِيَ اُمُّ جَيْسُوْنَ وَالْعَيْزَرِ وَجَبْشِيَّةُ وَبِنْتُ قِيْنِيٍّ وَبِنْتُ حُبَابٍ۔ (ص:۱۵۲)

ترجمہ: حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے چار عورتوں سے نکاح فرمایا۔ ان کے اسما یہ ہیں۔ (۱) سفورہ جو کہ جیسون اور عیزَر کی والدہ ہیں۔ (۲) جبشیہ۔ (۳) بنتِ قِینی۔ (۴) بنتِ حُباب۔

ہندو مذہب میں تعدد ازدواج کا تصور:

موجودہ زمانے میں ہندو مذہب میں تعدد ازدواج کا کوئی تصور نہیں ہے بلکہ وہ لوگ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے تعدد ازدواج پر اعتراض کرتے ہیں جب کہ خود ان کے مذہبی پیشواؤں کے یہاں تعدد ازدواج کا تصور بھی تھا اور انھوں نے کئی کئی شادیاں بھی کی ہیں۔ ان کے دھرم کی اہم شخصیات میں شری رام چندر کا شمار ہوتا ہے کہ وہ لوگ ان کو معبود کا مقام دیتے ہیں۔ ہندو دھرم کے ماننے والے ہر انسان کو یہ بات معلوم ہے کہ شری رام چندر کے باپ راجہ دسرتھ، جو کہ ہندوستان کے ایک راجا تھے، ان کی تین بیویاں تھیں۔

(۱) رانی کوشلیا جو کہ شری رام چندر کی ماں ہے۔

(۲) رانی سُمیترا جو کہ لکشمن کی ماں ہے۔

(۳) رانی کیکئی جو کہ بھرت جی کی ماں ہے۔

ہندو مذہب کے بانی شری رام چندر کی خود اٹھارہ بیویاں تھیں، جیسا کہ ان کے بڑے پنڈت لالہ لاجپت راؤ نے کرشن جینتی میں لکھا ہے۔ (ایضاً، ص: ۱۵۳، ۱۵۴)

ان حوالہ جات سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے عالی مرتبت انبیا، بانیانِ مذاہب اور بڑے لوگ تعددِ ازدواج پر کار بند رہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایک سے زیادہ شادیاں کرنا نہ تو فطرتِ انسانی کے خلاف ہے اور نہ ایسا عمل ہے جس کی نظیر گزشتہ اقوام میں نہ ملتی ہو۔ بلکہ مختلف مذاہب کو ماننے والی اقوام ایک سے زیادہ شادیاں کرتی رہی ہیں۔

سابقہ اقوام میں تعددِ ازدواج میں افراط وتفریط

سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی جلوہ گری سے پہلے جن اقوام کی سچی یا من گڑھت کہانیاں تاریخ کے صفحات پر ملتی ہیں ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ تعددِ

از دواج ان کے درمیان رائج تو تھا لیکن جن اقوام میں جہالت تھی وہ عموماً تعدِ از دواج کے تعلق سے افراط وتفریط کے شکار ہو گئے تھے۔

خصوصیت کے ساتھ اہلِ عرب دورِ جاہلیت میں اس فطری قانون میں دو طرح کی تبدیلیاں کر چکے تھے:

(۱) انھوں نے بیویوں کی کثرت کی کوئی حد مقرر نہ کی تھی۔

(۲) ایک شوہر جس طرح کثرت سے بیویاں رکھتا تھا، اسی طرح بعض اوقات ایک بے حیا عورت اپنے کئی بعول رکھتی تھی۔ ان کے یہاں کثرتِ بعول اور کثرتِ ازواج کی بلا تعین اجازت تھی یعنی مرد جس قدر چاہتے عورتیں نکاح میں رکھتے اور اسی طرح عورتیں جس قدر چاہتیں، خاوند بنا لیتیں۔

نظامِ مصطفی نے تعدد ازدواج کو اعتدال کی راہ دی

تعدِ از دواج انسانی فطری ضرورت ہے اس لیے اس پر پابندی لگانا انسانوں کی فطری ضرورت پر پابندی لگانا ہے۔ اسلام دینِ فطرت ہے اور اس کے سارے نظام انسانوں کی فطرت کے عین مطابق ہیں۔ اس لیے نظامِ سرورِ کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں تعدِ از دواج کو بھی قانون کا پابند کر دیا گیا اور اس تعلق سے دورِ جاہلیت میں جو برائیاں تھیں ان کا خاتمہ کر دیا گیا۔ پہلے تعدِ از دواج سے متعلق فوائد اور اس کے جواز کی حکمتیں ذکر کی جاتی ہیں، پھر اس تعلق سے چند غلط فہمیوں کے ازالے کی کوشش کی جائے گی۔

ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت کے فوائد اور حکمتیں

تعدِ از دواج یعنی ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت دینے میں مختلف فوائد ہیں جب کہ ایک سے زیادہ نکاح کرنے سے منع کرنے میں متعدد خرابیاں اور نقصانات ہیں اس

لیے سرورِ کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تعددِ ازدواج کو جائز رکھا بلکہ خود بھی آپ نے ایک وقت میں کئی خواتین کو شرفِ زوجیت سے نوازا۔ چند فوائد اور حکمتیں حسبِ ذیل ہیں:

عفت اور پاکدامنی:

جس طرح کھانا پینا انسان کی فطری ضرورت ہے، اسی طرح نکاح اور مجامعت بھی انسان کی فطری ضرورت ہے۔ ہر انسان کا مزاج جس طرح کھانے پینے کے معاملے میں مختلف ہوتا ہے اسی طرح مجامعت کے تعلق سے بھی ہر انسان کا مزاج مختلف ہوتا ہے۔ کسی کو اس کی کم ضرورت محسوس ہوتی ہے اور کسی کو اس کی زیادہ ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

نکاح کا مقصد عفت و پاکدامنی کی حفاظت ہے جیسا کہ پیچھے گزرا ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نکاح نگاہوں کو جھکانے والا اور شرمگاہ کی حفاظت کرنے والا ہے۔

عورتوں کے عوارض کی وجہ سے اگر کوئی شخص ایک عورت سے مکمل اطمینان نہیں پا رہا ہے تو لامحالہ اس کی بھی نگاہیں بہکیں گی اور اس کے بھی فطری رجحانات آوارگی کا شکار ہوں گے۔ ایسے میں نظامِ مصطفیٰ میں ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت بایں معنیٰ رحمت ہے کہ جائز طور پر ایک عورت کے ساتھ رشتہ رکھنا ناجائز طور پر کئی عورتوں کے ساتھ رشتہ رکھنے سے بہتر ہے۔ ناجائز تعلقات انفرادی اور اجتماعی نقصانات کو دعوت دیتے ہیں اور جائز رشتے تقدس اور پاکی کا سبب بنتے ہیں۔

فطری ضرورت کی تکمیل:

عورت ہر وقت اس قابل نہیں رہتی کہ خاوند سے ہم بستر ہو سکے کیوں کہ اول تو لازمی طور پر ہر مہینے میں عورتوں کے پانچ چھ دن عموماً حیض کے ایام ہوتے ہیں جن میں

مردوں کو ان سے دور رہنے کا حکم ہے۔ اسی طرح ایامِ حمل میں عورت کو مرد کی صحبت سے اس لیے پرہیز ضروری ہوتا ہے کہ جنین کی صحت پر کوئی برا اثر نہ پڑے۔ اسی طرح بسا اوقات ایک عورت بیماری کی وجہ سے یا حمل کی تکلیف میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اس قابل نہیں رہتی کہ مرد اس سے فائدہ اٹھا سکے۔

ایسی صورتوں میں مرد کے زنا سے محفوظ رہنے کی عقلاً اس سے بہتر کوئی صورت نہیں کہ اس کو دوسرے نکاح کی اجازت دی جائے، ورنہ مرد اپنی خواہش کے پورا کرنے کے لیے ناجائز ذرائع استعمال کریں گے۔

توالد و تناسل کا سلسلہ آگے بڑھانا:

بسا اوقات عورت امراض کی وجہ سے یا بانجھ ہونے کی وجہ سے توالد و تناسل کے قابل نہیں رہتی اور مرد کو بقائے نسل کی طرف فطری رغبت ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں عورت کو بے وجہ طلاق دے کر علاحدہ کر دینا یا اس پر کوئی الزام لگا کر اس کو طلاق دے دینا (جیسا کہ آئے دن یورپ وغیرہ میں ہوتا رہتا ہے) بہتر ہے یا یہ صورت بہتر ہے کہ اس کی زوجیت اور حقوقِ زوجیت کو باقی اور محفوظ رکھ کر شوہر کو دوسرے نکاح کی اجازت دے دی جائے۔

تمدنی ضرورت:

تعددِ ازدواج کی ضرورت تمدنی اعتبار سے بھی ہے۔ مثلاً جنگوں میں مردوں کی شرکت ہوتی ہے، سیکڑوں شہید ہوتے ہیں اور ان کی عورتیں بیوہ ہوتی ہیں۔ ایسے میں مردوں کے مقابل عورتوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ اگر تعددِ ازدواج پر پابندی ہو تو ان بیواؤں کی کفالت کا مسئلہ بھی درپیش ہوگا اور اگر ایک شخص کے لیے کئی عورتوں سے شادی کرنا جائز قرار دیا جائے گا تو ان بیواؤں کے لیے بھی نکاح کا امکان ہوگا اور ان کی کفالت کرنے والا بھی

کوئی نہ کوئی میسر آ جائے گا۔

اس طرح کی اور بھی بہت سی حکمتیں اور فوائد ہیں جن کے پیشِ نظر اسلام میں تعددِ ازدواج کو روا رکھا گیا ہے اور ایک مرد کو دو یا اس سے زیادہ چار تک شادیاں کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔

تعدد ازدواج کی اجازت کے لیے بھی شرط ہے

مگر یہ اجازت بھی عام نہیں ہے بلکہ اسے شرائط کے ساتھ مشروط رکھا گیا ہے۔ جس طرح ایک عورت سے نکاح کرنے کے لیے شرط ہے کہ اس کے مہر اور نان و نفقے کی ادائیگی پر اسے قدرت ہو اسی طرح ایک سے زیادہ نکاح کرنے کے لیے بھی یہ شرائط ہیں۔ ان کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ عورتوں کے درمیان عدل پر بھی اسے قدرت ہو۔

فرمانِ قرآن ہے: فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تَعۡدِلُوۡا فَوَاحِدَةً۔ (سورۂ نساء، آیت: ۳)

ترجمہ: پھر اگر ڈرو کہ دو بیبیوں کو برابر نہ رکھ سکو گے تو ایک ہی کرو۔ (کنز الایمان)

یہ ایک بھی اس وقت جائز ہے جب کہ اس ایک بیوی کے حقوق ادا کرنے پر قدرت ہو ورنہ ایک بیوی رکھنا بھی جائز نہیں ہے بلکہ اس کے لیے حکم ہے کہ روزہ رکھے۔

صرف چار ہی کیوں؟

پیغمبرِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے پہلے لوگ جتنی چاہتے بیویاں رکھتے تھے۔ یہ حالت نہ صرف عرب کے جاہلوں کی تھی بلکہ دیگر اَدیان کے مذہبی رہنماؤں سے متعلق بھی آپ جان چکے ہیں کہ وہ بھی کثرتِ ازدواج پر کاربند تھے۔ مگر بالعموم لوگوں سے بیویوں کے درمیان انصاف نہیں ہو پاتا۔ شریعتِ محمدیہ میں اس عمومی اجازت کو چار تک محدود کر دیا گیا تاکہ مرد اپنی بیویوں کے درمیان انصاف کر سکے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

تین سے آگے کثرت کی حد شروع ہوجاتی ہے۔ تین راتوں سے زیادہ عورت خاوند سے دور رہے تو کثرتِ دوری کہلائے گی۔ اس لیے شریعت نے چار بیویوں تک کی اجازت دی کہ زیادہ سے زیادہ تین راتوں کی تنہائی کے بعد عورت کی اپنے خاوند سے شب بسری ممکن ہو۔

(حجۃ اللہ البالغۃ، جلد دوم، ص: ۱۳۳)

عورتوں کے لیے صرف ایک کی اجازت کیوں؟

عورتیں صرف ایک مرد سے نکاح کرسکتی ہیں اس پر ہر مہذب انسان اور ہر صحیح مذہب کا ماننے والا متفق ہے۔ شادی کی حکمت صرف شہوت رانی نہیں ہے بلکہ شادی سے تمدنی اور معاشرتی کئی معاملات جڑے ہوتے ہیں۔ اگر کوئی عورت ایک سے زیادہ شادی کرے تو کئی خرابیاں جنم لیں گی جن کے ازالے کی کوئی صورت نہیں ہے اس لیے عورت کے لیے صرف ایک نکاح کی اجازت دی گئی ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ یہ نظام ہمیشہ رحمت ہی ثابت ہوا ہے۔ اس کے چند اسباب ذکر کیے جاتے ہیں:

صنفی کمزوریاں:

مرد کو اللہ نے عورت کے مقابلے میں زیادہ قوی بنایا ہے۔ جب کہ عورت کو فطری طور پر چند تعذرات درپیش ہیں اور وہ ہر ماہ چند ایام ایسی مخصوص حالت میں گزارتی ہے کہ مجامعت کے قابل نہیں ہوتی۔ اسی طرح عورت خواہ کیسی ہی زور آور ہو جب وہ حاملہ ہوجاتی ہے تو اس کی توجہ مردانہ کشش کے بجائے جنین کے تحفظ کی طرف منتقل ہوجاتی ہے۔ ایک عورت ایک مرد کے لیے کافی نہیں ہوتی تو کئی مردوں کی ضرورت کیسے پوری کرسکتی ہے؟

اشتباہِ نسل:

سلسلۂ نسل مرد سے چلتا ہے اور اسے آگے بڑھانے کا ذریعہ نطفہ ہوتا ہے۔ ایک مرد کا نطفہ کئی عورتوں کے رحم میں منتقل ہو تو نسلِ انسانی کے سلسلے پر کوئی فرق نہیں پڑے گا اور اگر کئی مردوں کے نطفے ایک عورت کے رحم میں منتقل ہوں تو یہ امتیاز کرنا ناممکن ہو جائے گا کہ پیدا ہونے والا بچہ کس کے نطفے سے ہے۔ اس تعلق سے ایک واقعہ ذکر کیا جاتا ہے، اسے پڑھیں تو اس بات کا بخوبی اندازہ ہوگا:

حضرت شیخ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

یہی مذکورہ سوال ایک دفعہ ابوحنیفہ نعمان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کیا گیا، سوال کرنے والی عورتیں تھیں، آپ سوال سن کر اُلجھن میں پڑ گئے اور کہا کہ اس کا جواب کسی اور وقت دوں گا۔ اس اُلجھن میں گھر کے اندر تشریف لے گئے۔ آپ کی صاحبزادی حنیفہ نے اُلجھن کی وجہ دریافت کی تو آپ نے عورتوں کا سوال پیش کر دیا۔ یہ سن کر صاحبزادی نے عرض کیا کہ میں عورتوں کو اس کا جواب دے سکتی ہوں۔ عورتوں کو میرے پاس بھجوا دیجیے۔

جب عورتیں آ گئیں تو صاحبزادی نے ایک ایک پیالی ہر عورت کے ہاتھ میں دے کر کہا کہ اپنی اپنی پیالی میں تم سب تھوڑا تھوڑا اپنا دودھ ڈال دو۔ جب انھوں نے ایسا کیا تو ایک بڑا پیالہ ان کو دے کر کہا کہ اب سب پیالیوں کا دودھ اس میں ڈال دو۔ جب عورتوں نے یہ عمل بھی کر دیا تو کہا کہ اب تم سب اس پیالے سے اپنا اپنا دودھ نکال لو۔ عورتوں نے کہا کہ یہ تو ناممکن ہے۔ تب صاحبزادی نے کہا کہ جب کئی شوہروں کی شرکت تمھاری اَولاد میں ہوگی تو تم یہ کیسے بتلا سکو گی کہ یہ اولاد کس شوہر کی ہے؟ (تذکرۃ الاولیا، ص: ۱۵۲، ۱۵۳)

فسادِ عالم:

مرد عورت کے معاملے میں رقیب برداشت نہیں کرتا۔ دنیا کی جب ابتدا ہوئی اس وقت ہابیل اور قابیل کے قصے سے لے کر آج تک کتنی مثالیں موجود ہیں۔ کتنے قتل صرف اسی رقابت وغیرت کی بنا پر ہوئے اور کتنے گھر صرف ایک عورت کے مختلف چاہنے والوں کی باہمی لڑائی سے اُجڑے ہیں۔ اگر عورت کے لیے ایک سے زیادہ شوہر کی اجازت دے دی جائے تو پھر دنیا کے نقشے پر فساد ہی فساد ہوگا، قتل وغارت ہوگی اور عشق کی خاطر خون بہے گا۔

البتہ عورت جس شوہر کے نکاح میں ہے اگر وہ اس کے حقوق ادا نہیں کر پا رہا ہے، اس کے ساتھ اِس کے ازدواجی معاملات خوشگوار نہیں ہیں یا پھر اس میں مردانہ کمزوری ہے جس کی وجہ سے اس کے ساتھ زندگی گزارنے میں اِس عورت کو زنا کاری میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو تو اسے اجازت ہے کہ شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرے اور بعدِ طلاق وہ کسی مناسب مرد سے نکاح کر لے۔

اگر شوہر حقوق کی ادائیگی نہیں کرتا ہے اور طلاق بھی نہیں دیتا ہے تو عورت کے لیے خلع کی بھی صورت رکھی گئی ہے کہ وہ اپنا دعویٰ پیش کر کے خلع کا مطالبہ کر سکتی ہے اور بعدِ خلع وہ کسی مناسب مرد سے نکاح کر سکتی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تعددِ ازواج کی حکمتیں

آقائے نعمت نبیِ رحمت سرورِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے ہے کہ آپ بیک وقت چار سے زیادہ نکاح بھی کر سکتے تھے۔ بلکہ بیک وقت آپ کے نکاح میں چار سے زیادہ ازواجِ مطہرات رہ بھی چکی ہیں۔ اس پر کچھ لوگوں کو اعتراض ہوتا ہے اور اعتراض کرنے کی اصل وجہ ان کی محدود فکر اور تنگ نظری ہے کہ وہ نکاح کو صرف قضاے شہوت کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور اس سے جڑے ہوئے دیگر فوائد سے ناواقف ہیں۔

جب ہم حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا تفصیلی مطالعہ کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ آپ نے کوئی شادی جنسی جذبے کی تسکین کے پیشِ نظر کی ہی نہیں تھیں بلکہ شادیوں سے آپ کے مقاصد اتنے بلند تھے جن تک عام لوگوں کا خیال بھی نہیں پہنچ سکتا ہے۔ آپ کی شادیوں سے متعلق تفصیلاً غور کرنے سے پہلے آپ کی حیاتِ طیبہ کے مندرجہ ذیل حقائق کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے:

(۱) حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پچیس سال کی عمر تک کوئی شادی نہیں کی۔

(۲) آپ کے مردانہ حسن اور نسبی وجاہت کی وجہ سے ان عورتوں کی کمی نہ تھی جو آپ کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونا چاہتی تھیں۔

(۳) آپ ایسے ماحول میں جوان ہوئے جس میں جنسی آزادی اپنے شباب پر تھی اس کے باوجود آپ نے اس ماحول سے الگ تھلگ ایسی زندگی گزاری کہ آپ کے دامنِ عفت پر کوئی دھبہ نظر نہ آیا۔

(۴) آپ نے پہلی شادی پچیس سال کی عمر میں کی، جس خاتون کو سب سے پہلے آپ نے اپنی زوجیت کا شرف بخشا وہ آپ سے عمر میں پندرہ سال بڑی تھیں۔ شادی کے وقت ان کی عمر چالیس سال تھی اور آپ کے نکاح میں آنے سے پہلے وہ دو شوہروں کی زوجیت میں رہ چکی تھیں۔

(۵) حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنی عمر کے پچیس سال کا عرصہ اسی واحد خاتون کے ساتھ گزارا جس کے ساتھ آپ سب سے پہلے رشتۂ ازدواج سے منسلک ہوئے تھے۔ اپنی عمر کے پچاسویں سال تک اور اپنی زوجۂ محترمہ کی عمر کے پینسٹھویں سال تک، جب تک آپ کی وہ زوجۂ محترمہ زندہ رہیں، آپ نے

دوسری شادی نہیں کی۔

(۶) پہلی بیوی کے انتقال کے بعد آپ نے جس خاتون سے شادی کی وہ ایک بیوہ اور معمر خاتون تھیں۔

(۷) ایک زوجۂ محترمہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سوا آپ کی تمام ازواجِ مطہرات میں سے کوئی بھی باکرہ نہ تھیں حالاں کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنے امتیوں کو باکرہ عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔

(۸) حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے متعدد خواتین کو اپنے نکاح میں لینے کے باوجود فرمایا: مجھے عورتوں کی کوئی حاجت نہیں ہے۔

(۹) حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اکثر شادیاں پچپن سے لے کر اُنسٹھ سال تک کی عمر کے درمیان ہوئیں۔

جو شخص پچیس سال کی عمر تک مجرد رہے اور پچیس سال سے پچاس سال تک کا عرصہ ایک معمر خاتون کی رفاقت میں گزارے اور اس طویل عرصے میں کوئی جذبہ نہ تو اسے کسی غلط کام کی طرف متوجہ کرسکے اور نہ وہ مزید خواتین سے نکاح کا خیال اپنے دل میں لائے، کیا یہ بات ممکن ہے کہ جب اس شخص کی عمر پچپن سال ہوجائے تو یکایک اس کے جنسی جذبات طوفان بن کر امڈ آئیں اور عورتوں کی کوئی تعداد مطمئن نہ کرسکے۔

ایک شخص جو اپنی خواہشات کا غلام ہو، اس کے ہاتھ میں اقتدار بھی ہو، ہزاروں لوگ اس کے اشارۂ ابرو پر جانیں قربان کرنے کے لیے تیار بھی ہوں، قوم کا ہر فرد اس کے ساتھ رشتۂ مصاہرت قائم کرنے کو ایک بہت بڑی سعادت سمجھتا ہو اور حسین سے حسین تر دوشیزاؤں کے ساتھ شادی کرنے کے راستے میں اس کے لیے کوئی رکاوٹ بھی نہ ہو، ایسا

شخص کیا کرے گا؟ کیا وہ اپنی زوجیت کے لیے حسین ترین دوشیزاؤں کو منتخب کرے گا یا اس کی نگاہ انتخاب بیوہ اور معمر خواتین پر پڑے گی؟ یقیناً ایسا شخص اپنی زوجیت کے لیے حسین ترین دوشیزاؤں کو چنے لگا اور وہ کسی بیوہ، خصوصاً عمر رسیدہ بیوہ سے نکاح کے خیال کو کبھی دل میں نہیں لائے گا۔

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے تاریخی حقائق ہمارے سامنے ہیں۔ آپ کی ازدواجی زندگی پر بحث کرتے وقت دو چیزوں کو خصوصی طور پر ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ پہلی یہ کہ آپ نے ایک سے زیادہ عورتوں کو زوجیت کا شرف اس وقت بخشا جب آپ کی عمر پچپن سال سے تجاوز کر چکی تھی اور پیرانہ سالی کا دور شروع ہو چکا تھا۔

دوسری چیز یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کسی قسم کی مجبوری کے بغیر اپنی زوجیت کے لیے سوائے ایک کے تمام بیوہ خواتین کو منتخب فرمایا۔

اس سلسلے میں ایک بات یہ بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ جو آدمی خواہش پرست ہوتا ہے وہ صنفِ نازک کے ہاتھ کھلونا بنا ہوتا ہے، وہ اپنی بیویوں کے جائز اور ناجائز مطالبے اور فرمائشیں پوری کرنے کے لیے سب کچھ کر گزرتا ہے لیکن حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تو مدینے کا بے تاج بادشاہ ہوتے ہوئے بھی اپنے کاشانۂ اقدس کو فقر کا گہوارہ بنا رکھا تھا۔ ازواجِ مطہرات کو آپ نے بیگمات اور رانیوں کی طرح نازنخرے سے نہیں رکھا بلکہ جب انھوں نے اپنی مالی حالت کو بہتر بنانے کا مطالبہ کیا تو آپ نے باذنِ خداوندی اپنی ازواجِ مطہرات کو دوٹوک الفاظ میں بتا دیا کہ اگر تم مال و دولت کی خواہش مند ہو تو اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے تمھیں خدا کے رسول سے علاحدگی اختیار کرنی پڑے گی اور اگر تم خدا کے رسول کے ساتھ رہنے کو ترجیح دیتی ہو تو پھر تمھیں قناعت اور صبر و شکر سے گزر بسر کرنی پڑے

گی۔معاملہ تمھارے ہاتھ میں ہے چاہو تو دنیوی مال ومتاع کو اختیار کرلو اور چاہو تو خدا اور خدا کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اختیار کرلر۔اس کے جواب میں تمام ازواجِ مطہرات نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہی کو پسند کیا تھا اور کاشانۂ نبوت کی شان فقر واستغنا پر دنیا کی ہر دولت کو قربان کر دیا تھا۔ (ملخصًا از سیرت ضیاء النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جلد ہفتم، ص:۴۵۷ تا ۴۷۸)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شادیوں کے مقاصد

علامہ محمد علی صابونی نے اپنی کتاب ”شبہات واباطیل حول تعدد زوجات الرسول،، میں اس موضوع پر بڑی خوبصورت بحث کی ہے۔انھوں نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی متعدد شادیوں کے ان گنت مقاصد کو ان شعبوں میں تقسیم کیا ہے:

(۱)تعلیمی مقاصد (۲)تشریعی مقاصد (۳)سماجی مقاصد (۴)سیاسی مقاصد۔

تعلیمی مقاصد:

انسانی زندگی کے بے شمار مسائل ایسے ہیں جن کا تعلق خصوصی طور پر عورتوں کے ساتھ ہے۔اسلام ان نسوانی مسائل سے متعلق بھی تفصیلی رہنمائی فراہم کرتا ہے کیوں کہ صنفِ لطیف نصفِ امت ہے اور اسلام نصفِ امت کے مسائل کو نظر انداز نہیں کرسکتا تھا۔کیوں کہ جن مسائل کا تعلق عورتوں کی نسوانی زندگی کے ساتھ تھا ان سے متعلق کوئی عورت غیر محرم مرد کے ساتھ گفتگو کرنے سے شرماتی ہے۔

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم عورتوں کے مسائل سے متعلق جو تعلیمات لے کر مبعوث ہوئے تھے ان تعلیمات کو امت کی عورتوں تک پہنچانے،عورتوں کو وہ مسائل سمجھانے اور ان پر عمل کر کے دکھانے کے لیے آپ کو ایسی خواتین کی ضرورت تھی جو انتہائی پاک باز، ذہین وفطین، دیانت دار اور متقی ہوتیں اور فریضۂ رسالت کی تبلیغ کے لیے مخصوص

کارکنوں کی حیثیت سے کام کر سکتیں۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی کی تفصیلات کو محفوظ کرتیں، انھیں امانت اور دیانت کے ساتھ امت کی عورتوں تک پہنچاتیں، ملت کی عورتیں اپنے جن مسائل کو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرنے میں شرماتی تھیں ان عورتوں سے وہ مسائل سنتیں، ان مسائل کو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتیں، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس مسئلے کا جو حل بتاتے اسے عورتوں تک پہنچاتیں اور ان کو ان پر عمل کرنے کا طریقہ بھی سمجھاتیں۔ ان کاموں کے لیے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ایسی خواتین کی ضرورت تھی جو آپ کے کاشانۂ اقدس میں آپ کے ساتھ رہ سکتیں اور یہ کام صرف وہی خواتین کر سکتیں تھیں جو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوتیں۔

ہجرت کے بعد مسلمانوں کی تعداد میں بہت تیزی سے اضافہ ہونا شروع ہو گیا تھا اور بہت جلد ان نفوسِ قدسیہ کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی تھی جن کی تعلیم کا فریضہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو انجام دینا تھا۔ صرف ایک بیوی سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ ان گوناگوں ذمے داریوں سے تنہا عہدہ برآ ہو سکتی ہے۔

احادیث اور سیرت کی کتابوں میں اس کی مثالیں بھی جگہ جگہ ملتی ہیں کہ اسلامی احکام، خصوصًا وہ احکام جو ان کے مخصوص معاملات سے متعلق تھے، انھیں خواتین تک پہنچانے میں ازواجِ مطہرات کا کلیدی رول رہا ہے۔

(سیرت ضیاء النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جلد ہفتم، ص: ۴۷۹ تا ۴۸۲)

تشریعی مقاصد:

زمانۂ جاہلیت میں ایسی کئی رسمیں موجود تھیں جن سے انسانی معاشرے میں بڑے

سنگین مسائل پیدا ہوتے تھے۔ تباہ کن نتائج کی حامل ہونے کے باوجود، اس قسم کی رسمیں لوگوں کی زندگیوں میں یوں رچ بس چکی تھیں کہ کسی انسان کے لیے ان رسموں کی مخالفت کا تصور کرنا بھی مشکل تھا۔ حضور تاج دار مدینہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فریضۂ نبوت ورسالت میں ایک اہم فرض معاشرے سے تمام غلط اور نقصان دہ رسموں کا قلع قمع کرنا بھی تھا۔ یہ اسی وقت ممکن تھا جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خود ان رسموں کے خلاف عمل کر کے لوگوں کے سامنے نمونہ پیش فرما دیں۔

اس قسم کی رسموں میں سے ایک رسم کسی غیر کے بیٹے کو اپنا بیٹا بنانے کی بھی تھی۔ ایک شخص کسی اجنبی کے بیٹے کو کہہ دیتا کہ تو میرا بیٹا ہے۔ اس کے اس قول سے وہ اس کا بیٹا قرار پاتا اور نسب، میراث، طلاق، شادی اور مصاہرت کے تمام مسائل میں اس کی حیثیت ایک حقیقی بیٹے جیسی ہو جاتی، اس طرح معاشرے میں بے شمار مسائل جنم لیتے۔ مستحق لوگ میراث سے محروم ہو جاتے اور ایک غیر مستحق شخص ساری جائداد کا وارث بن جاتا۔ محرمات کے سلسلے میں یہ رسم انتہائی تباہ کن نتائج برآمد کر سکتی تھی۔ اس رسم کو ختم کرنا ضروری تھا، لیکن جو شخص صدیوں پرانی رسم کو ختم کرنے کی کوشش کرتا، اس پر ہر طرف سے طعن وتشنیع کے تیروں کی بارش برستی۔ یہ فریضہ اتنا کٹھن تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی ادائیگی کے لیے حضور رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے کسی خادم کے بجائے خود آپ کو منتخب فرمایا اور آپ کو یہ قدیم رسم توڑنے کا حکم دیا۔ اس رسم کو توڑنے پر ہر طرف سے طعن وتشنیع کے تیرے برسے لیکن حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ثابت قدمی اور استقلال سے سب کچھ برداشت کیا اور تنقید کرنے والوں کی تنقید کا جواب آپ کے ربِ کریم نے خود دیا۔

حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی

شادی خاص طور پر اسی مقصد کے لیے ہوئی تھی۔ اس شادی کے لیے احکام حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بارگاہِ خداوندی سے وحی متلو یعنی قرآن حکیم کے ذریعے ملے تھے۔

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے عربوں کے دستور کے مطابق حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مُتَبَنّٰی بنایا، اپنی پھوپھی زاد زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ ان کا نکاح کیا، حضرت زید بن حارثہ نے حضرت زینب کو طلاق دی اور ان کی عدت پوری ہونے کے بعد حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت زینب کے ساتھ نکاح کرلیا۔

جب امتیوں کے سامنے اپنے پیارے نبی کی سنت آ گئی تو اب اس غلط رسم کے خلاف عمل کرنے میں ان کے راستے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہ گئی۔ اس شادی کے ذریعے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایک بہت بڑا سماجی مسئلہ حل کیا تھا اور ایک انتہائی اہم قانون عملاً نافذ کیا تھا۔ (سیرت ضیاء النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جلد ہفتم، ص: ۴۸۳ تا ۴۸۴)

سماجی مقاصد:

وفاداری اہم ترین انسانی خصوصیات میں سے ایک ہے۔ دوست کا حقِ دوستی ادا کرنے کی کوشش کرنا، محسن کے احسان کو یاد رکھنا، خادم کی خدمات کو فراموش نہ کرنا، یہ ایسی خصوصیات ہیں جو انسانیت کا زیور شمار ہوتی ہیں۔ ابتدائے اسلام میں سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی دعوت کو قبول کرنا اور حلقۂ اسلام میں داخل ہونا انگاروں پر قدم رکھنے کے مترادف تھا اس کے باوجود لوگ حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے اور سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دست و بازو بن گئے۔ اس کے نتیجے میں انھیں کس قدر مصیبتیں اور پریشانیاں برداشت کرنی پڑیں اس سے سیرت کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کی ان جاں نثاریوں کا اصل صلہ تو قیامت کے

دن ان کو اللہ تعالیٰ خود عطا فرمائے گا لیکن حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس دنیا میں بھی ان غلاموں کو نوازنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ اپنے خادموں کو نوازنے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اسلوب یہ اپنایا کہ آپ نے ان کے ساتھ رشتۂ مصاہرت قائم کیا۔ آپ نے حضرت صدیق اکبر اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی صاحبزادیوں کو اپنے نکاح میں لیا۔ حضرت علی اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے نکاح میں اپنی صاحبزادیاں دے کر ان کے ساتھ رشتۂ مُصاہرت قائم کیا۔ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اپنے باپ پر ترجیح دی تھی اور آپ کی غلامی کو آزادی اور ناز ونعمت کی زندگی سے بہتر سمجھا تھا، پھر تبلیغِ حق کے کٹھن فریضے میں قدم قدم پر جاں نثاری کے مظاہرے کیے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پھوپھی کی بیٹی کا نکاح ان کے ساتھ کر کے ان کی عزت افزائی فرمائی۔ (سیرت ضیاء النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جلد ہفتم، ص: ۴۸۵ تا ۴۸۶)

سیاسی مقاصد:

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شادیوں کے متعدد مقاصد میں سے ایک مقصد دشمنوں کا دل جیتنا، اسلام کے ساتھ ان کی مخالفت کو کم کرنا، قبائل کو اس رشتے کے ذریعے اپنے قریب تر کرنا اور اس طرح نورِ حق کو پھیلانے کے لیے راستہ ہموار کرنا بھی تھا۔ ہم یہاں چند مثالیں درج کرتے ہیں جن سے پتہ چلے گا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شادیوں کے ذریعے کتنے سیاسی فوائد حاصل ہوئے۔

(۱) حضرت جویریہ بنت حارث جو کہ قبیلۂ بنو مصطلق کے سردار کی بیٹی تھیں اور جنگ میں قید ہو کر آئی تھیں، اپنے مالکوں کے ساتھ انھوں نے مکاتبت کر لی تھی اور زرِ مکاتبت کی ادائیگی کے تعلق سے مدد کی درخواست کرنے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ

وسلم کی خدمت میں آئیں۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کے زرِ مکاتبت ادا کر کے ان سے نکاح کی پیشکش کی تو انھوں نے منظور کر لیا۔ جب مسلمانوں کو پتہ چلا تو انھوں نے بنو مصطلق کے تمام قیدیوں کو رہا کر دیا۔ اس طرح سے اس نکاح کی برکت سے تقریباً سو گھرانوں کے لوگوں کو آزادی حاصل ہوئی۔ بنو مصطلق نے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس عالی ظرفی اور مسلمانوں کے دلوں میں موجزن حبِّ رسول کے جذبے کا مشاہدہ کیا تو وہ سارا قبیلہ مسلمان ہو گیا۔

(۲) حُیَی بن اخطب بھی بنو مصطلق کے سردار حارث کی طرح اسلام کا زبردست دشمن تھا۔ اس کی بیٹی صفیہ بنت اخطب غزوۂ خیبر میں مسلمانوں کے ہاتھوں اسیر ہوئیں۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انھیں اپنے پاس بلایا اور ان کے سامنے دو صورتیں رکھیں۔ پہلی صورت یہ تھی کہ وہ اسلام قبول کریں اور آپ انھیں آزاد کر کے اپنی زوجیت کا شرف بخشیں۔ دوسری صورت یہ تھی کہ اگر وہ یہودیت پر قائم رہنا چاہیں تو آپ انھیں آزاد کر دیں اور وہ اپنی قوم کے پاس واپس چلی جائیں۔ انھوں نے اسلام قبول کر کے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زوجیت میں آنا پسند کیا۔ حضرت صفیہ سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا نکاح اس لحاظ سے انتہائی مفید تھا کہ ان سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نکاح سے پہلے یہودی مسلمانوں کے خلاف ہر جنگ میں کسی نہ کسی شکل میں شریک نظر آتے ہیں لیکن اس نکاح کے بعد اسلام کی ابتدائی تاریخ میں یہودی کسی جنگ میں مسلمانوں کے مدِّ مقابل نظر نہیں آتے۔

(۳) ابوسفیان کی اسلام دشمنی سے کون واقف نہیں۔ اسلام کے خلاف اکثر جنگوں میں

ابوسفیان نے لشکرِ قریش کی قیادت کی۔حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اسلام کے کٹر دشمن کی لختِ جگر اُمِّ حبیبہ بنت ابی سفیان کو اپنی زوجیت میں لے لیا۔اس رشتے کا اثر یہ ہوا کہ ابوسفیان کی اسلام دشمنی کا زور ٹوٹ گیا اور بہت جلد وہ اسلام کے جھنڈے تلے اپنی جان کی بازی لگانے کے لیے تیار کھڑے نظر آئے۔

(سیرت ضیاء النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جلد ہفتم، ص:۴۸۸ تا ۴۹۰)

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تمام شادیوں کے پسِ منظر میں اسی قسم کے عظیم مقاصد کارفرما تھے اور آپ نے جو بھی نکاح فرمایا اس میں کئی کئی حکمتیں تھیں۔

ازواج مطہرات کے انتخاب کی حکمتیں

ہم یہاں تمام ازواجِ مطہرات سے متعلق فرداً فرداً کچھ حقائق لکھتے ہیں جن کے مطالعے کے بعد انسان کو ذرہ برابر شک نہیں رہتا کہ ان شادیوں کے مقاصد انتہائی اعلیٰ تھے:

حضرت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا:

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو ان کی اصابتِ رائے اور ذہانت وفطانت کی وجہ سے منتخب کیا تھا۔حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ان سے شادی ایک حکیمانہ شادی تھی۔عمر کا فرق اس رشتے کے راستے میں کسی قسم کی رکاوٹ اس لیے نہ بن سکا کہ اس شادی کا مقصد قضائے شہوت نہیں تھا بلکہ یہ شادی عظیم انسانی مقصد کی خاطر عمل میں آئی تھی۔اللہ تبارک وتعالیٰ نے آقائے کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لیے اس پاکباز، عفت مآب، فطین اور عقلمند خاتون کے ساتھ زندگی گزارنا آسان بنادیا تاکہ وہ تبلیغِ دین اور اشاعتِ اسلام میں آپ کی مدد کرسکیں۔

آپ ہی کے بارے میں سرکار علیہ الصّلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا:

وہ اس وقت مجھ پر ایمان لائیں جب دوسرے لوگوں نے کفر کیا۔ انھوں نے اس وقت میری تصدیق کی جب دوسرے لوگ میری تکذیب کر رہے تھے۔ انھوں نے اس وقت اپنے مال سے میری مدد کی جب دوسرے لوگ میری مدد نہیں کرتے تھے۔

(ملخصًا از سیرت ضیاء النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جلد ہفتم، ص: ۴۹۰، ۴۹۱)

حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا:

حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا تعلق قریش کے قبیلۂ بنی عبدِ شمس سے تھا، جن کی اسلام دشمنی کو مستشرقین جانتے بھی ہیں اور تسلیم بھی کرتے ہیں۔ یہ خاتون سکران بن عمرو بن عبدِ وُد کے نکاح میں تھیں۔ انھوں نے اسلام قبول کیا اور پھر ان کی ترغیب پر ان کے خاوند نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ دین کی جو دولت انھیں نصیب ہوئی تھی اس کی حفاظت کے لیے دونوں نے دو بار حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ حضرت سکران بن عمرو کا انتقال ہو گیا تو حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بے یار و مددگار رہ گئیں۔ ان حالات میں اگر وہ اپنے قبیلے میں واپس جاتیں تو اہلِ قبیلہ ان کی زندگی کو اجیرن بنا دیتے اور دولتِ دین کی حفاظت ان کے لیے انتہائی مشکل ہو جاتی۔ اس وقت ان کی عمر پچپن سال کے قریب تھی، یہ عمر وہ تھی جس میں اس بات کا امکان بہت کم تھا کہ کوئی شخص ان کے ساتھ نکاح کر کے ان کو پناہ گاہ فراہم کرتا۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دین کی اس مجاہدہ کے ایثار، استقلال اور ثابت قدمی کو دیکھا اور خدا کی اس نیک بندی کو دنیا اور دین کے فتنوں سے بچانے کے لیے اسے اپنی زوجیت میں لے لینے کا فیصلہ فرمایا۔ اس طرح آپ نے ان کے ساتھ نکاح کر کے ان کو پناہ گاہ مہیا فرمائی، ان کی قربانیوں اور ثبات و استقلال پر ان کو خراجِ تحسین پیش کیا اور دشمنانِ دین سے ان کی جان اور دین کی حفاظت فرمائی۔ (سیرت ضیاء النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جلد ہفتم، ص: ۴۹۴)

حضرت عائشہ بنت صدیق اکبر رضی اللہ عنہما:

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں صرف ایک باکرہ (کنواری) خاتون سے نکاح کیا اور وہ خوش نصیب خاتون حضرت عائشہ بنت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہیں۔ ان کو زوجیتِ رسول کا شرف عطا ہونے کے بڑے بڑے سبب دو تھے۔ ایک آپ کی ذہانت، فطانت اور پاکبازی اور دوسرا آپ کے والد ماجد کا اسلام اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لیے ایثار۔

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جن مقاصد کے تحت متعدد خواتین کو شرف زوجیت عطا فرمایا تھا، حضرت صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ نکاح سے وہ تمام مقاصد حاصل ہوئے تھے۔ اس نکاح کے ذریعے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے مخلص ترین صحابی کو اس کی جاں نثاریوں کا سب سے بڑا صلہ جو اس دنیا میں ممکن تھا، عطا فرمایا تھا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زوجۂ محترمہ ہونے کی وجہ سے کئی احکام کے نزول کا سبب بنی تھیں جو امت کے لیے رحمت تھے۔

حضرت صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے دینی تعلیمات کی اشاعت کے لیے جو خدمات انجام دیں وہ آپ ہی کا حصہ ہیں۔ نکاح کے وقت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی عمر صرف چھ برس تھی اور رخصتی کے وقت آپ کی عمر نو سال تھی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا میں وہ تمام صفات موجود ہیں جو دینِ اسلام کی ایک قابلِ فخر معلّمہ اور مبلّغہ کے لیے ضروری ہیں۔ نگاہِ نبوت نے ان کی پاکیزگیِ فطرت اور ان کی عفت مآبی کا بھی اندازہ لگالیا تھا۔ تاریخ نے ثابت کردیا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس رشتے سے جو توقعات وابستہ کی تھیں وہ کما حقہ پوری ہوئیں۔

علم میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا مقام نہ صرف امہات المومنین میں بلند ترین تھا بلکہ اکثر اکابر صحابہ بھی آپ کے بحرِ علم سے استفادہ کرتے تھے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

مَا اَشْکَلَ عَلَیْنَا اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ حَدِیْثٌ قَطُّ فَسَأَلْنَا عَائِشَۃَ اِلَّا وَجَدْنَا عِنْدَھَا مِنْہُ عِلْمًا۔

ترجمہ: ہم اصحابِ رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو جب بھی کسی حدیث پاک کو سمجھنے میں مشکل پیش آئی اور ہم نے اس کے تعلق سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے پوچھا تو ان کے پاس اس حدیث سے متعلق علم موجود پایا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی اسی علمی شان کو دیکھ کر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو حکم دیا تھا:

خُذُوْا نِصْفَ دِیْنِکُمْ عَنْ ھٰذِہِ الْحُمَیْرَاءِ۔

ترجمہ: اپنے دین کا نصف علم اس حمیرا یعنی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے سیکھو۔ (ملخصًا از سیرت ضیاء النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جلد ہفتم، ص: ۴۹۵ تا ۴۹۷)

حضرت حفصہ بنت سیدنا عمر رضی اللہ عنہا:

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو جتنی محبت اپنے مشن کے ساتھ تھی اتنی کسی چیز سے نہ تھی اور انسانوں میں سے جو لوگ آپ کے اس مشن کے مخلص کارکن تھے ان سے زیادہ آپ کی نظروں میں کوئی محبوب نہ تھا۔ تمام صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین آپ کے اس مشن کے مخلص سپاہی تھے لیکن صدیق وفاروق اور عثمان وحیدر رضی اللہ عنہم کا اپنا ایک خاص مقام تھا۔

حضرت حفصہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی تھیں، ان کا پہلا نکاح حضرت

خنیس بن حذافہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہوا تھا، وہ جنگِ بدر میں شریک ہوئے، دشمن کا مقابلہ کیا اور بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہوگئے۔ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنی لختِ جگر کے مستقبل کی فکر دامن گیر ہوئی، آپ نے اپنی صاحبزادی کے لیے کفو میں رشتہ تلاش کرنا شروع کر دیا۔ ان حالات میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت حفصہ سے نکاح کیا۔ اس نکاح کے ذریعے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنے ساتھ رشتۂ مصاہرت میں حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے برابر کر دیا۔ اسلام کی ایک مخلص مجاہدہ جس نے دین کی خاطر میدانِ بدر میں خدمات سرانجام دیتے ہوئے اپنا سہاگ قربان کیا تھا اس نکاح کے ذریعے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس مجاہدہ کے زخموں پر مرہم رکھا۔ (ملخصًا از سیرت ضیاء النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم، جلد ہفتم، ص: ۵۰۲ تا ۵۰۵)

حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا:

ان کا پہلا نکاح طفیل سے ہوا، پھر دوسرا نکاح اسلام کے بطلِ جلیل حضرت عبیدہ بن حارث سے ہوا جو جنگِ بدر شہید ہوئے۔ اس کے بعد ان کا نکاح حضرت عبد اللہ بن جحش سے ہوا۔ جنگِ احد میں انھوں نے بھی اپنے سر پر شہادت کا تاج سجایا اور حضرت زینب کو داغِ مفارقت دے کر دارِ آخرت کو سدھار گئے۔ اسلام کی یہ مخلص مجاہدہ جس نے حق و باطل کے ابتدائی دو معرکوں میں اپنے دو سر تاج قربان کر کے انتہائی صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا تھا، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کے زخموں پر مرہم رکھنے کے لیے ان کو اپنی زوجیت کا شرف عطا فرمایا۔ جب حضور صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے ان سے نکاح کیا اس وقت ان کی عمر ساٹھ سال کے قریب تھی اور نکاح کے بعد وہ بہت کم عرصے تک زندہ رہیں۔

اس نکاح کے ذریعے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اسلام کے سر بکف مجاہدوں کو

یقین دہانی کرائی کہ ان کی قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی، خدا کی راہ میں ان کی شہادت کے بعد ان کے اہل وعیال بے یار و مددگار نہیں ہوں گے بلکہ زندگی کے ہر موڑ پر انھیں اس ہستی کا سایۂ عاطفت حاصل رہے گا جسے ربِ قدوس نے رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا ہے۔

(سیرت ضیاء النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جلد ہفتم، ص:۵۰۵،۵۰۶)

حضرتِ امِ سلمہ ہند بنت ابی امیہ رضی اللہ عنہا:

حضرت ام سلمہ ہند بنت ابی امیہ مخزومیہ وہ خوش نصیب خاتون ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کے راستے میں بے پناہ قربانیاں دینے کی توفیق عطا فرمائی۔ ان کے خاوند ابوسلمہ عبداللہ بن عبدالاسد حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد بھی تھے اور آپ کے رضاعی بھائی بھی۔ دونوں میاں بیوی نے اسلام کی خاطر حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی اور اسلام کی خاطر ہر سختی کو انتہائی صبر سے برداشت کیا تھا۔ غزوۂ احد میں حضرت ابوسلمہ نے اپنی تلوار کے جوہر دکھائے اور ان کی عظیم اہلیہ مجاہدین کی خدمات میں مصروف رہیں۔ اس جنگ میں حضرت ابوسلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ شدید زخمی ہوئے۔ ان کا یہ زخم تو مندمل ہو گیا لیکن کچھ عرصے کے بعد ایک اور مہم کے دوران ان کا پہلا زخم پھر کھل گیا اور وہ جانبر نہ ہو سکے۔ ان کے انتقال کے وقت حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ان کے پاس موجود تھے، آپ نے خود اپنے دستِ اقدس سے ان کی آنکھیں بند کی تھیں اور ان کے لیے دعائے مغفرت بھی فرمائی تھی۔

حضرت ابوسلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک بیوہ اور چار یتیم بچے چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ اپنے رضاعی بھائی کی بیوہ اور اس کے بچوں کو کسمپرسی کی حالت میں دیکھنا حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے شفیق دل پر شاق گزرا اور آپ نے ان کو اپنی رحمۃ للعالمینی کی چادر میں چھپانے کا فیصلہ کر لیا۔ عدت گزرنے کے بعد آپ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ

تعالیٰ عنہا کو پیغامِ نکاح بھیجا لیکن انھوں نے معذرت کی اور اس کے تین سبب بتائے:

(۱) میں بڑی عمر والی ہوں۔

(۲) میں یتیم بچوں کی ماں ہوں۔

(۳) میرے جذباتِ رقابت بہت شدید ہیں۔

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انھیں کہلا بھیجا کہ تمھارے یتیم بچوں کو میں اپنے بچوں کی طرح رکھوں گا اور خدا سے دعا کروں گا کہ تمھارے جذباتِ رقابت کی شدت کم ہو جائے۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کی عمر کے زیادہ ہونے کی پرواہ نہ کی اور ان سے نکاح کر لیا۔ اس طرح حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے رضاعی بھائی یتیم بچوں کی کفالت کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا لیا اور ان کی بیوہ کے گہرے زخم پر مرہم بھی رکھا۔

(سیرت ضیاء النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جلد ہفتم، ص: ۵۰۷، ۵۰۸)

حضرت ام حبیبہ رملہ بنت ابو سفیان رضی اللہ عنہا:

حضرت ابوسفیان اسلام قبول کرنے سے پہلے اسلام کے بہت بڑے دشمن تھے، مگر اللہ کی مرضی کہ ان کی صاحبزادی حضرت امّ حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اسلام میں داخل ہو چکی تھیں۔ حضرت ام حبیبہ کا نکاح عبید اللہ بن جحش سے ہوا تھا، یہ بھی مسلمان ہو گیا تھا، حضرت امِ حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو اپنے باپ کی طرف سے خوف تھا اور اپنے پورے قبیلے کی طرف سے بھی کہ وہ آپ کو دینِ عزیز سے پھیرنے کے لیے ہر حربہ استعمال کریں گے۔ ان حالات میں حضرت امِ حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اپنے خاوند سمیت حبشہ ہجرت کر گئیں۔ حبشہ میں عبید اللہ بن جحش نے مرتد ہو کر دینِ عیسائیت قبول کر لیا۔ اس نے حضرت امِ حبیبہ کو اپنے ساتھ رکھنے کے لیے بہت منت سماجت کی لیکن آپ نے براءت کا اظہار کر دیا۔

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے دینِ عزیز کی خاطر اپنے والدین، قبیلے، گھر، وطن اور خاوند سب کچھ چھوڑ دیا تھا اور اب دیارِ غیر میں بے یار و مددگار رہ گئی تھیں۔ مکہ واپسی کا وہ خیال بھی نہیں کرسکتی تھیں کیوں کہ ان کے والد ابوسفیان اور ان کی والدہ ہندہ اسلام کے سب سے بڑے دشمن تھے۔ ان کے پاس واپس جانے کا مطلب یا تو دین سے ہاتھ دھونا تھا یا جان کی بازی ہارنا۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو جب دین کی اس مخلص مجاہدہ کے حالات کا علم ہوا تو آپ نے ان کی بے کسی کو ختم کرنے اور انھیں ان کی قربانیوں کا صلہ دینے کا ارادہ فرمایا۔ آپ نے شاہِ حبشہ نجاشی کے ذریعے حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو پیغامِ نکاح بھجوایا۔ یہ نویدِ جانفزا سن کر حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اس پیشکش کو سعادتِ دارین سمجھ کر قبول کرلیا۔

اس نکاح سے نہ صرف ایک مخلص مومنہ کی شبِ غم سحر آشنا ہوئی بلکہ اس سے بے شمار سیاسی فوائد بھی حاصل ہوئے۔ ابوسفیان اور ان کا قبیلہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو نسب میں ہم پلہ سمجھتا تھا اس لیے آپ کے ساتھ حضرت امِ حبیبہ کے نکاح پر انھیں کوئی اعتراض نہ تھا بلکہ ابوسفیان نے اس نکاح کی خبر سن کر دشمنی کے باوجود حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ رشتے پر فخر کیا تھا۔ اگر امِ حبیبہ دیارِ غیر میں کسی ایسے مسلمان سے نکاح کرلیتیں جس کو ان کا قبیلہ ہم پلہ نہ سمجھتا تو ان کی عداوت میں کئی گنا اضافہ ہوجاتا، وہ اسلام کے خلاف ایک نئے جوش کے ساتھ حرکت میں آتے۔ ام حبیبہ کے ساتھ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نکاح کی وجہ سے ان کی مخالفت کی شدت میں کمی آگئی۔ یہ نکاح ۷ھ میں ہوا تھا۔ اس کے بعد ابوسفیان اسلام کے خلاف کسی کاروائی کی قیادت کرتے ہوئے نظر نہیں آئے۔

(سیرت ضیاء النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جلد ہفتم، ص: ۵۰۷، ۵۰۸)

حضرت جویریہ بنت حارث رضی اللہ عنہا:

اس نکاح کا تذکرہ پیچھے ہو چکا ہے کہ حضرت جویریہ بنت حارث جو کہ قبیلۂ بنو مصطلق کے سردار کی بیٹی تھیں اور جنگ میں قید ہو کر آئی تھیں، اپنے مالکوں کے ساتھ انھوں نے مکاتبت کر لی تھی اور زرِ مکاتبت کی ادائیگی کے تعلق سے مدد کی درخواست کرنے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں آئیں۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کے زرِ مکاتبت ادا کر کے ان سے نکاح کی پیشکش کی تو انھوں نے منظور کر لیا۔ جب مسلمانوں کو پتہ چلا تو انھوں نے بنو مصطلق کے تمام قیدیوں کو رہا کر دیا۔ اس طرح سے اس نکاح کی برکت سے تقریباً سو گھرانوں کے لوگوں کو آزادی حاصل ہوئی۔ بنو مصطلق نے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس عالی ظرفی اور مسلمانوں کے دلوں میں موجزن حبِّ رسول کے جذبے کا مشاہدہ کیا تو وہ سارا قبیلہ مسلمان ہو گیا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں:

فَمَا رَأَيْنَا امْرَأَةً كَانَتْ أَعْظَمَ بَرَكَةً عَلٰى قَوْمِهَا مِنْهَا۔

ترجمہ: ہم نے کسی عورت کو نہیں دیکھا جو اپنی قوم کے لیے اس سے زیادہ برکت کا باعث بنی ہو جتنی برکت کا باعث جویریہ اپنی قوم کے لیے بنیں۔

(ملتقطاً وملخصاً از سیرت ضیاء النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جلد ہفتم، ص: ۴۸۸ تا ۵۱۳)

حضرت صفیہ بنت حُیَی بن اخطب رضی اللہ عنہا:

ان کے ساتھ نکاح کے تعلق سے بھی پیچھے گزرا کہ حُیَی بن اخطب بھی بنو مصطلق کے سردار حارث کی طرح اسلام کا زبردست دشمن تھا۔ اس کی بیٹی صفیہ بنت اخطب غزوۂ خیبر میں مسلمانوں کے ہاتھوں اسیر ہوئیں۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انھیں اپنے پاس بلایا اور

ان کے سامنے دو صورتیں رکھیں۔ پہلی صورت یہ تھی کہ وہ اسلام قبول کریں اور آپ انھیں آزاد کر کے اپنی زوجیت کا شرف بخشیں۔ دوسری صورت یہ تھی کہ اگر وہ یہودیت پر قائم رہنا چاہیں تو آپ انھیں آزاد کر دیں اور وہ اپنی قوم کے پاس واپس چلی جائیں۔ انھوں نے اسلام قبول کر کے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زوجیت میں آنا پسند کیا۔ حضرت صفیہ سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا نکاح اس لحاظ سے انتہائی مفید تھا کہ ان سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نکاح سے پہلے یہودی مسلمانوں کے خلاف ہر جنگ میں کسی نہ کسی شکل میں شریک نظر آتے ہیں لیکن اس نکاح کے بعد اسلام کی ابتدائی تاریخ میں یہودی کسی جنگ میں مسلمانوں کے مدِّ مقابل نظر نہیں آتے۔ (سیرت ضیاء النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جلد ہفتم، ص: ۵۱۵)

حضرت میمونہ بنت حارث رضی اللہ عنہا:

ان کے ساتھ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا نکاح ۷ھ میں عمرۂ قضا کے موقع پر ہوا۔ یہ پہلے حویطب بن عبد العزی کے نکاح میں تھیں اور اس کے بعد ان کا نکاح ابورہم بن عبد العزی سے ہوا تھا اور عمرۂ قضا کے موقع پر یہ بیوہ ہو چکی تھیں۔

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ان سے نکاح کی ترغیب آپ کے معظم و محترم چچا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی ایک بہن اُم الفضل لبابۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زوجۂ محترمہ تھیں۔ حضرت میمونہ بڑھاپے کی عمر میں بیوہ ہو گئی تھیں اور حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کی پارسائی اور ان کے ایثار کی وجہ سے انھیں اس قابل سمجھتے تھے کہ وہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات میں شامل ہوں اور اُم المومنین ہونے کی سعادت حاصل کریں۔

حضرت میمونہ کے ساتھ نکاح نے کئی لوگوں کو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ

رشتۂ مصاہرت میں پرو دیا تھا۔عربوں کے نزدیک اس قسم کے تعلقات کی بڑی اہمیت تھی اس لیے ان تعلقات نے اسلام کی اشاعت میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔

حضرت میمونہ کی آٹھ بہنیں تھیں جو بڑے اہم لوگوں کی زوجیت میں تھیں۔ان کی ایک بہن حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اہلیہ تھیں اور ایک حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی والدہ تھیں۔اسی طرح ان کی دیگر بہنیں بھی بڑے اہم لوگوں کے گھروں میں تھیں، اس نکاح کی وجہ سے ان تمام لوگوں کے ساتھ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا رشتہ قائم ہوا جس کے آپ کی دعوت پر بڑے مثبت اثرات مرتب ہوئے۔اس شادی کا مقصد بھی ایک معمر بیوہ کی دلجوئی اور اس کے رشتے داروں کے دلوں کو اسلام کی طرف مائل کرنا تھا۔ فریقین کی عمر کے جس حصے میں یہ شادی ہوئی، اس عمر میں شادی کے مقاصد وہ نہیں ہوتے جو کوئی تنگ نظر سمجھتا ہے۔ (سیرت ضیاء النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جلد ہفتم، ص: ۵۱۵، ۵۱۶)

حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا:

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اس شادی پر آپ کے زمانے کے یہودیوں، منافقوں اور دیگر دشمنانِ اسلام نے بہت اعتراضات کیے تھے جب کہ اس شادی کی اہمیت اتنی زیادہ تھی کہ اس کے اہم پہلوؤں پر قرآن حکیم نے خود روشنی ڈالی ہے۔اس تعلق سے پیچھے بھی چند باتیں گزر چکی ہیں۔حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے معاصرین نے اس شادی پر اس لیے اعتراضات کیے تھے کہ حضرت زینب حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی مطلقہ تھیں جو حضور صلی اللہ تعالیٰ عنہ کے منہ بولے بیٹے تھے۔عربوں کے نزدیک منہ بولا بیٹا، حقیقی بیٹے کی ہی حیثیت رکھتا تھا اور ان کے نزدیک متبنّٰی کی مطلقہ کے ساتھ شادی حقیقی بیٹے کی مطلقہ کے ساتھ شادی کی طرح ہی ناپسندیدہ تھی۔

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اس شادی کا حکم دے کر اللہ تعالیٰ نے زمانۂ جاہلیت کی ایک نہیں بلکہ کئی ناپسندیدہ رسموں کو توڑا تھا۔ ان رسموں کو توڑنے کے خلاف جس زبردست سماجی ردِعمل کا خطرہ تھا اس کا مقابلہ کرنے کی ذمے داری پروردگار عالم نے اپنے حبیب لبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور ان کے قریب ترین لوگوں کے کندھوں پر ڈالی تھی۔

لوگوں کو ان کے منہ بولے باپوں کی طرف منسوب کرنے کی رسم ختم ہو چکی تھی، زینب اور زید رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے نکاح کے ذریعے نسلی تفاخر کا بت پاش پاش ہو چکا تھا اور غلام انسانی عظمتوں سے بہرہ ور ہو چکے تھے، لیکن ابھی ایک انتہائی قبیح رسم باقی تھی۔ منہ بولے بیٹے کی بیوی کو حقیقی بیٹے کی بیوی کا مقام حاصل تھا۔ اس لیے اس رسم کی دیوار کو پاش پاش کرنے کے لیے ایسی ذات کی قربانی درکار تھی جو چاروں طرف سے برسنے والے طعن وتشنیع کے تیروں کا پامردی سے مقابلہ کر سکتا۔ اس لیے اس قربانی کے لیے رب کریم نے اس عظیم ذات کا انتخاب فرمایا جسے نعرۂ توحید بلند کرنے سے نہ دشمن کی سختیاں روک سکی تھیں اور نہ ہی ان کی پھبتیاں اس کے عزائم کو متزلزل کر سکی تھیں، وہ ذات سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذات عالی ہے۔

حضرت زید کے ساتھ حضرت زینب کی شادی ان کی مرضی کے مطابق نہیں تھی، اس کے علاوہ حضرت زینب کے دل میں نسبی شرافت بھی تھی اس لیے ان کی ازدواجی زندگی میں وہ رونق نہ آسکی جو شادی کا اصل مقصد ہے۔ وقتاً فوقتاً وہ ایسا رویہ اختیار کر جاتی تھیں جس سے حضرت زید کی عزتِ نفس مجروح ہوتی تھی لیکن وہ طلاق بھی نہیں دے سکتے تھے کہ یہ شادی خصوصی حکمِ رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ہوئی تھی۔ البتہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو رب کریم نے پہلے ہی باخبر فرما دیا تھا کہ زید اپنی زوجہ کو طلاق دیں گے اور آپ ان سے

نکاح کریں گے۔

حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ صورتِ حال سے تنگ آ کر بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور طلاق کی خواہش ظاہر کی۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو پہلے سے معلوم تھا ہی کہ یہ ہو کر رہنے والا ہے لیکن آپ اس کے سنگین نتائج اور پوری قوم کی مخالفت بھی ملاحظہ فرما رہے تھے۔ آپ دیکھ رہے تھے کہ آپ کے کردار کو داغدار کرنے کے لیے مخالفین اس شوشے کا استعمال کریں گے۔ ان خدشات کے پیشِ نظر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت زید سے فرمایا کہ تم خدا سے ڈرو اور اپنی بیوی کو طلاق نہ دو۔

اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند نہ تھی کہ اس کا حبیب اپنے مشن کے راستے میں لوگوں کی باتوں پر کان دھرے۔ اس کا کام ہے حکمِ خداوندی کی تعمیل کے لیے میدان میں اتر آنا اور راستے کی تمام رکاوٹوں کو دور کرنا۔ مخالفین کو خاموش کرانا اس کا کام ہے جس نے یہ حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اس رویے پر یہ آیۂ مقدسہ نازل فرمائی:

وَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِيٓ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشٰهُ ۖ فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِيٓ أَزْوَاجِ أَدْعِيَآئِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ۚ وَكَانَ أَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُولًا ○ (سورۂ احزاب، آیت: ۳۷)

ترجمہ: اور اے محبوب! یاد کرو جب تم فرماتے تھے اس سے جسے اللہ نے نعمت دی اور تم نے اسے نعمت دی کہ اپنی بی بی اپنے پاس رہنے دے اور اللہ سے ڈر اور تم اپنے دل میں رکھتے تھے وہ جسے اللہ کو ظاہر کرنا منظور تھا اور تمھیں لوگوں کے طعنے کا اندیشہ تھا اور اللہ زیادہ

سزاوار ہے کہ اس کا خوف رکھو۔ پھر جب زید کی غرض اس سے نکل گئی تو ہم نے وہ تمھارے نکاح میں دے دی کہ مسلمانوں پر کچھ حرج نہ رہے ان کے لے پالکوں کی بیبیوں میں جب ان سے ان کا کام ختم ہو جائے اور اللہ کا حکم ہو کر رہنا۔

حضرت زید نے حضرت زینب کو طلاق دے دی اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حکمِ خداوندی کے مطابق حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو اپنی زوجیت میں لے لیا۔

(ملتقطاً وملخصًا از سیرت ضیاء النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جلد ہفتم، ص: ۵۱۷ تا ۵۲۹)

سرورِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے تعددِ ازدواج کی حکمتوں اور جن خواتین کو آپ نے شرفِ زوجیت سے سرفراز فرمایا ان کے حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ آپ کا نکاح فرمانا دراصل تبلیغِ اسلام کا ایک اہم حصہ تھا جو تعلیمی، سیاسی، تمدنی اور اس طرح کے کثیر فوائد پر مشتمل ہونے کے ساتھ ساتھ حکمتِ عملی، باطل شکنی اور غلط رسم ورواج کے خاتمے کا بھی پیش خیمہ تھا۔ اس کے بعد بھی اگر کسی کے دل میں اس تعلق سے کوئی شبہہ ہوگا تو اس کے لیے یہی کہا جائے گا کہ ؎

گر نہ بیند بروز شپرۂ چشم　　　چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

پیغمبر رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پردے کا حکم فرما کر عورتوں کی عزت کو محفوظ فرمایا

ایسا ماحول جس میں دلوں کے اندر شہوانی جذبات بھرنے کی ہمہ جہت کوششیں جاری ہیں، نگاہوں کو آوارہ بنایا جا رہا ہے، دلوں کو ہیجان سے پُر کیا جا رہا ہے اور انسانی جذبات کو بھڑکانے میں کوئی کسر چھوڑی نہیں جا رہی ہے، جس کے نتیجے میں زناکاری، بدکاری اور زنا بالجبر کے بڑھتے واقعات تشویش ناک ہوتے جا رہے ہیں، ایسے ماحول میں اگر کوئی

نظام عورتوں کی عزت وعصمت کو محفوظ کرنے، اسے آوارہ نگاہوں سے بچانے اور اسے حفظ وامان بخشنے کے لیے پردے کا حکم فرمائے تو یہ یقیناً عورت پر اس نظام کی رحمت ہے۔

اسی رحمت کو یقینی بنانے کے لیے سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بے پردگی کے سارے راستے بند فرمائے اور ایسا نظام قائم فرمایا جس پر عمل کیا جائے تو دنیا سے بے پردگی اور اس کے نتیجے میں پنپنے والے بے شمار مفاسد کا خاتمہ ہو جائے گا۔

سورۂ احزاب میں گھر سے باہر کے پردے کے بارے میں احکام دیے گئے ہیں۔ ان احکام میں خطاب نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات سے ہے لیکن ان کا اطلاق تمام مومنات پر ہوتا ہے۔ قرآنِ حکیم میں یہ طرزِ تخاطب اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ مردوں کے لیے تو ہر اعتبار سے نمونہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں لیکن خواتین کے لیے ان کے نسوانی پہلوؤں کے لحاظ سے نمونہ ازواجِ مطہرات ہیں۔

(۱) عورتیں نرم لہجے سے پرہیز:

سورۂ احزاب میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ○ (احزاب، آیت: ۳۲)

ترجمہ: اے نبی کی بیبیو! تم اور عورتوں کی طرح نہیں ہو، اگر اللہ سے ڈرو تو بات میں ایسی نرمی نہ کرو کہ دل کا روگی کچھ لالچ کرے، ہاں اچھی بات کہو۔ (کنز الایمان)

یعنی عورتوں کو اگر کسی ضرورت کے تحت نامحرم مرد سے بات کرنا پڑے تو سیدھے سادے کھرے اور کسی حد تک خشک لہجے میں گفتگو کی جائے، آواز میں کوئی لچک اور شیرینی نہ ہو تاکہ سننے والا کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائے۔

(۲) عورتیں بلا ضرورت گھر سے باہر نہ نکلیں:

سورۂ احزاب میں مذکورہ آیت کے آگے ارشاد ہوا:

وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى۔

(سورۂ احزاب، آیت: ۳۳)

ترجمہ: اور اپنے گھروں میں ٹھہری رہو اور بے پردہ نہ رہو جیسے اگلی جاہلیت کی بے پردگی۔ (کنزالایمان)

دراصل اسلام میں مردوں کو ان اُمور کی انجام دہی سونپی گئی ہے جن کا تعلق گھر کے باہر سے ہے اور عورتوں کو ان اُمور کی جن کا تعلق گھر کے اندر سے ہے۔ مردوں اور عورتوں کے لیے ان کے کاموں کے دائرے کا تعین، ان کے مزاج اور صلاحیتوں کے اعتبار سے کیا گیا ہے۔ یہ تعین کرنے والا خود خالقِ کائنات ہے جس کے علم اور جس کی حکمت پر کوئی شبہہ نہیں کیا جا سکتا، جو عالم الغیب والشہادۃ ہے اور جس کی نگاہ قدرت سے کچھ مخفی نہیں ہے۔

اسلام نے عورت کو بیرونی ذمے داریوں سے فارغ کر کے گھر کے اندر کے مسائل کی دیکھ بھال کی ذمے داری تفویض کی ہے۔ اس تعلق سے ان احادیث پر غور کریں:

☆ بلاشبہہ ایک خاتون چھپانے کے لائق ہے، جب وہ گھر سے نکلتی ہے تو شیطان اس کو تاکتا ہے اور وہ اپنے رب کی رحمت کے زیادہ قریب اس وقت ہوتی ہے جب وہ اپنے گھر کے اندرونی حصّے میں ہوتی ہے۔ (سنن الترمذی، ج:۲ ص:۴۶۷)

☆ عورت، شوہر کے گھر کی نگراں اور اپنی رعیت (اولاد) کے لیے جواب دہ ہے۔

(سنن الترمذی، ج:۳ ص:۲۶۰)

اسلام میں جمعہ اور جماعت کی اہمیت کوئی مخفی امر نہیں مگر نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

نے عورتوں کو جمعہ کی نماز سے مستثنیٰ فرمایا ہے۔

☆ آپ کا ارشاد ہے: جمعہ کی نماز باجماعت ادا کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے مگر چار اشخاص مستثنیٰ ہیں، یعنی غلام، عورت، بچے اور مریض۔ (سنن ابی داؤد، ج:۱ ص:۲۸۰)

عورت کو باہر نکلنے کی اجازت کس حد تک ہے؟

اگر چہ عورت کا دائرۂ عمل اس کا گھر ہے اس کے باوجود اس کا گھر سے باہر نکلنا بالکل ہی ممنوع نہیں کیا گیا اور کسی اشد ضرورت کے تحت وہ گھر سے باہر جاسکتی ہے۔ البتہ ارشاد فرمایا گیا کہ دورِ جاہلیت کی طرح سج دھج کر دکھاتی نہ پھریں۔ یہاں لفظ ''تبَرُّج'' آیا ہے جس کا مطلب ہے نمایاں ہونا، اُبھر کر اور کھل کر سامنے آنا، ظاہر ہونا۔

عورت کے لیے تبرج کا مطلب ہے اپنے حسن کی نمائش کرنا، لباس اور زیور کی خوبصورتی کا اظہار کرنا اور چال ڈھال سے اپنے آپ کو نمایاں کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ عورتیں جب باہر نکلیں تو اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے نمایاں کرنے کی کوشش نہ کریں بلکہ احتیاط کے ساتھ چادر میں مستور ہو کر نکلیں۔

(۳) مرد حضرات اجنبی عورتوں سے بوقت ضرورت پردے کے پیچھے سے بات کریں:

ارشاد ربانی ہوا:

وَاِذَا سَاَلۡتُمُوۡهُنَّ مَتَاعًا فَسۡـَٔلُوۡهُنَّ مِنۡ وَّرَآءِ حِجَابٍ‌ؕ ذٰلِكُمۡ اَطۡهَرُ لِقُلُوۡبِكُمۡ وَقُلُوۡبِهِنَّ‌۔ (سورۂ احزاب، آیت:۵۳)

ترجمہ: ان سے برتنے کی کوئی چیز مانگو تو پردے کے باہر سے مانگو، اس میں زیادہ

ستھرائی ہے تمھارے دلوں اور ان کے دلوں کی۔(کنزالایمان)

ایک مرد کے لیے جائز ہی نہیں کہ بلاضرورت کسی اجنبی عورت سے بات کرے۔ البتہ اگر اجنبی عورت سے کوئی کام ہو تو بھی روبرو ہو کر بات کرنے کی اجازت نہیں۔ یہ حکم سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے تعلق سے ہوا جن کے ساتھ ایک مسلمان کا رشتہ اپنی حقیقی ماں کی طرح پاکیزہ اور متبرک ہے۔تو عام مسلم خواتین کے ساتھ بغیر پردے کے بات چیت یا لین دین کرنے کی اجازت کس طرح ہوسکتی ہے؟

(۴) چہرے کا پردہ:

چہرے کا پردہ اشد ضروری ہے کہ غیرمحرم کی نظر جب چہرے پر پڑتی ہے تو وہیں سے برائیوں کا دروازہ کھلتا ہے۔ ایک نقاب پوش خاتون کالی ہے یا گوری، جوان ہے یا بوڑھی، خوبصورت ہے یا بدشکل اس کا انداز کوئی نہیں لگا سکتا ہے۔ اسی لیے حکم ہوا کہ اگر عورتوں کو کبھی کسی کام سے نکلنا بھی ہوا تو پردے کے ساتھ نکلیں۔

فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ یُّعْرَفْنَ فَلَا یُؤْذَیْنَ۔

(سورۂ احزاب، آیت:۵۹)

ترجمہ: اے نبی! اپنی بیبیوں اور صاحبزادیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے فرمادو کہ اپنی چادروں کا ایک حصہ اپنے منہ پر ڈالے رہیں یہ اس سے نزدیک تر ہے کہ ان کی پہچان ہو تو ستائی نہ جائیں۔(کنزالایمان)

اس آیت میں "جَلَابِیْب" کا لفظ وارد ہوا ہے جو کہ "جِلْبَاب" کی جمع ہے۔

جلباب اس بڑی چادر کو کہتے ہیں کہ جو پورے جسم کو چھپا لے۔ مراد یہ ہے کہ چادر اچھی طرح لپیٹ کر اس کا ایک حصہ اپنے اوپر لٹکا لیا کرو تا کہ جسم اور لباس کی خوبصورتی کے علاوہ چہرہ بھی چھپ جائے، البتہ دیکھنے کے لیے آنکھیں کھلی رہیں۔

غیر محرم کو دیکھنے پر پابندی

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انسان کی زندگی نگاہ ونظر کے ساتھ منسلک ہے۔ نکاح، کاروبار، دوستی اور دشمنی سب نگاہ کے ساتھ وابستہ ہیں۔ فیصلے کرنے میں نظر کا اہم کردار ہوتا ہے۔ انسان دیکھنے اور سننے کی تاثیر سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ ایک خوبصورت منظر اور سبزہ زار کو دیکھ کر، نیلگوں پانی سے ابلتے چشموں اور جھیل کو دیکھ کر دل میں فرحت محسوس کرتا ہے۔ کریہہ منظر کو دیکھ برا محسوس کرتا ہے۔ پھر کیسے ممکن ہے انسان ایک خوبصورت اور جوان لڑکی کو دیکھے اور اس کے دل میں ہیجان پیدا نہ ہو؟ اس لیے اسلام نے نگاہوں کو بھی قانون کا پابند کیا ہے اور مسلمان مردوں اور عورتوں کو نگاہیں نیچی رکھنے کا حکم فرمایا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ عورتوں کی ہر اس حرکت پر پابندی لگائی ہے جو مردوں کو دعوتِ نظارہ دے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آقاے دو جہاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

إِنَّ النَّظْرَةَ سَهْمٌ مِنْ سِهَامِ إِبْلِيْسَ مَسْمُوْمٌ مَنْ تَرَكَهَا مَخَافَتِيْ أَبْدَلْتُهُ إِيْمَانًا يَجِدُ حَلَاوَتَهُ فِيْ قَلْبِهِ۔ (المعجم الکبیر للطبرانی، حصہ دہم، ص: ۱۷۳)

ترجمہ: بے شک (نامحرم کو) دیکھنا ابلیس کا ایک زہر آلود تیر ہے، جس نے میرے خوف سے اسے ترک کر دیا اس کے بدلے میں میں اس کو ایسا ایمان دوں گا جس کی حلاوت وہ اپنے دل میں محسوس کرے گا۔

یہ پابندی جس طرح مردوں پر عورتوں کو دیکھنے کے تعلق سے ہے اسی طرح عورتوں پر بھی مردوں کو دیکھنے کے تعلق سے ہے۔

غیر محرم سے گفتگو

اگر چہ اجنبی مرد عورت کا ایک دوسرے سے بات کرنا مطلقا حرام نہیں ہے لیکن غیر ضروری گفتگو اور ہنسی مذاق سے سختی سے منع کیا گیا ہے۔ بوقتِ ضرورت اگر گفتگو کی بھی جائے تو اس میں اس قدر احتیاط کی ضرورت ہے کہ لب ولہجہ نرم و نازک نہ ہو، پردے کی آڑ سے بات کی جائے، سخت ضرورت کے وقت کی جائے وغیرہ وغیرہ۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ گفتگو خلوت میں نہ ہو اس کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے کہ جہاں ایک مرد اور ایک عورت خلوت نشیں ہوتے ہیں وہاں تیسرا شیطان ہوتا ہے جوان کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے۔

غیر محرم کو چھونے کی ممانعت

نامحرم کو چھونا اگر چہ چند لمحوں کے لیے ہی کیوں نہ ہو اسے حرام قرار دیا گیا ہے۔ غیر محرم کو چھونا اسلامی نقطۂ نظر سے گناہ کبیرہ ہے۔

حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مَنْ صَافَحَ امْرَاَۃً حَرَامًا جَاءَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ مَغْلُوْلَۃً یَدَاہُ اِلٰی عُنُقِہٖ ثُمَّ یُؤْمَرُ بِہٖ اِلَی النَّارِ۔ (مسند الحارث، ص:۳۰۹)

ترجمہ: جس نے کسی غیر محرم عورت سے مصافحہ کیا، قیامت کے دن اس طرح آئے گا کہ اس کے دونوں ہاتھ اس کی گردن سے بندھے ہوں گے، پھر اسے جہنم میں ڈالنے کا حکم دیا جائے گا۔

اسلام میں مردوں اور عورتوں کی مخلوط محفلوں پر بھی پابندی ہے اس لیے کہ بے حیائی

کی ابتدا اس طرح کی محفلوں سے عموماً ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اسکولوں اور کالجوں میں بالغ لڑکوں اور لڑکیوں کے اختلاط اور دفاتر میں مردوں اور عورتوں کے اختلاط پر بھی اسلام نے پابندی عائد کی ہے۔

یہ پابندی بھی اسی مقصد کے تحت عائد کی گئی ہے کہ مردوں اور عورتوں کا اختلاط بہر حال ایک فتنے کو جنم دیتا ہے اور بے حیائیاں عام ہوتی ہیں۔

تنہائی میں مرد اور عورت کا ملنا

غیر محرم مرد اور عورت اگر چہ پاک دامن ہوں لیکن تنہائی میں مل جائیں تو بہت ممکن ہے کہ شیطانی وسوسے میں مبتلا ہو جائیں، ان کے مضبوط ارادے متزلزل ہو جائیں، شیطان کے جال میں پھنس جائیں اور غیر شرعی فعل کا ارتکاب کر بیٹھیں۔ اس لیے شریعت نے اس سے منع کیا ہے۔ حدیث پاک میں ہے: جہاں ایک مرد اور ایک عورت خلوت میں ہوں وہاں تیسرا شیطان ہوتا ہے۔

پردے سے متعلق سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا دیا ہوا نظام یقیناً عورتوں کے لیے رحمت ہے۔ اس سے عورت کی عزت و عصمت محفوظ ہو جاتی ہے، وہ وحشیانہ نگاہوں کے تعاقب سے مامون ہو جاتی ہے اور اللہ کے حفظ وامان میں ہو جاتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ایک عورت کا باپردہ نکلنا متعدد برائیوں کے خاتمے کا سبب بن جاتا ہے۔ جو لوگ عورتوں کی آزادی کے لیے پردے کو حائل مانتے ہیں وہ دراصل اپنے آپ کو عورتوں تک پہنچانے کی آزادی تلاش کر رہے ہیں جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

امید ہے کہ ہماری ماں بہنیں نظامِ مصطفیٰ کے اس فلسفے کو سمجھیں گی اور اپنے اوپر سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا یہ احسان مانیں گی کہ انھوں نے ان کے حفظ وامان کا خیال

فرماتے ہوئے حجاب کا نظام قائم فرمایا ہے۔

بارھواں باب

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے نظامِ امن نے غلاموں اور باندیوں کو غلامی سے امن عطا فرمایا

قدیم زمانے میں غلام تین طرح کے تھے۔ ایک جنگی قیدی، دوسرے آزاد آدمی جن کو پکڑ پکڑ کر غلام بنایا اور بیچ ڈالا جاتا تھا۔ تیسرے وہ جو نسلوں سے غلام چلے آ رہے تھے

اور کچھ پتہ نہ تھا کہ ان کے آبا واجداد کب غلام بنائے گئے تھے اور یہ بھی نہیں پتہ تھا کہ وہ دونوں قسموں میں سے کس قسم کے غلام تھے۔ جب حضور رحمتِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی دنیا میں جلوہ گری ہوئی اُس وقت عرب اور بیرونِ عرب دنیا بھر کا معاشرہ ان تمام اقسام کے غلاموں سے بھرا ہوا تھا اور سارا معاشی ومعاشرتی نظام مزدوروں اور نوکروں سے زیادہ ان غلاموں کے سہارے چل رہا تھا۔ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ان غلاموں کو غلامی کی زنجیر سے آزادی دلانی تھی، آپ کے سامنے دو مسائل تھے۔ ایک یہ کہ یہ غلام جو پہلے سے چلے آرہے ہیں ان کا کیا کیا جائے اور دوسرا یہ کہ آئندہ کے لیے غلامی کے مسئلے کا حل کیسے ہو۔ یک بیک لوگوں کے حقوقِ ملکیت کو ساقط کر دینا اور یہ اعلان کر دینا کہ اب کوئی کسی کا غلام نہیں ہے، بہت مشکل کام تھا۔ کیوں کہ اس سے پورا معاشرتی اور معاشی نظام مفلوج ہو جاتا اور صنعت وتجارت کی گرم بازاری یک بیک سرد پڑ جاتی۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تحریک آزادی

پیغمبرِ امن حضور رحمتِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس تعلق سے حکمتِ علمی سے کام لیتے ہوئے غلاموں اور باندیوں کی آزادی کے حوالے سے ایک زبردست اخلاقی تحریک شروع کی اور تلقین وترغیب نیز مذہبی احکام اور ملکی قوانین کے ذریعے لوگوں کو اس بات پر ابھارا کہ یا تو آخرت کی نجات کے لیے خوشی سے غلاموں کو آزاد کریں یا اپنے قصوروں کے کفارے ادا کرنے کے لیے مذہبی احکام کے تحت انھیں رہا کریں یا مالی معاوضے لے کر ان کو چھوڑ دیں۔ اس تحریک میں غلاموں کی ایک بڑی تعداد نے آزادی پائی، بعض کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

آزاد کرنے والے	تعداد

سید الانبیاء، حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم	63
حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ	کثیر تعداد
حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ	کثیر تعداد
حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا	67
حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ	70
حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ	100
حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ	1000
حضرت ذوالکلاع حمیری رضی اللہ تعالیٰ عنہ	8000
حضرت عثمان بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ	30,000

(کشف اللثام شرح عمدۃ الاحکام للامام محمد بن احمد السفارینی الحنبلی، حصہ ہفتم، ص: ۲۶۲)

ان کے علاوہ بھی صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی کثیر تعداد ہے جنھوں نے دو، چار، دس، بیس، پچاس غلاموں کو آزادی دلائی۔ یہ وہ حضرات ہیں جنھوں نے محض رضائے الٰہی کے لیے اس کارِ خیر میں حصہ لیا۔ خدا کی رضا حاصل کرنے کا ایک عام شوق تھا جس کی بدولت لوگ خود اپنے غلام بھی آزاد کرتے تھے اور دوسروں سے بھی غلام خرید خرید کر بھی آزاد کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ خلفاے راشدین کا زمانہ ختم ہونے سے پہلے ہی تقریباً سب کے سب رہا ہو چکے تھے۔

غلاموں کی آزادی کا جذبہ کیسے پیدا ہوا

غلاموں کی آزادی کا یہ عظیم جذبہ جو صحابۂ کرام کے دلوں میں پیدا ہوا اس کے پیچھے سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی یہ بشارت کارفرما تھی:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مَنْ اَعْتَقَ رَقَبَةً مُؤْمِنَةً اَعْتَقَ اللّٰهُ مِنْهُ بِكُلِّ عُضْوٍ مِنْهُ عُضْوًا مِنَ النَّارِ حَتّٰى يُعْتِقَ فَرْجَهُ بِفَرْجِهٖ۔ (سنن الترمذی، حصہ چہارم، ص: ۱۱۴)

ترجمہ: جس نے کسی مسلمان غلام کو آزاد کیا اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے ہر عضو کے بدلے میں اس کے اعضا کو جہنم سے آزاد کرے گا۔ یہاں تک کہ اس کی شرمگاہ کے بدلے اس کی شرمگاہ کو بھی جہنم سے آزاد کر دے گا۔

اس حدیثِ پاک میں سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے غلام آزاد کرنے کو جہنم سے آزادی کا آسان طریقہ قرار دیا۔ اسی لیے اہلِ ایمان نے اس کارِ خیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے پچاسوں ہزار غلاموں کو طوقِ غلامی سے آزادی مل گئی۔

غلام آزاد کرنے کی وصیت

غلاموں کے آزاد کرنے کا ایسا جذبہ سرورِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پیدا فرمایا کہ اپنی زندگی میں جس سے جس قدر ہوتا آزاد کر دیتا، پھر وقتِ انتقال بھی وصیت کر جاتا کہ اس کی طرف سے غلام آزاد کیے جائیں۔

حضرت شرید بن سُوید ثقفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی: یا رسول اللہ! میری والدہ نے وصیت کی تھی کہ میں غلام آزاد کروں اور میرے پاس ایک سیاہ فام باندی ہے۔ حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کو بلاؤ۔ جب وہ آئی تو سرورِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا: تیرا رب کون ہے؟ اس نے کہا: اللہ۔ آپ نے فرمایا: میں کون ہوں؟ اس

نے کہا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کو آزاد کردو یہ مومنہ ہے۔ (موارد الظمآن، حصہ چہارم، ص:۱۱۶)

حضرت جویریہ کی آزادی اوروں کی آزادی کا سبب بن گئی

اُم المومنین حضرت جویریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بنو مصطلق کے سردار کی بیٹی تھیں۔ ان کی آزادی اور نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ ان کے نکاح کا واقعہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان فرماتی ہیں:

جب نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بنو مصطلق کے قیدیوں کو تقسیم فرمایا تو حضرت جویریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضرت ثابت بن قیس بن شماس اور ان کے چچازاد بھائی کے حصے میں آئیں۔ انھوں نے اپنے تعلق سے مُکاتبت کر لی، وہ بڑی خوبصورت عورت تھیں، انھیں کوئی بھی دیکھتا تو پسند کرتا۔ وہ اپنی مکاتبت کے تعلق سے سوال کرنے کے لیے سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔

وہ جب میرے دروازے پر کھڑی ہوئیں تو مجھے بڑا ناگوار لگا اور مجھے ایسا لگا کہ حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بھی ناگوار لگا ہوگا۔ انھوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! سارا معاملہ تو آپ کو پتہ ہے۔ میں نے اپنے تعلق سے مکاتبت کر لی ہے اور آپ کے پاس مدد طلب کرنے کے لیے حاضر ہوئی ہوں۔ سرورِ کائنات رحمتِ عالمیاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تمھارے ساتھ اس سے بہتر معاملہ کیا جائے تو کیا تمھیں پسند ہوگا؟ انھوں نے عرض کی: وہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: میں تم سے نکاح کرلوں اور تمھاری مکاتبت کی رقم کو بطورِ حق مہر ادا کردوں۔ وہ اس پر راضی ہوگئیں، حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: ٹھیک ہے تو میں نے ایسا کرلیا۔

جب مسلمانوں کو یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے کہا: جس قبیلے کے داماد سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہوں اس قبیلے کے لوگ ہماری غلامی میں رہیں یہ اچھا نہیں ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان سے نکاح کیا تو اس کے سبب سے قبیلۂ بنو مصطلق کے اتنے اتنے غلاموں کو آزادی مل گئی۔ میں نے اپنی قوم کے لیے ان سے زیادہ برکت والی کسی خاتون کو نہیں دیکھا ہے۔

(موارد الظمآن، حصہ چہارم، ص: ۱۲۴، ۱۲۵)

مکاتبت کا مطلب ہے کہ غلام یا باندی اپنے آقا سے یہ طے کر لے کہ اتنی رقم دے دے تو آزاد ہے۔ حضرت جویریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنے مالکوں سے یہ طے کر لیا تھا۔ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انھیں آزاد کرا کر اپنے نکاح میں لیا تو اس کی برکت دیکھیں کہ بنو مصطلق کے لوگ کثیر تعداد میں آزادی پا گئے۔ مسلمانوں نے سوچا کہ جس قبیلے کے داماد سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں اس قبیلے کا کوئی فرد غلامی کی زندگی بسر کرے یہ شایانِ شان نہیں ہے۔ وہ رسولِ رحمت تو ہر انسان کو آزادی کا حق دلانے آئے ہیں، دنیا میں اسیری اور رقابت سے آزادی دلانے اور آخرت میں سب کی گردنوں کو جہنم سے آزادی دلانے کے لیے۔ انھوں نے آخرت میں آزادی پانے کے لیے لوگوں کو دنیا میں آزاد کر دیا۔

کفّاروں میں غلاموں کی آزادی

غلاموں کی آزادی کا ایک طویل سلسلہ کفارات کی شکل میں ہوا۔ کسی شخص سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو حکم دیا جاتا کہ بطورِ کفارہ غلام کو آزاد کرے۔ اس طریقے سے بھی کثیر غلاموں اور باندیوں کو غلامی سے آزادی اور رہائی ملی۔

کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دیا تو ایک غلام آزادی کرے

کسی کو جان بوجھ کر قتل کرنا تو قصاص واجب کرتا ہے اور اگر حلال مانتے ہوئے قتل کیا تو کفر بھی لازم آجائے گا۔ لیکن اگر کسی شخص نے کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دیا تو اس کے پاداش میں اسے حکم دیا جائے گا کہ ایک غلام آزاد کرے۔

فرمانِ قرآن ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۭ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۭ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَھُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۡ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ۔ (سورۂ نساء، آیت: ۹۲)

ترجمہ: اور مسلمانوں کو نہیں پہنچتا کہ مسلمان کا خون کرے مگر ہاتھ بہک کر اور جو کسی مسلمان کو نادانستہ قتل کرے تو اس پر ایک مملوک مسلمان کا آزاد کرنا ہے اور خون بہا کہ مقتول کے لوگوں کو سپرد کی جائے، مگر یہ کہ وہ معاف کر دیں۔ پھر اگر وہ اس قوم سے ہو جو تمھاری دشمن ہے اور خود مسلمان ہے تو صرف ایک مملوک مسلمان کا آزاد کرنا اور اگر وہ اس قوم میں ہو کہ تم میں ان میں معاہدہ ہے تو اس کے لوگوں کو خوں بہا سپرد کی جائے اور ایک مسلمان مملوک آزاد کرنا۔ تو جس کا ہاتھ نہ پہنچے وہ لگاتار دو مہینے کے روزے رکھے یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں اس کی توبہ ہے۔ (کنز الایمان)

اس میں قتلِ خطا کا ذکر ہے، یعنی اس مسلمان کو مارنے کا ارادہ نہیں تھا، کسی شکار یا کسی کافرِ حربی کو مارنے جا رہا تھا اور ہاتھ بہک کر کسی مسلمان کو لگ گیا اور وہ انتقال کر گیا۔ یا پھر کسی مسلمان کو کافرِ حربی گمان کرتے ہوئے قتل کر دیا۔ اس کی تین صورتیں ہیں اور ان

صورتوں میں حسبِ ذیل طریقوں پر کفارہ ہے:

(۱) کسی مسلمان کا جان بوجھ کر قتل کر دیا تو ایک غلام آزاد کرے اور اس کے ورثہ کو دیت بھی دے۔

(۲) اگر مقتول خود مسلمان ہے لیکن دشمن قوم کا فرد ہے تو صرف ایک غلام آزاد کرنا کافی ہوگا، دیت واجب نہیں ہوگی۔

(۳) اگر مقتول ذمی کافر ہے تب بھی ایک غلام آزاد کرے اور اس کے ورثہ کو دیت بھی ادا کرے۔

ان تمام صورتوں میں اگر اسے غلام میسر نہیں آتے ہیں، یعنی مفلس ہے کہ اس کے پاس غلام ہے ہی نہیں یا غلام دستیاب ہی نہیں ہیں جیسے کہ آج کے دور میں، تو مسلسل ساٹھ دنوں کے روزے رکھنے ہوں گے۔

قسم پوری نہیں کی تو کفارے کے طور پر غلام آزاد کرے

کسی کام کے لیے قسم کھائی اور پوری نہ کر سکا تو اس کے کفارے میں بھی غلام آزاد کرنے کا حکم ہوا۔ فرمانِ قرآن ہے:

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ۗ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ۗ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ۔ (سورۂ مائدہ، آیت:۸۹)

ترجمہ: اللہ تمھیں نہیں پکڑتا تمھاری غلط فہمی کی قسموں پر ہاں ان قسموں پر گرفت فرماتا ہے جنھیں تم نے مضبوط کیا۔ تو ایسی قسم کا بدلہ دس مسکینوں کو کھانا دینا اپنے گھر والوں کو جو

کھلاتے ہو اس کے اوسط میں سے یا اِنھیں کپڑے دینا یا ایک بردہ آزاد کرنا۔تو جو ان میں سے کچھ نہ پائے تو تین دن کے روزے یہ بدلہ ہے تمھاری قسموں کا جب قسم کھاؤ۔

قسم کے کفارے میں ان تینوں باتوں کا اختیار ہے،خواہ کھانا دے،خواہ کپڑے، خواہ غلام آزاد کرے ہر ایک سے کفّارہ ادا ہو جائے گا۔کپڑے اوسط درجے کے ہوں جن سے اکثر بدن ڈھک سکے۔حضرت ابنِ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ ایک تہبند اور کُرتا یا ایک تہبند اور ایک چادر ہو۔ (خزائن العرفان)

عورت کے ساتھ ظہار کر لے تو غلام آزاد کرے

ظِہار اس کو کہتے ہیں کہ اپنی بیوی کو محرماتِ نسبی یا رضاعی کے کسی ایسے عضو سے تشبیہ دی جائے جس کو دیکھنا حرام ہے۔مثلاً بیوی سے کہے کہ تو مجھ پر میری ماں کی پشت کی مثل ہے۔اسی طرح کے ایسے عضو کو جس سے وہ تعبیر کی جاتی ہو یا اس کے جزوِشائع کو محرمات کے ایسے عضو سے تشبیہ دے جس کا دیکھنا حرام ہے۔مثلاً یہ کہے کہ تیرا سر یا تیرا نصفِ بدن میری ماں کی پیٹھ یا اس کے پیٹ یا اس کی ران یا میری بہن یا پھوپھی یا دودھ پلانے والی کی پیٹھ یا پیٹ کے مثل ہے تو ایسا کہنا ظِہار کہلاتا ہے۔ (خزائن العرفان)

زمانۂ جاہلیت میں ظہار طلاق کے حکم میں تھا اور اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے ظہار کے الفاظ کہہ دیتا تو اسے طلاق ہو جاتی۔اسلام میں ظہار کا حکم اس آیۂ مقدسہ میں بیان ہوا:

وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ۔ (سورۂ مجادلہ، آیت:۳)

ترجمہ: اور وہ جو اپنی بیبیوں کو اپنی ماں کی جگہ کہیں پھر وہی کرنا چاہیں جس پر اتنی بڑی بات کہہ چکے تو ان پر لازم ہے ایک بردہ آزاد کرنا قبل اس کے کہ ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں۔

اس میں بیان کر دیا گیا کہ ظہار کرنے سے طلاق واقع نہیں ہوگی لیکن کفارہ دیے بغیر بیوی کے ساتھ مجامعت بھی جائز نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے لیے اپنی بیوی کے ساتھ مجامعت کو دوبارہ حلال کرنا چاہے تو اسے بطورِ کفارہ ایک غلام آزاد کرنا ہوگا۔ اگر غلام میسر نہیں ہے تو مسلسل ساٹھ دن کے روزے رکھنے ہوں گے اور اگر روزے رکھنے کی طاقت نہیں ہے تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہوگا۔

مکاتب بناؤ اور بدلِ کتابت ادا کرنے میں ان کی مدد کرو

مکاتب کے تعلق سے پیچھے گزر چکا کہ غلام اپنے آقا سے طے کر لے کہ اتنی رقم ادا کر دے گا تو وہ آزاد ہے۔ اگر کوئی غلام مکاتبت کرنا چاہتا ہے تو مسلمانوں کو حکم ہوا:

وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا ۖ وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ ۔ (سورۂ نور، آیت: ۳۳)

ترجمہ: اور تمھارے ہاتھ کی مِلک باندی غلاموں میں سے جو یہ چاہیں کہ کچھ مال کمانے کی شرط پر انھیں آزادی لکھ دو تو لکھ دو، اگر ان میں کچھ بھلائی جانو اور اس پر ان کی مدد کرو اللہ کے مال سے جو تم کو دیا۔ (کنزالایمان)

بھلائی سے مراد امانت و دیانت اور کمائی پر قدرت رکھنا ہے کہ وہ حلال روزی سے مال حاصل کر کے آزاد ہو سکے اور مولیٰ کو مال دے کر آزادی حاصل کرنے کے لیے بھیک نہ مانگتا پھرے۔ مسلمانوں کو ارشاد ہے کہ وہ مکاتَب غلاموں کو زکوٰۃ وغیرہ دے کر مدد کریں جس سے وہ بدلِ کتابت دے کر کے اپنی گردن چھڑا سکیں اور آزاد ہو سکیں۔ (خزائن)

آزاد کو پکڑ کر غلام بنا کر بیچنے کی ممانعت

جو پہلے سے غلام تھے ان کی آزادی کے لیے تو بہترین سبیل بن گئی۔ دوسری

صورت یعنی کسی آزاد کو پکڑ کر کوئی بیچ دیتا تھا اور دوسرا شخص خرید کر اسے غلام بنا لیتا تھا اس پر سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پابندی عائد فرمادی۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا:

ثَلاَثَةٌ اَنَا خَصْمُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ: رَجُلٌ اَعْطٰى بِىْ ثُمَّ غَدَرَ، وَرَجُلٌ بَاعَ حُرًّا فَاَكَلَ ثَمَنَهٗ وَرَجُلٌ اسْتَأْجَرَ اَجِيْرًا فَاسْتَوْفٰى مِنْهُ وَلَمْ يُعْطِ اَجْرَهٗ۔

(صحیح البخاری، حصہ سوم، ص: ۸۲)

ترجمہ: تین قسم کے لوگوں سے قیامت کے دن حق کا مطالبہ میں خود کروں گا۔ (۱) جس شخص نے میرے نام سے عہد کیا پھر غداری کر بیٹھا۔ (۲) جس شخص نے کسی آزاد کو بیچ کر اس کی قیمت کھالیا۔ (۳) جس شخص نے کسی کو اجیر رکھا، اس سے کام پورا لیا لیکن اس کو اجرت نہیں دیا۔

اس حدیث پاک میں کسی آزاد کو پکڑ کر غلام بنا کر بیچنے کو حرام قرار دے دیا گیا اور اس پر مکمل طور پر پابندی لگادی گئی۔ اگر پھر بھی کوئی شخص ایسا کرتا ہے تو اس کے خلاف خود اللہ تبارک وتعالیٰ حق کا مطالبہ فرمائے گا۔ پھر کیا کسی کے اندر طاقت ہوگی کہ مقابل میں کھڑا رہ سکے گا۔ بالآخر اپنی نیکیوں سے ہاتھ دھودے گا یا پھر دوسروں کے گناہ اپنی گردن پر لادلے گا۔ اس لیے اس قبیح حرکت سے بچنے کی سخت تاکید فرمائی گئی ہے۔

جنگی قیدیوں کی غلامی کا مسئلہ

اب رہ گیا آئندہ غلام بنانے کا مسئلہ یعنی جو لوگ جنگ فتح ہونے پر قید کر کے لائے جاتے ہیں تو ان جنگی قیدیوں سے متعلق اسلام کا قانون یہ قرار پایا کہ۔۔۔

(۱) جو لوگ جنگ میں گرفتار ہوں ان کو یا تو احسان کے طور پر رہا کر دیا جائے۔

(۲) یا فدیہ لے کر انھیں چھوڑ دیا جائے۔

(۳) یا دشمن کے پاس جو مسلمان قیدی ہیں ان سے ان کا مُبادلہ کرلیا جائے۔

(۴) اگر یوں ہی رہا کر دینا جنگی مصالح کے خلاف ہو اور فدیہ بھی وصول نہ ہو سکے اور دشمن اسیرانِ جنگ کا مُبادلہ کرنے پر بھی رضا مند نہ ہوں تو مسلمانوں کو حق ہے کہ انھیں غلام بنا کر رکھیں۔

البتہ اس قسم کے غلاموں کے ساتھ انتہائی حسنِ سلوک اور رحمت و رأفت کے برتاؤ کا حکم دیا گیا ہے، انھیں تعلیم و تربیت دینے اور سوسائٹی کے عمدہ افراد بنانے کی ہدایت کی گئی ہے۔ ان کی رہائی کے لیے بھی مختلف صورتیں پیدا کی گئی ہیں۔ ان کے لیے یہ بھی امکان ہے کہ اپنے مالکوں سے مکاتبت کر کے رہائی حاصل کر لیں۔ قدیم غلاموں کو آزاد کرنے کے بارے میں جو فضیلت تھی، انھیں آزاد کرنے کے تعلق سے بھی وہ فضیلت برقرار ہے۔ گناہوں کے کفاروں میں بھی غلام آزاد کرنے کا حکم باقی ہے۔

غلاموں کے تعلق سے ایک صورت تدبیر (مُدَبَّر بنانے) کی ہے یعنی آقا وصیت کر جائے کہ جب تک وہ زندہ ہے تب تک یہ غلام اس کی خدمت کرے گا اور اس کے انتقال کرتے ہی آزاد ہو جائے گا۔

غلاموں کے تعلق سے جو عام احکام ہیں وہ باندیوں کے لیے بھی ہیں۔ البتہ باندیوں کی آزادی کے تعلق سے ایک صورت اُمّ ولد ہونے کی بھی ہے یعنی آقا نے باندی سے مجامعت کی اور اس سے بچہ پیدا ہوا تو یہ اُمّ ولد کہلائے گی اور آقا کے انتقال کرتے ہی یہ امِ ولد آزاد ہو جائے گی۔

غلاموں اور باندیوں کے ساتھ سلوک

سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نظامِ رحمت میں غلاموں کی آزادی کے لیے مختلف سبیلیں نکالی گئیں۔ اس کے باوجود اگر کسی کے پاس غلام اور باندیاں ہیں تو انھیں تاکید کی گئی ہے کہ ان کے ساتھ حسنِ سلوک کریں۔ ان کی طاقت بھر ان سے کام لیں، ان کے کھانے پہننے کا صحیح طور پر انتظام کریں اور ان کے لیے بارِ گراں نہ بنیں۔

وہی کھلاؤ جو خود کھاتے ہو

پہلے دنیا کا جو دستور تھا کہ غلاموں کو کام کرنے والی مشین سمجھتے تھے اور انھیں خرید لیا تو سوچتے تھے کہ ان سے کام کرا کے کتنے پیسے وصول لیے جائیں۔ کھانے پینے کے لیے بچا کُچا دے دیا، پہننے اوڑھنے کے لیے پھٹا پرانا دے دیا۔ نہ ان کے کچھ حقوق تھے اور نہ کوئی انھیں حقوق دلانے والا تھا۔ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس نظام کو بالکلیہ بدل ڈالا اور غلاموں کو ہمارے بھائی جیسا قرار دیا۔

حضرت معرور رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میری حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملاقات ہوئی، وہ اور ان کا غلام ایک ہی قسم کا لباس پہنے ہوئے تھے، میں نے ان سے اس بارے میں پوچھا کہ کیا بات ہے آپ کے اور غلام کے کپڑوں میں کوئی فرق نہیں ہے؟ انھوں نے کہا کہ ایک مرتبہ میں نے اپنے غلام کو برا بھلا کہا اور اسی سلسلے میں اس کو ماں کی غیرت دلائی۔ اس نے اس تعلق سے نبیِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے میری شکایت کی تو آپ نے مجھ سے پوچھا: ابوذر! کیا تم نے اس کو ماں کی غیرت دلائی ہے؟ پھر آپ نے فرمایا: تمھارے ماتحت لوگ تمھارے بھائی ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو تمھارا ماتحت بنایا ہے۔ لہٰذا جس کے ماتحت اس کا بھائی ہو وہ شخص اس کو وہی کھلائے جو خود کھائے اور وہی پہنائے جو خود

پہنے۔ ماتحتوں سے وہ کام نہ لو جو ان پر بوجھ بن جائے اور اگر کوئی ایسا کام لو تو ان کا ہاتھ بٹاؤ۔

(صحیح البخاری، حصہ سوم، ص:۱۴۹)

دیکھیں اس روایت سے درجِ ذیل باتیں معلوم ہوئیں:

☆ حضور رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں غلاموں کو بھی یہ حق دے دیا گیا تھا کہ اگر ان کے مالک انھیں تکلیف پہنچاتے ہیں تو وہ کھُل کر شکایت کر سکتے ہیں۔

☆ غلاموں کو بحیثیت انسان اپنے بھائی جیسا قرار دیا گیا۔

☆ مسلمانوں پر ضروری قرار دیا گیا کہ کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے میں اس بات کا خیال رکھیں کہ جیسا خود کھائیں پہنیں ویسا ہی اپنے غلاموں کو بھی کھلائیں پہنائیں۔

☆ ان سے ان کی بساط کے مطابق کام لیں۔ اگر ان کی بساط سے زیادہ کام لینے کا ارادہ ہو تو ضروری ہے کہ ان کا ہاتھ بٹائیں۔

غلام کو روزانہ کتنی بار معاف کریں؟

غلطی ہر انسان سے ہوتی ہے، خاص کر خدام سے ہونے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ وہ دن بھر کاموں میں لگے ہوتے ہیں، تھک جاتے ہیں، ہمت جواب دے جاتی ہے، ایسے میں اگر کوئی غلطی ہو جائے تو انھیں معاف کر دینا چاہیے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کتنی بار معاف کر دینا چاہیے؟ یہ سوال سرور عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بھی پوچھا گیا تھا۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما راوی ہیں، کہتے ہیں کہ ایک شخص نبیِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیک وسلم! خدام کو کتنی مرتبہ معاف کروں؟ نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خاموش رہے۔ انھوں نے دوبارہ پوچھا تو سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: روزانہ

ستّر مرتبہ معاف کیا کرو۔ (سنن الترمذی، حصہ چہارم، ص:۳۳۶)

کیا حضور رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے علاوہ کسی نے بھی خدام کے لیے اتنی گنجائش رکھی ہے کہ ایک دن میں ستر مرتبہ انھیں معاف کیا جائے؟ ہرگز نہیں۔ یہ آقاے رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی امتیازی شان ہے اور آپ ہی کی تعلیمات کی انفرادیت ہے۔

خادم کو کبھی اُف تک نہ کہا

رسولِ رحمت، سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خدام کے ساتھ حسنِ سلوک کا صرف حکم نہیں فرمایا بلکہ خود اس پر عمل بھی کر کے بتایا۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنا ذاتی واقعہ بیان فرماتے ہیں:

خَدَمْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَشْرَ سِنِيْنَ بِالْمَدِيْنَةِ وَاَنَا غُلَامٌ لَيْسَ كُلُّ اَمْرِي كَمَا يَشْتَهِي صَاحِبِيْ اَنْ اَكُوْنَ عَلَيْهِ مَا قَالَ لِيْ فِيْهَا اُفٍّ قَطُّ، وَمَا قَالَ لِيْ لِمَ فَعَلْتَ هٰذَا اَوْ اَلَّا فَعَلْتَ هٰذَا۔

(سنن ابی داؤد، حصہ چہارم، ص:۲۴۷)

ترجمہ: میں نے مدینۂ منورہ میں سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی دس سال تک خدمت کی۔ میں کم عمر بچہ تھا اور میرا ہر کام آقاے رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی منشا کے مطابق نہیں ہوتا تھا اس کے باوجود آپ نے کبھی مجھ سے اُف تک نہیں کہا اور نہ ہی مجھ سے یہ کہا کہ تم نے یہ ایسا کیوں کیا؟ یا تمھیں ایسے نہیں ایسے کرنا چاہیے تھا۔

دس سال کی مدت میں ایک بار بھی خادم کو اُف تک نہ کہنا یہ پیغمبرانہ شان ہے ورنہ عام لوگ تو خادموں اور نوکروں کو اپنی جوتی کا درجہ بھی نہیں دیتے ہیں۔ آقاے رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خادموں کے ساتھ حسنِ سلوک کا خود عملی نمونہ بن کر دکھایا اور اپنے ماننے

والوں کو بھی اس کا حکم فرمایا۔

غلام کو مارنے کا کفارہ

زیر دستوں پر سختی اور ان پر غیض وغضب انسانی فطرت ہے۔ بارہا ان سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے فطری طور پر غصہ آجاتا ہے اور آقا یا مالک ہاتھ بھی اٹھا دیتا ہے۔غلاموں پر ہاتھ اٹھانا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت ناپسند فرمایا ہے۔

حضرت زاذان رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے پاس آیا، انھوں نے اپنے غلام کو آزاد کر دیا تھا۔آپ نے زمین سے ایک لکڑی یا اس جیسی کوئی چیز اٹھائی اور فرمایا: اس غلام کو آزاد کرنے پر میرے لیے اس لکڑی کے برابر بھی اجر نہیں ہے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے:

مَنْ لَّطَمَ مَمْلُوكَهٗ اَوْ ضَرَبَهٗ فَكَفَّارَتُهٗ اَنْ يُّعْتِقَهٗ۔

(سنن ابی داؤد، حصہ چہارم، ص: ۳۴۲)

ترجمہ: جس کسی نے اپنے غلام کو طمانچہ مارا یا جس طرح بھی مارا اس کا کفارہ یہ ہے کہ وہ اسے آزاد کر دے۔

کسی گناہ کی پاداش میں کوئی کام کیا جائے تو اس سے گناہ معاف ہوتا ہے اسی لیے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ اس غلام کے آزاد کرنے پر مجھے کوئی اجر وثواب نہیں ہے اس لیے کہ اس کو مارنے کے بدلے میں آزاد کیا گیا ہے۔

پیغمبرِ رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آخری وصیت

دنیا سے جانے کے وقت بھی جو چیز یاد رکھی جائے اور جس کے تعلق سے وصیت کی جائے وہ واقعی سب سے اہم سمجھی جاتی ہے۔حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دنیا سے

بظاہر پردہ فرماتے ہوئے کیا ارشاد فرمایا اس تعلق سے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ارشاد فرماتے ہیں:

كَانَ اٰخِرُ كَلَامِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَلصَّلَاةَ اَلصَّلَاةَ، اِتَّقُوا اللهَ فِيْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ۔ (سنن ابی داؤد، حصہ چہارم، ص:۳۳۹، ۳۴۰)

ترجمہ: سرکارِ ابد قرار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی آخری گفتگو یہ تھی: نماز کا خاص خیال کرنا اور اپنے خادموں اور خادماؤں کے تعلق سے اللہ سے ڈرتے رہنا۔

اس روایت سے اندازہ کریں کہ سرورِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو غلاموں اور خادموں کا کس قدر خیال تھا کہ آخری وقت میں بھی ان کے حقوق کے تعلق سے فکرمند نظر آرہے ہیں اور آخری وصیت میں ان کا ذکر کرتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔

وہ دور جس میں انسانوں کو غلام بنا کر ان کے ساتھ وحشیانہ سلوک کیا جاتا تھا اُس دور میں سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعلیم وتربیت کا نتیجہ تھا کہ لاکھوں غلاموں کو آزادی ملی اور جنھیں آزادی نہیں بھی ملی تو معاشرے میں انھیں اونچا مقام اور عزت کی زندگی ملی۔

تیرھواں باب

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شجر وحجر، پانی اور دیگر مخلوقات کے لیے بھی امن ورحمت کے ضامن ہیں

آقائے کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جو دین لے کر اس دنیا میں تشریف لائے وہ دینِ رحمت ہے، اس کی رحمت انسانوں کی حد تک محدود نہیں ہے بلکہ ہر جان دار اور غیر جان

دار کو محیط ہے۔ اس کے ابرِ کرم نے جہاں عالم انسانیت کو سیراب کیا ہے، وہیں بے زبان جانوروں کو بھی اپنی رحمتِ بے کراں سے مالا مال فرمایا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ جانوروں کے ساتھ حسنِ سلوک پر اجر وثواب کی خوشخبری بھی سنائی گئی۔ اسی طرح ہر وہ چیز جس میں انسانوں کے لیے فوائد ہیں انھیں آباد کرنے کی آپ نے ترغیب دی ہے اور انھیں ویران کرنے والے کی سخت مذمت برمائی ہے۔

آپ نے شجر کاری کی فضیلتیں بیان فرمائی ہیں، انھیں ویران کرنے سے منع فرمایا ہے، پانی کو ضائع کرنے سے روکا ہے، فضا کو مکدر اور مسموم کرنے والی باتوں سے منع فرمایا اور ہر وہ کام جن سے بیماریوں کے پھیلنے یا کسی انسان کو تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہو اس پر سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پابندی عائد فرمائی ہے۔ بلکہ جس چیز سے کسی کو تکلیف پہنچ سکتی ہے اسے دور کرنا ایمان کا حصہ قرار دیا ہے۔

سرکارِ ابد قرار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اَلْاِیْمَانُ بِضْعٌ وَّسَبْعُوْنَ بَابًا، فَاَدْنَاھَا اِمَاطَۃُ الْاَذٰی عَنِ الطَّرِیْقِ۔

(سنن الترمذی، حصہ پنجم، ص:۱۰)

ترجمہ: ایمان کے ستر سے زیادہ حصے ہیں، ان میں سے سب سے ادنیٰ حصہ راستے سے تکلیف دہ چیز کو ہٹانا ہے۔

حضرت ابو برزہ اسلمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے نفع بخش کام کے تعلق سے پوچھا تو آپ نے فرمایا:

اِعْزِلِ الْاَذٰی عَنْ طَرِیْقِ الْمُسْلِمِیْنَ۔ (سنن ابن ماجہ، حصہ چہارم، ص:۶۴۲)

ترجمہ: مسلمانوں کے راستوں سے تکلیف دہ چیز کو ہٹاؤ۔

جانوروں اور پرندوں پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحمت و شفقت

آقاے رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ظلم و زیادتی سے دنیا کو پاک کرنے کی ہر ممکن کوشش فرمائی، یہاں تک کہ آپ نے جانوروں پر بھی ظلم و زیادتی، انھیں ناحق مارنا یا قتل کرنا اور کام میں استعمال ہونے والے جانوروں سے ان کی طاقت سے بڑھ کر کام لینا ناپسند فرمایا ہے۔ یہ آپ کی رحمۃ للعالمینی کا واضح ثبوت ہے کہ جو رسول جانوروں پر بھی مظالم برداشت نہ فرمائیں وہ کسی انسان پر ہونے والے معمولی ظلم کو بھی کیسے برداشت کر سکیں گے۔ جانوروں کے ساتھ رحم و کرم کی کثیر مثالیں احادیث مبارکہ میں موجود ہیں۔

جانوروں کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا باعثِ اجر و ثواب

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک بدکار عورت کی بخشش صرف اس وجہ سے کی گئی کہ ایک مرتبہ اس کا گزر ایک ایسے کنویں پر ہوا جس کے قریب ایک کتا کھڑا پیاس کی شدت سے ہانپ رہا تھا اور قریب تھا کہ وہ پیاس کی شدت سے ہلاک ہو جائے۔ کنویں سے پانی نکالنے کو کچھ تھا نہیں، اس عورت نے اپنا چرمی موزہ نکال کر اپنی اوڑھنی سے باندھا اور پانی نکال کر اس کتے کو پلایا۔ اس عورت کا یہ فعل بارگاہِ الٰہی میں مقبول ہوا اور اس کی بخشش کر دی گئی۔ (صحیح مسلم، حصہ چہارم، ص: ۱۷۶۱)

ایک شخص نے نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی: میں اپنے اونٹوں کو پانی پلانے کے لیے اپنے حوض میں پانی بھرتا ہوں، کسی دوسرے کا اونٹ آ کر اس میں سے پانی پیتا ہے تو کیا مجھے اس کا اجر ملے گا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر تر جگر رکھنے والے میں اجر و ثواب ہے۔ (سنن ابن ماجہ، حصہ دوم، ص: ۱۲۱۵)

جانوروں کو تکلیف پہنچانا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ناپسند ہے

سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے علاوہ دنیا میں کسی نے جانوروں کے ساتھ حسنِ سلوک کو اتنا اہم مقام نہیں دیا ہے۔ جانوروں کے ساتھ بدسلوکی، انھیں کسی طرح سے تکلیف پہنچانا، وقت پر چارہ نہ دینا، باہم لڑانا یا ان کی طاقت وقوت سے زیادہ ان سے کام لینا آپ نے بہت ناپسند فرمایا ہے اور اس پر سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا ہے بلکہ بارہا آپ نے اس پر وعید کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ چند روایتیں ذکر کی جاتی ہیں:

ایک دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک انصاری کے باغ میں داخل ہوئے، اچانک ایک اونٹ آیا اور آپ کے قدموں میں لوٹنے لگا، اس وقت اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی کمر پر اور سر کے پچھلے حصے پر ہاتھ پھیرا جس سے وہ پرسکون ہوگیا، پھر نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس اونٹ کا مالک کون ہے؟ وہ دوڑتے ہوئے آئے، آپ نے اس سے فرمایا: اس کو اللہ تعالیٰ نے تمھاری ملکیت میں کر دیا ہے، اللہ سے ڈرتے نہیں؟ یہ مجھ سے شکایت کر رہا ہے کہ تم اسے بھوکا رکھتے ہو اور اس سے محنت ومشقت کا کام زیادہ لیتے ہو۔ (سنن ابی داؤد، حصہ سوم، ص: ۲۳)

حضرت سہل بن حنظلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسولِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ایک اونٹ کے قریب سے گزرے تو دیکھا کہ بھوک اور پیاس کی شدت اور سواری اور بار برداری کی زیادتی سے اس کی پیٹھ پیٹ سے لگ گئی تھی۔ آپ نے فرمایا: ان بے زبان چوپایوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو، ان پر ایسی حالت میں سواری کرو جب کہ وہ قوی اور سواری کے قابل ہوں اور ان کو اس اچھی حالت میں چھوڑ دو کہ وہ تھکے نہ ہوں۔

(سنن ابی داؤد، حصہ سوم، ص: ۲۳)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا: ایک آدمی بیل پر بوجھ ڈالے ہوئے اسے ہانک رہا تھا کہ اس بیل نے اس آدمی کی طرف دیکھ کر کہا: میں اس کام کے لیے پیدا نہیں کیا گیا ہوں بلکہ مجھے تو کھیتی باڑی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ لوگوں نے حیرانگی اور گھبراہٹ میں سبحان اللہ کہا اور کہا کہ کیا بیل بھی بولتا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تو اس بات پر یقین کرتا ہوں اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی یقین کرتے ہیں۔ (صحیح مسلم، حصہ چہارم، ص: ۱۸۵۷)

حضرت زاذان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک خچر پر تین لوگوں کو سوار ہو کر جاتے دیکھا تو آپ نے ان سے کہا: لِيَنْزِلْ اَحَدُكُمْ فَاِنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَعَنَ الثَّالِثَ۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، حصہ پنجم، ص: ۳۰۹)

ترجمہ: تم میں سے کوئی ایک اتر جائے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تیسرے پر لعنت فرمائی ہے۔

ان روایتوں سے پتہ چلا کہ آقاے رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعلیم یہ بھی ہے کہ جانوروں کے ساتھ بھی اچھا برتاؤ کیا جائے، جس جانور کا جو کام ہے اس سے وہی کام لیا جائے اور اس کی طاقت سے بڑھ کر اس پر بوجھ نہ ڈالا جائے۔

موذی جانوروں کے مارنے میں بھی خیال ہو کہ تڑپا کر نہ مارا جائے

موذی جانوروں کو مارنے کی اجازت ہے لیکن نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہ تاکید فرمائی ہے کہ ان کے مارنے میں بھی اچھے سلوک کا خیال کیا جائے۔ ایک ضرب میں قتل کر دیا جائے، تڑپا کر نہ مارا جائے، جلایا نہ جائے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے، آپ فرماتے ہیں: ہم رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھے، آپ رفعِ حاجت کے لیے

تشریف لے گئے، ہم نے ایک مرغی کو دیکھا کہ اس کے ساتھ دو چوزے ہیں، ہم نے دونوں چوزوں کو پکڑ لیا، مرغی آئی تو ان چوزوں کو تلاش کرنے لگی، نبیِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب تشریف لائے تو آپ نے پوچھا: اس کے بچوں کو لے کر اس کو کس نے پریشان کیا؟ اس کے بچوں کو واپس دے دو۔

آپ نے دیکھا کہ چیونٹیوں کا جھنڈ تھا جسے ہم نے جلا دیا تھا، آپ نے پوچھا کہ اس کو کس نے جلایا؟ ہم نے کہا کہ ہم نے جلایا ہے۔ آپ نے فرمایا: آگ کا عذاب صرف آگ کو پیدا کرنے والا (اللہ تبارک وتعالیٰ) دے سکتا ہے۔

(مصنف ابن ابی شیبۃ، حصہ سوم، ص: ۵۵)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آقائے نعمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس نے کسی موذی جانور کو ایک وار میں قتل کیا اس کے لیے اتنی اتنی نیکیاں ہیں، جس نے دو وار میں قتل کیا اس کے لیے پہلے سے کم نیکیاں ہیں اور جس نے تین وار میں قتل کیا اس کے لیے اس سے بھی کم نیکیاں ہیں۔ (صحیح مسلم، حصہ چہارم، ص: ۱۷۵۸)

ان روایتوں سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آقائے نعمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تعلیم اور تاکید فرمائی ہے کہ موذی جانوروں کے قتل میں بھی اس بات کا خیال رکھا جائے کہ انھیں زیادہ تکلیف نہ ہو۔

پانیوں کی حفاظت سے متعلق نبوی ارشادات

پانی زمین پر زندگی برقرار رکھنے کے لیے بنیادی ضرورت ہے جو پینے، کھانے، پکانے، صفائی اور دیگر گھریلو کاموں کے علاوہ مختلف صنعتوں اور تعمیرات کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ تمام جانداروں (حیوانات اور نباتات) کا وجود اور بقا پانی کے وجود پر ہے۔ اللہ تعالیٰ

کا ارشاد ہے:

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ۔ (سورۂ انبیا، آیت: ۳۰)

ترجمہ: اور ہم نے ہر جاندار چیز پانی سے بنائی ہے۔ (کنز الایمان)

نبیِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس اہم انسانی ضرورت کی حفاظت کرنے، اس کو قابلِ استعمال رکھنے اور آلودگی سے بچانے کی تاکید فرمائی ہے۔ متعدد احادیث مبارکہ میں ضرورت سے زیادہ پانی خرچ کرنے سے منع کیا گیا ہے اور اس میں گندگی ڈالنے اور اسے آلودہ کرنے پر وعید سنائی گئی ہے۔ چند فرامینِ رسول ملاحظہ کرتے چلیں:

ٹھہرے پانی کو آلودہ کرنے کی ممانعت

ٹھہرے پانی میں پیشاب کرنے کی ممانعت فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا: لَا يَبُولَنَّ اَحَدُكُمْ فِي الْمَآءِ الدَّائِمِ الَّذِي لَا يَجْرِي ثُمَّ يَغْتَسِلُ فِيهِ۔

(صحیح البخاری، حصہ اول، ص: ۵۷)

ترجمہ: تم میں سے کوئی شخص ہرگز ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب نہ کرے کہ پھر اسی سے وہ غسل کرے گا۔

ٹھہرا پانی اگر چہ اتنی مقدار میں ہو کہ اس میں نجاست گرنے سے بھی ناپاک نہ ہو پھر بھی اس پانی میں اگر کسی نے پیشاب کر دیا تو دیکھنے والے کو اس کے استعمال میں کراہت محسوس ہوگی اور پھر وہ پانی ضائع ہو جائے گا۔ اس لیے آقائے نعمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ٹھہرے پانی میں پیشاب کرنے سے منع فرمایا ہے۔

طبی اعتبار سے پانی میں پیشاب کرنے سے ’’بلہارزیا‘‘ (Bilharzia) نامی مرض کے جراثیم پانی میں پھیل جاتے ہیں اور خاص طور سے ٹھہرے ہوئے پانی میں، پھر وہ اپنے

تکوینی مراحل طے کر کے دم دار جراثیم کی شکل میں پانی میں تیرنے لگتے ہیں، جب انھیں کوئی جسم مل جاتا ہے تو وہ اس کے اندر گھس جاتے ہیں اور سوزشِ جگر، کالرا، ٹائیفائیڈ وغیرہ مختلف بیماریوں کا سبب بن جاتے ہیں۔ (ڈاکٹر عزالدین فراج، دارالسلام والوقایۃ من الامراض، ص:۸۵)

آپ اندازہ کریں کہ پانی کی حفاظت کے تعلق سے نبیِ اکرم نور مجسم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعلیم کس قدر اہمیت کی حامل ہے۔

وضو میں بھی ضرورت سے زیادہ پانی استعمال کرنے کی ممانعت

ایک اعرابی صحابیِ رسول نے آقائے کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے وضو کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے انھیں وضو کر کے دکھایا، آپ نے تین تین مرتبہ اعضائے وضو کو دھویا اور ارشاد فرمایا:

هَكَذَا الْوُضُوءُ، فَمَنْ زَادَ عَلَى هَذَا فَقَدْ أَسَاءَ وَتَعَدَّى وَظَلَمَ۔

(سنن النسائی، حصہ اول، ص:۸۸)

ترجمہ: وضو کا یہی طریقہ ہے تو جس نے اس پر زیادہ کیا اس نے برا کیا، حد سے تجاوز کیا اور ظلم کیا۔

وضو جیسے اہم کام میں بھی ضرورت سے زیادہ پانی کے استعمال سے اس قدر تاکید کے ساتھ منع فرمایا جا رہا ہے۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ عرب میں پانی کی قلت تھی اس لیے یہ ممانعت وارد ہوئی ہے بلکہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی یہ روایت پڑھیں:

اِنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ بِسَعْدٍ وَهُوَ يَتَوَضَّأُ فَقَالَ: مَا هٰذَا السَّرَفُ فَقَالَ: أَفِي الْوُضُوْءِ اِسْرَافٌ قَالَ: نَعَمْ، وَاِنْ كُنْتَ عَلٰى نَهْرٍ جَارٍ۔ (سنن ابن ماجہ، حصہ اول، ص:۱۴۷)

ترجمہ: نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس سے گزرے، فرمایا: یہ فضول خرچی کیا ہے؟ انھوں نے عرض کی: کیا وضو میں بھی فضول خرچی ہوتی ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں، اگر چہ تم بہتے دریا پر ہو۔

ان احادیث سے واضح ہوا کہ وضو کرتے وقت بھی پانی کے اسراف سے بچنا لازم ہے چاہے بھلے پانی کی قلت نہ ہو۔

بیدار ہونے کے بعد پانی کے برتن میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے تین بار دھلے جائیں

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور رحمتِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

إِذَا اسْتَيْقَظَ أَحَدُكُمْ مِّنْ نَّوْمِهٖ فَلَا يَغْمِسْ يَدَهٗ فِي الْإِنَاءِ حَتّٰى يَغْسِلَهَا ثَلَاثًا فَإِنَّهٗ لَا يَدْرِيْ أَيْنَ بَاتَتْ يَدُهٗ۔ (صحیح مسلم، حصہ اول، ص: ۲۳۳)

ترجمہ: جب تم میں سے کوئی شخص نیند سے بیدار ہوتو اپنے ہاتھ کو پانی کے برتن میں اس وقت تک نہ ڈالے جب تک کہ تین مرتبہ دھل نہ لے اس لیے تم میں سے کوئی شخص یہ نہیں جانتا کہ رات بھر اس کا ہاتھ کہاں تھا۔

یعنی سونے کی حالت میں ہاتھ انسان کے مختلف حصوں پر پڑنے کی وجہ سے آلودہ ہوسکتا ہے پھر جب پانی میں ڈالے گا تو وہ پانی بھی آلودہ ہو جائے گا۔

پانی کے برتنوں کو ڈھانکنے کا حکم

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آقائے نعمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: غَطُّوا الْإِنَاءَ وَأَوْكُوا السِّقَاءَ وَأَغْلِقُوا الْبَابَ وَأَطْفِئُوا السِّرَاجَ فَإِنْ لَمْ يَجِدْ أَحَدُكُمْ إِلَّا أَنْ يَّعْرُضَ عَلٰى إِنَائِهٖ عُودًا وَيَذْكُرَ اسْمَ اللهِ

فَلْيَفْعَلْ۔ (صحیح مسلم، حصہ سوم، ص: ۱۵۹۴)

ترجمہ: برتن کو ڈھانپ دیا کرو، مشکیزے کے منہ کو بند کر دیا کرو، دروازے کو بند کر دیا کرو اور چراغ کو بجھا دیا کرو تو اگر کوئی شخص صرف اتنا کر سکے کہ اللہ کا نام لے کر اپنے برتن پر لکڑی ڈال دے تو اسے چاہیے کہ اتنا ہی کر لے۔

یہ احکام سونے والے کو دیے گئے ہیں کہ سونے سے پہلے یہ سب کام کر کے سویا کرے اور ان کاموں کے کرنے کا حکم دینے میں کیا حکمتیں ہیں یہ کسی بھی صاحبِ خرد پر مخفی نہیں ہے۔ اسی طرح ان کے معاملے میں بے احتیاطی برتنے میں کیا کیا نقصانات ہو سکتے ہیں وہ بھی واضح بات ہے۔

پانی کے برتن میں سانس مت لو اور پھونک مت مارو

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما ارشاد فرماتے ہیں:

اِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى اَنْ يُّتَنَفَّسَ فِي الْاِنَاءِ اَوْ يُنْفَخَ فِيهِ۔ (سنن الترمذی، حصہ چہارم، ص: ۳۰۴)

ممانعت کی وجہ ظاہر ہے کہ برتن میں سانس لینے یا پھونک مارنے کی صورت میں سانس اور پھونک کے ساتھ جراثیم پانی میں چلے جائیں گے اور پھر وہ بیماریوں میں مبتلا ہونے کا سبب بنیں گے۔

اسلام میں زراعت اور شجر کاری کی اہمیت

اسلام میں زراعت کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی دنیا پر زرعی پیداوار کو ایک عظیم الشان احسان قرار دیا ہے۔ قرآن مقدس میں ارشاد ہے:

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ○ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ○ لَوْ

نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ○ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ○ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ○ (سورۂ واقعہ، آیت: ۶۳ تا ۶۷)

ترجمہ: تو بھلا بتاؤ تو جو بوتے ہو، کیا تم اس کی کھیتی بناتے ہو یا ہم بنانے والے ہیں۔ ہم چاہیں تو اسے روندن کردیں پھر تم باتیں بناتے رہ جاؤ کہ ہم پر چٹی پڑی، بلکہ ہم بے نصیب رہے۔ (کنزالایمان)

یعنی بظاہر بیج زمین میں تم ڈالتے ہو لیکن زمین کے اندر اس کی پرورش کرنا، پھر باہر نکال کر ایک لہلہاتی کھیتی بنا دینا کس کا کام ہے؟ اس سے متعلق تو ظاہر اور سطحی دعویٰ بھی تم نہیں کر سکتے کہ ہماری تیار کی ہوئی ہے۔

پھر کھیتی پیدا کرنے کے بعد اس کا محفوظ اور باقی رکھنا بھی ہمارا ہی کام ہے۔ ہم چاہیں تو کوئی آفت بھی بھیج دیں جس سے ایک دم میں ساری کھیتی تہس نہس ہو کر رہ جائے، پھر تم سر پکڑ کر روؤ اور آپس میں بیٹھ کر باتیں بنانے لگو کہ میاں ہمارا تو بڑا بھاری نقصان ہو گیا بلکہ سچ پوچھو تو بالکل خالی ہاتھ ہو گئے۔

زمین کی وسعت میں اپنی روزی تلاش کرو

زراعت پر انسانی زندگی کا انحصار ہے کیوں کہ جو غلہ زمین میں اگتا ہے اس کو کھا کر ہی انسان زندہ رہتا ہے۔ اس لیے کہ زراعت کو بھی انسانی زندگی میں اور شریعت کے نزدیک ایک اہم مقام حاصل ہے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اُطْلُبُوا الرِّزْقَ فِیْ خَبَایَا الْاَرْضِ۔ (مجمع الزوائد، حصہ چہارم، ص: ۷۲)

ترجمہ: زمین کی پہنائیوں اور وسعتوں میں رزق تلاش کرو۔

اس سے مراد زراعت اور کاشت کاری ہے جیسا کہ امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے۔

زراعت یا عبادت

دنیوی فوائد کے ساتھ ساتھ زراعت کا یہ کام باعث اجر وثواب بھی ہے۔ جیسا کہ حدیث پاک میں ہے:

لَا يَغْرِسُ مُسْلِمٌ غَرْسًا وَلَا يَزْرَعُ زَرْعًا فَيَأْكُلُ مِنْهُ إِنْسَانٌ وَلَا دَابَّةٌ وَلَا شَيْءٌ إِلَّا كَانَتْ لَهُ صَدَقَةٌ۔ (صحیح مسلم، حصہ سوم، ص:۱۱۸۸)

ترجمہ: جو مسلمان کوئی پودا لگاتا ہے یا کوئی کھیت اُگاتا ہے تو اس سے کسی بھی انسان، جانور یا کسی اور چیز کو فائدہ پہنچتا ہے تو وہ اس کے لیے صدقہ ہوگا۔

کھیتی باڑی، شجر کاری وغیرہ بظاہر دنیوی کام ہیں لیکن آقائے رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کاموں کو عبادت قرار دے دیا ہے۔ ایک کسان یا ایک مالی زمین کو سرسبز وشاداب بنانے میں محنت کرتا ہے اور اپنا پسینہ بہاتا ہے تو اللہ کے یہاں اس کے لیے اجر وثواب لکھا جاتا ہے۔ یہ تصور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دیا ہے، اس کی مثال کسی اور مذہب میں نہیں ہے۔

آپ اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ ہر وہ کام جس سے کسی انسان یا کسی جانور کو بھی فائدہ پہنچے اسے اسلام نے کارِ ثواب قرار دیا ہے۔ درختوں اور پودوں کے اگانے میں بے شمار فوائد ہیں، ان سے پھل فراہم ہوتے ہیں، غلہ اور اناج حاصل ہوتا ہے، شدید دھوپ میں راہ گیروں کے لیے سائے کا انتظام ہوتا ہے، پکوان کے لیے ایندھن اور فرنیچر کے لیے لکڑی فراہم ہوتی ہے، درخت ماحولیاتی کثافت کو اپنے اندر جذب کرتے ہیں

اور صاف وشفاف ہوا فراہم کرتے ہیں۔ اسی لیے اسلام میں ایک طرف درختوں کی کٹائی سے منع کیا گیا اور دوسری جانب شجر کاری کی ترغیب دی گئی۔

کھیتیاں ویران کرنا منافق کا کام ہے

ایسے منافق جو دنیا میں فساد مچاتے ہیں اور کھیتی اور نسلِ انسانی کو تباہ کرتے ہیں ان کی مذمت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاِذَا تَوَلّٰی سَعٰی فِی الْاَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیْهَا وَیُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ؕ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ○ (سورۂ بقرہ، آیت:۲۰۵)

ترجمہ: اور جب پیٹھ پھیرے تو زمین میں فساد ڈالتا پھرے اور کھیتی اور جانیں تباہ کرے اور اللہ فساد سے راضی نہیں۔ (کنزالایمان)

گویا کھیتی اور پودوں کو برباد کرنا منافقوں کا شیوہ ہے، مومن اس کا ارتکاب نہیں کرسکتا۔ درختوں کے ناحق کاٹنے کی اجازت اس لیے بھی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو زمین کی زینت قرار دیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَی الْاَرْضِ زِیْنَةً لَّهَا ۔ (سورۂ کہف، آیت:۷)

ترجمہ: بے شک ہم نے زمین کا سنگار کیا جو کچھ اس پر ہے۔ (کنزالایمان)

درختوں کے کاٹنے کی ممانعت

درختوں کی کٹائی کی ممانعت کیوں نہ ہو، جب کہ درختوں اور پودوں کا نظام آسمان سے پانی برسنے کا سبب بنتا ہے، درختوں سے کائنات کا قدرتی حسن دوبالا ہوتا ہے، درخت جانداروں کو آکسیجن فراہم کرتے ہیں، درختوں سے ہواؤں کی رفتار میں اعتدال پیدا ہوتا ہے، نیز ان سے درجۂ حرارت میں تخفیف ہوتی ہے، وہ فضائی آلودگی کا سبب بننے والے ہر

طرح کے جراثیم کو اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں۔

عرب میں بالعموم ببول یا بیری کے درخت ہوا کرتے تھے، نبیِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بیری کے درخت کے بارے میں فرمایا:

مَنْ قَطَعَ سِدْرَةً صَوَّبَ اللّٰهُ رَأْسَهٗ فِي النَّارِ۔ (سنن ابی داوٗد، ۴، ص:۳۶۱)

ترجمہ: جس کسی نے بیری کے درخت کو کاٹا اسے اللہ تعالیٰ اوندھے منہ جہنم میں ڈال دے گا۔

اس حدیث کے بارے میں امام ابوداوٗد سے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ ایک طویل حدیث سے مختصر کی ہوئی حدیث ہے۔ پوری روایت اس طرح ہے:

مَنْ قَطَعَ سِدْرَةً فِي فَلَاةٍ يَسْتَظِلُّ بِهَا ابْنُ السَّبِيلِ وَالْبَهَائِمُ عَبَثًا، وَظُلْمًا بِغَيْرِ حَقٍّ يَكُونُ لَهٗ فِيهَا صَوَّبَ اللّٰهُ رَأْسَهٗ فِي النَّارِ۔ (ایضًا)

ترجمہ: بیری کا وہ درخت جو کسی جنگل میں ہو، جس سے مسافر یا جانور سایہ حاصل کرتے ہوں، کوئی شخص اسے بلا وجہ ظلمًا اور ناحق کاٹ دیا اللہ تبارک وتعالیٰ اسے اوندھے منہ جہنم میں ڈال دے گا۔

درختوں کی حفاظت پر اس قدر زور دیا گیا کہ جنگوں کے لیے کھیتیوں اور درختوں کو بھی جلانے کو ممنوع قرار دیا گیا۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ سرکارِ ابدقرار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب مسلمانوں کی کوئی فوج مشرکین کی طرف بھیجتے تھے تو فرماتے تھے: کسی بچے، کسی عورت اور کسی شیخِ فانی کا قتل مت کرنا۔ کسی جاری چشمے کو خشک مت کرنا، کسی درخت کو مت کاٹنا سوائے اس درخت کے جو

تمھارے لیے جہاد سے رکاوٹ بنے یا تمھارے اور مشرکین کے درمیان حائل ہو۔ کسی انسان یا جانور کا مُثلہ مت بنانا، چوری مت کرنا اور خیانت مت کرنا۔

(السنن الکبریٰ للبیہقی ، حصہ نہم، ص: ۱۵۴)

سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ان وصیتوں کے ساتھ سرایا روانہ فرمایا کرتے تھے۔ ان میں خاص تاکید یہ تھی کہ نفعِ عام کی چیزوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے اور مقصدِ جنگ سے ہٹ کر ہر کام سے پرہیز لازم قرار دیتے تھے۔ جنگ کے دوران بھی آپ نے درختوں کو نقصان پہنچانے سے منع فرمایا۔ البتہ وہ درخت جن کی وجہ سے جنگ کے دوران تکلیف پہنچ سکتی ہے انھیں کاٹنے کی اجازت عطا فرمائی۔

فضا کو مسموم بنانے والے کاموں سے ممانعت

فضا کو مسموم بنانے والی چیزیں اِس دور کے مقابل میں اُس دور میں بہت کم پائی جاتی تھیں لیکن ان پر بھی نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پابندی عائد فرمائی۔ اس کے تعلق سے چند احادیث کریمہ ذکر کی جاتی ہیں۔

گندگی سے مہلک جراثیم پیدا ہوتے ہیں جو کہ بیماریوں کے پھیلنے کا باعث بنتے ہیں۔ آقاے رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انسانیت پر شفقت فرماتے ہوئے کھلے عام گندگی پھیلانے سے منع فرمایا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اَلْبُزَاقُ فِي الْمَسْجِدِ خَطِيْئَةٌ وَ كَفَّارَتُهَا دَفْنُهَا ۔

(صحیح مسلم، حصہ اول، ص: ۳۹۰)

ترجمہ: مسجد میں تھوکنا گناہ ہے اور اس کا کفارہ اس کو دفن کرنا ہے۔

بعض روایتوں میں "اَلْبُزَاقُ" کی جگہ "التَّفْلُ" آیا ہے، اس کا معنیٰ بلغم جھاڑنا ہے۔ الحاصل نبیِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مسجد میں تھوکنے اور بلغم جھاڑنے سے منع فرمایا۔ اگر کسی نے نادانستہ طور پر یہ کام کرلیا تو اس پر ضروری ہوگا کہ وہ اس کو دفن کردے۔

تھوک اور بلغم سے ایسے جراثیم نکلتے ہیں جو بیماریوں کے پھیلنے کا سبب بن سکتے ہیں اور مسجد عام لوگوں کے آنے کی جگہ ہے اس لیے وہاں پر آقاے رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان دونوں باتوں سے منع فرمایا ہے۔

مردوں کو دفن کرنا فضائی آلودگی سے نجات کا ذریعہ

آقاے رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مسلمانوں پر دوسرے مسلمانوں کا حق قرار دیا ہے کہ اگر کسی کا انتقال ہوجائے تو اس بستی اور محلے کے لوگ مل جل کر اس کے کفن دفن میں شریک ہوں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مسلمان کے مسلمان پر پانچ حقوق ہیں:

رَدُّ التَّحِيَّةِ وَإِجَابَةُ الدَّعْوَةِ وَشُهُودُ الْجِنَازَةِ وَعِيَادَةُ الْمَرِيضِ وَتَشْمِيتُ الْعَاطِسِ إِذَا حَمِدَ اللهَ۔ (سنن ابن ماجہ، حصہ اول، ص: ۴۶۱)

ترجمہ: (۱) سلام کا جواب دینا۔ (۲) دعوت قبول کرنا۔ (۳) جنازہ میں حاضر ہونا۔ (۴) مریض کی عیادت کرنا۔ (۵) چھینکنے والے نے الحمد للہ کہا تو اس کا جواب دینا۔

کسی کا انتقال ہوجائے تو اس کا جسم سڑنا اور گلنا شروع ہوجاتا ہے، پھر اس سے اٹھنے والا تعفن طرح طرح کی فضائی آلودگی کا باعث بن سکتا ہے۔ مردے کو جلانے میں اشرف المخلوقات انسان کے جسم کی بے حرمتی اور اسے تکلیف پہنچانا ہے۔ پانی میں بہانا اس کو

دریائی جانوروں کی غذا بنانا ہے، پھر دریا نے اسے کنارے پھینک دیا تو وہ تعفن اور فضا کو مسموم کرنے کا ذریعہ بنے گا۔ اس کے مقابل میں آقائے رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دفن کرنے کا جو حکم فرمایا اور اس کی تاکید فرمائی وہ رحمت ہی رحمت ہے۔

بدبو اور تعفن پیدا کرنے والی چیزوں کے استعمال سے ممانعت

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اِنَّ اللّٰہَ طَیِّبٌ یُحِبُّ الطِّیِّبَ، نَظِیْفٌ یُحِبُّ النَّظَافَةَ، کَرِیْمٌ یُحِبُّ الْکَرَمَ، جَوَادٌ یُحِبُّ الْجُوْدَ، فَنَظِّفُوْا بُیُوْتَکُمْ، وَلَا تَشَبَّھُوْا بِالْیَھُوْدِ الَّتِیْ تَجْمَعُ الْاَکْنَافَ فِیْ دُوْرِھَا۔ (مسند ابی یعلی، حصہ دوم، ص:۱۲۱)

ترجمہ: اللہ تبارک وتعالیٰ پاک ہے اور پاکی کو پسند فرماتا ہے، ستھرا ہے اور ستھرائی پسند فرماتا ہے، کریم ہے اور کرم کو پسند فرماتا ہے، مہربان ہے اور مہربانی پسند فرماتا ہے۔ تو تم اپنے گھروں کو ستھرا رکھو اور یہودیوں کی مشابہت اختیار نہ کرو کہ وہ کوڑا کرکٹ اپنے گھروں میں جمع کر کے رکھتے ہیں۔

اس حدیث میں نبیِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جس بات کی تاکید کی ہے، بالکل واضح ہے اور اس کے فوائد بالکل عیاں ہیں۔

لہسن یا پیاز کھا کر مسجد آنے کی ممانعت

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ حضور رحمتِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مَنْ اَکَلَ مِنْ ھٰذِہِ الشَّجَرَةِ یَعْنِی الثُّوْمَ فَلَا یَقْرُبَنَّ مَسْجِدَنَا۔ (صحیح البخاری، حصہ اول، ص:۱۷۰)

ترجمہ: جس نے اس درخت یعنی لہسن کو کھایا تو وہ ہماری مسجد سے قریب نہ آئے۔

کچا لہسن کھانے سے منہ میں بدبو پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ سے آس پاس کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والے نمازیوں کو تکلیف پہنچ سکتی ہے اس لیے حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کو کھا کر مسجد میں آنے سے منع فرمایا ہے۔ ایسا کام جس سے کسی کو معمولی تکلیف پہنچ سکتی ہے اس پر بھی آقائے رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پابندی عائد فرمائی اور ایسے شخص کو مسجد میں آنے سے منع فرمایا جس کی وجہ سے یہ تکلیف پہنچ سکتی ہے تو جو شخص کوئی ایسا کام کرے جس سے فضا میں آلودگی اور تعفن پیدا ہو، جراثیم پھیلیں اور بیماریاں حملہ کریں، اس کام کو آقائے رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہرگز پسند نہیں فرمائیں گے۔

یہ سارے احکام اور ہدایتیں اس بات کا روشن ثبوت ہیں کہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہر اس کام کی طرف اُبھارا ہے جس میں انسانی فوائد ہیں اور ہر اس کام پر پابندی عائد فرمائی ہے جس میں انسانوں کا نقصان ہے۔ یہ آپ کی رحمۃٌ للعالمینی ہے کہ اس قدر باریک سے باریک معاملات کے لیے بھی آپ نے جامع احکام بیان فرمائے ہیں۔

ہمارا کام یہ ہے کہ ہم آپ کی عظمتوں کو سمجھیں اور آپ کے عطا کردہ نظام و احکام کو اپنے لیے باعثِ رحمت مانتے ہوئے ان پر عمل پیرا ہونے کی پوری کوشش کریں۔

دعوتِ فکر و عمل

قارئین، اس پوری کتاب کا مطالعہ آپ پر روشن کرے گا کہ رحمتِ عالم سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہی دنیا کی وہ واحد شخصیت ہیں کہ جن کی ذاتی زندگی کا ہر گوشہ ہر دور میں پُرامن رہا۔ اعلانِ نبوت سے پہلے بھی اور اعلانِ نبوت کے بعد بھی، مکے میں قیام کے دوران بھی اور مدینے میں اقامت کے عرصے میں بھی، حالتِ شباب میں بھی اور عمرِ پیری

میں بھی، دورِ مظلومی و مغلوبی میں بھی اور دورِ غلبہ و حکمرانی میں بھی۔

اسی طرح اجتماعی و معاشرتی زندگی کے ہر دور میں بھی آپ پُرامن رہے، آپ نے جس طرح دورِ مظلومی میں کبھی ظلم کو روا نہ رکھا، اسی طرح دورِ غلبہ میں بھی کبھی آپ نے عدل وانصاف اور امن وسکون کے ماحول کو متأثر ہونے نہ دیا۔

معرکوں میں، مصالحتوں میں، فتوحات میں، ہر وقت اور ہر جگہ آپ پُرامن رہے، امن وامان کے قیام کے ضامن رہے، ہر کس وناکس کے لیے، اپنوں اور غیروں سب کے لیے امن دہندہ رہے۔

ولادت سے لے کر ظاہری رحلت تک ہر دور میں جو پُرامن اور پُرسکون رہا ہو، ذاتی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی، کیا اس سے بڑھ کر کوئی اور پُرامن اور امن دہندہ ہوسکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ تاریخِ عالم ایسی پُرامن شخصیت اور ایسے امن دہندہ کی مثال لانے سے عاجز وقاصر ہے۔

یہ تو آپ کی ذات اور ذات سے جڑے ہوئے ذاتی و معاشرتی اُمور کا حال ہے۔ آپ نے امن کی جو راہیں سارے انسانوں کے لیے ہموار فرمائی ہیں اور چین اور سکون کے جو خطوط پوری انسانیت کے لیے کھینچے ہیں وہ آپ کو نہ صرف سب سے اعلیٰ بلکہ مافوق الفطرت انسان ثابت کرتے ہیں۔ ضرورتیں معاشرے کی ہوں یا خاندان کی، انسان کی ذاتی ہوں یا اجتماعی، حقوق انسانی افراد کے ہوں یا جانوروں اور پرندوں کے، اصول معرکوں کے ہوں یا مصالحتوں کے، طریقے خوشی منانے کے ہوں یا غم ورنج کے، مسائل ولادت کے ہوں یا موت کے، ضرورتیں زندوں کی ہوں یا مُردوں کی، ضروریات گاؤں اور شہر کی ہوں یا ملک کی، مسئلہ صفائی کا ہو یا گندگی کا، تحفظ جانوں کا ہو یا اموال وآبرو کا، معاملہ دین داری کا ہو یا

بے دینی کا، اصلاحات اشجار واثمار کی ہوں یا آب وہوا کی، امور بحری ہوں یا بری، ہدایات سزاؤں کے تعلق سے ہوں یا رحمتوں کے تعلق سے، سلوک آزادوں سے متعلق ہو یا غلاموں سے متعلق، غرضے کہ ہر ایک معاملے پر آپ نے توجہ فرما کر اس کے تقاضوں کی تکمیل کا انتظام فرما دیا ہے۔

جو حقوق کے متلاشی ہیں، ان کو حقوق کا تعین فرمانے والے پیغمبر رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی پیروی کرنے اور آپ کے دامنِ رحمت سے وابستہ ہونے کی ضرورت ہے۔ امن کی چاہت رکھنے والوں کو امن دہندہ آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پُر امن نقوش پر چلنے کی ضرورت ہے۔ ہر وہ انسان جسے زندگی کے کسی بھی گوشے کے تعلق سے ہدایت ورہنمائی کی ضرورت ہے، اس پر لازم ہے کہ پیغمبر رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دامنِ رحمت سے وابستہ ہو کر اپنی مراد حاصل کر لے۔ پیغمبر رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اطاعت وفرماں برداری کیے بغیر، آپ کی سیرت کا مطالعہ کر کے آپ کے نقوشِ پا کو مشعلِ راہ بنائے بغیر نہ امن وسکون ممکن ہے اور نہ ہی کامیابی وکامرانی کا تصور کیا جا سکتا ہے۔

☆☆☆